چند اہم عصری مسائل

پر

دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے صادر کیے گئے فتاویٰ

افادات

مفتی زین الاسلام قاسمی الہ آبادی

مفتی دار العلوم دیوبند

تقدیم

نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ دار العلوم دیوبند

نام کتاب : چند اہم عصری مسائل

موضوع : عصری اور ضروری مسائل پر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے جاری شدہ فتاوی

افادات : حضرت مولانا مفتی زین الاسلام صاحب الٰہ آبادی
مفتی دارالعلوم دیوبند

مرتب : حضرت مولانا مفتی زین الاسلام صاحب الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

معاونین : مفتی ریحان مبشر مئوی، مفتی محمد اسداللہ آسامی، مفتی محمد مصعب علی گڑھی

کمپوزنگ : مولانا عبدالہادی قاسمی کبیر نگری و مولانا امیر اللہ مشتاق قاسمی کوپاگنجی (مئو)

سن طباعت : شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ = مطابق جولائی ۲۰۱۲ء

تعداد صفحات : ۳۹۲

قیمت :

ناشر : مکتبہ دارالعلوم دیوبند، یوپی، انڈیا ۲۴۷۵۵۴

مطبوعہ : ایچ، ایس، آفسیٹ پرنٹرز، دریا گنج، نئی دہلی، موبائل: 09811122549

پیش لفظ

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والصّلاۃ والسّلام علیٰ سیّد الأنبیاء والمرسلین، وعلیٰ آلہٖ وصحبہ أجمعین، وعلیٰ من تبعھم بإحسان إلیٰ یوم الدّین. أمّا بعد:

شکر بے حد ونہایت اس ذاتِ پاک کا، جس نے محض اپنے فضل وکرم، اساتذۂ کرام کی شفقتوں، بزرگوں کی دعاؤں بالخصوص مرشدی عارف باللہ، فانی فی اللہ حضرت مولانا ''شاہ محمد احمد'' صاحب، پرتاب گڑھی نقشبندی قدّس سرہ کی مسلسل دردمندانہ دعاؤں کے طفیل علم دین کی خدمت کرنے کی توفیق بخشی اور مادرِ علمی'' دارالعلوم دیوبند'' کے موقر'' دارالافتاء'' سے وابستہ کیا، احقر اپنی تمام تر نااہلیت کے اعتراف کے ساتھ اس انعامِ الٰہی پر صمیمِ قلب سے شکر ادا کرتا ہے۔

ع: شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی خدمت متعلق ہونے کے بعد سابق کارگذار مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا ''غلام رسول'' صاحب خاموش نور اللہ مرقدہ کی خاص توجہات وعنایات، نیز استاذ گرامی حضرت مولانا ''عبدالخالق'' صاحب مدراسی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہمت افزا کلمات نے کام کرنے کا نیا حوصلہ بخشا؛ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے پانچ سال کے عرصے میں تقریباً دس بارہ ہزار فتوے احقر کے ذریعے سپرد قلم ہوے۔

استفتاءات کی کثرت، سائلین کی آمد ورفت اور فتاوی سے متعلق دوسری مصروفیات کی بنا پر تفصیلی جوابات لکھنے کی نوبت کم آئی اور ہر فتویٰ اس کا متقاضی بھی نہیں ہوتا؛ البتہ ہر جواب حتی الامکان تشفی بخش اور بالوضاحت لکھنے کی کوشش کی گئی۔ جو فتوے ذرا تفصیل سے لکھے گئے یا ان میں عام افادیت کا پہلو تھا، ان میں سے کچھ فتاویٰ کی نقل ذاتی فائل میں محفوظ کر لی گئی تھی۔ استاذی المکرّم حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی زیدمجدہ نے مشورہ دیا کہ اگر ان میں عام افادیت کا پہلو ہے؛ تو انھیں

ترتیب دے کر قابل اشاعت بنایا جائے؛ چناں چہ حضرت الاستاذ کی ہدایت کے مطابق انتخاب کر کے ابتدائی ترتیب دے دی گئی اور یہ مجموعہ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی ''ابوالقاسم'' صاحب نعمانی دامت برکاتہم ،مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں اس اظہارِ خیال کے ساتھ پیش کیا گیا کہ: ''دارالافتاء سے سالانہ دس بارہ ہزار فتوے جاری ہوتے ہیں؛ لیکن ان سے عمومی استفادہ ممکن نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کا فائدہ صرف مستفتیان تک ہی محدود رہتا ہے؛ جب کہ ان میں مسائلِ حاضرہ کی بھی خاصی تعداد ہوتی ہے، یا دوسری نوعیت سے ان میں عمومی افادیت کا پہلو ہوتا ہے؛ لہٰذا منتخب فتاویٰ کی سالانہ اشاعت ہوجایا کرے، تو مناسب عمل ہوگا''۔ حضرت والا دامت برکاتہم نے حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ بعض ہدایات دیتے ہوئے فرمایا کہ ایسے فتووں کی اشاعت ضروری ہے اور دوسرے مفتیانِ دارالافتاء کے فتاویٰ بھی منتخب ہوکر منظر عام پر آنا چاہیے، تاکہ عمومی استفادہ ہو سکے۔ حضرت مہتمم صاحب نے احقر کا مسودہ دارالعلوم کی موقر ''مجلس شوریٰ'' سے منظوری کے لیے اپنے پاس رکھ لیا؛ چناں چہ مجلس شوریٰ منعقدہ ۳۲/۸/۲۱ھ نے تجویز نمبر (۷) میں مکتبہ دارالعلوم سے اس کی اشاعت کی منظوری عنایت کردی۔

حضرت مولانا مفتی ''سعید احمد'' صاحب پالن پوری دامت برکاتہم -جنھیں اللہ تعالیٰ نے فقہی بصیرت اور مسلک اکابر کے خصوصی ذوق کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے- نے اس قلمی مسودے کو دیکھ کر حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے اور کام کی ترتیب میں راہ نمائی فرمائی، نیز من اولہ الی آخرہ دیکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔

ابتدائی مسودے کو قابل اشاعت بنانے کے لیے تخریج وتعلیق کا مشکل کام باقی تھا؛ لیکن اراکین مجلس شوریٰ کی مذکورہ تجویز اور حضرات اکابر کی حوصلہ افزائی نے مشکل نظر آتے کام کو آسان کردیا؛ جس سے ایک نیا حوصلہ ملا؛ چناں چہ بنامِ خدا تشنہ امور کی تکمیل کرتے ہوئے بعض جملوں کی توضیح، اجمال کی تفصیل اور تدریب افتاء کے بعض ہونہار طلبہ کے تعاون سے احادیث وکتب فتاویٰ کی مراجعت کے بعد تخریج وتحقیق اور بعض مقامات پر مفید حواشی کا اضافہ کر کے کمپوزنگ شروع کرادی گئی، پھر کمپوزنگ کی ضروری اصلاح وتصحیح کے بعد حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا، حضرت والا نے اپنی تصنیفی وتدریسی مصروفیات کے باوجود حرف بہ حرف اس کا مطالعہ فرمایا اور تحسین وتصحیح کے الفاظ کے ساتھ بعض فتاویٰ پر اضافی اور قیمتی حواشی بھی تحریر فرمائے، نیز بہ طور تقریظ ایک

جامع تحریر سپرد قلم فرمائی؛ جس پر ہم حضرت والا کے شکر گذار ہیں۔ **جزاهم الله أحسن الجزاء۔**

اس مجموعے میں بعینہٖ وہ اصل فتاویٰ ہیں جو مفتیانِ دارالعلوم دیوبند: مخدومی حضرت مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی، ناظم دارالافتاء، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری، مفتی فخر الاسلام صاحب اور مفتی وقار علی صاحب کی تصدیقی دستخط کے ساتھ صادر ہوئے، نیز بعض فتاویٰ پر مرحوم حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب، سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کے بھی دستخط ہیں۔ البتہ اشاعت کے وقت ان میں بعض لفظی اصلاحات یا اجمال کی تفصیل یا حوالوں کی تکمیل کی گئی ہے، نیز بعض جگہ نئے حوالے یا حاشیہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں اکثر فتاویٰ تو راقم الحروف کے اپنے تحریر کردہ ہیں اور بعض ایسے فتاویٰ بھی ہیں جو تدریب افتاء کے طلبہ نے احقر کی نگرانی میں تحریر کیے اور اصلاح وترمیم کے بعد احقر کے دستخط سے جاری ہوئے، نیز موضوع کی مناسبت سے بعض دیگر اہل علم مفتیانِ کرام کے فتاویٰ بھی مجموعہ ہذا میں شامل کیے گئے ہیں۔

فتاوی کے اس مجموعے کو ''چند اہم عصری مسائل'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، متداول فقہی کتابوں کے حوالوں میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی مکتبہ کی کتاب کا حوالہ دیا جائے، جس کی تفصیل شروع کتاب میں موجود ہے۔

ہر حدیث کی تخریج کردی گئی ہے، جس میں حدیث کی ترقیم کے ساتھ اس حدیث کا باب بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ہم شکر گذار ہیں حضرت والا جناب مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے کہ حضرت والا نے کتاب پر مقدمہ تحریر فرما کر اس کی قیمت کو دوبالا فرمایا۔ **فجزاهم الله أحسن الجزاء**

نیز میں بڑا ہی ممنون ومشکور ہوں ''تدریب افتاء'' دارالعلوم دیوبند کے ان بعض محنتی اور لائق طلبہ کا جنھوں نے تدریب افتاء کی ذمہ داریوں کو پوری محنت کے ساتھ انجام دیتے ہوئے خارج اوقات میں اس مجموعہ کی تحقیق وتعلیق میں بھرپور تعاون پیش کیا، چنانچہ مفتی ریحان مبشر مئوی سلمہٗ، مولوی محمد مصعب علی گڑھی سلمہٗ اور بالخصوص مولوی محمد اسد اللہ آسامی سلمہٗ نے مراجع کی تحقیق، حوالوں کی تکمیل، احادیث کی تخریج وترقیم، رموزِ اوقاف اور اس کے علاوہ کتاب کی ترتیب وتہذیب سے

متعلق دیگرامور میں پوری ذمے داری کے ساتھ اپنا تعاون پیش کیا۔ **جزاهم الله تعالیٰ أحسن الجزاء في الدّنيا والآخرة.**

اسی طرح دوبارہ مراجع کی مطابقت، کمپوز شدہ حصے کی خواندگی اور اصلاح وتصحیح کا کام انجام دینے کے لیے مولوی محمد رضوان مرادآبادی سلمہٗ متخصص تدریب افتاء اور مولوی محمد اسعد مئوی سلمہٗ شریک تکمیل افتاء نے بھی تعاون کیا۔ **جزاهم الله تعالیٰ أحسن الجزاء.**

حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی مدظلہ العالی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کی عنایت خاص سے کتاب زیور طبع سے آراستہ ہورہی ہے۔

اخیر میں، بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوں کہ اے اللہ! مادر علمی دارالعلوم دیوبند اور اس کے دارالافتاء کو تاقیامت قائم ودائم اور اس کے فیوض وبرکات کو جاری وساری رکھ اور ہمیں اس کی علمی وعملی فضا اور تقوے طہارت کے ماحول سے ہر طرح کے ظاہری وباطنی فیوض حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرما اور اس مختصر سی کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما۔

آمین یارب العالمین۔فقط

خاکپائے درویشاں
زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۵/ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ
۶/ جون ۲۰۱۲ء

مقدمہ

از نمونۂ اسلاف حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

ہر مسلمان کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد اس بات کا مکلّف ہے کہ اس کے تمام اعمال واقوال شریعت کے موافق ہوں، عقائد بھی درست ہوں، معاملات بھی صحیح ہوں، عبادات بھی ظاہر و باطن کے لحاظ سے حکم شرع کے موافق ہوں۔ غرض اس کی پوری زندگی شریعت اسلامیہ کی آئینہ دار ہو، جس شخص نے باقاعدہ علم دین کی تحصیل وتکمیل کی ہو اس کے لیے اپنے علم صحیح کی روشنی میں عمل آسان ہوتا ہے؛ لیکن علم شریعت سے ناآشنا افراد کے لیے عمل کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ماہرین علومِ شرعیہ سے معلومات حاصل کر کے عمل کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.** اگر تم کو علم نہیں ہے تو اربابِ علم سے پوچھو۔ اسی دوطرفہ عمل کا نام استفتاء اور افتاء ہے، جس سے ایک طرف مستفتی کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اگر وہ پیش آمدہ مسئلہ میں حکم شریعت سے ناواقف ہو تو وہ ماہرینِ علوم شریعت سے رجوع کرے، محض ظن وتخمین یا اپنی رائے پر عمل نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو وہ مجرم قرار پائے گا، وہیں مفتی کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ صورتِ مسئلہ میں خوب غور وفکر کر کے منشأ سوال کو سمجھے پھر اس سوال کا صحیح جواب شرعی نصوص میں تلاش کر کے سائل کی دینی رہنمائی کرے۔

اس سے منصبِ افتاء کی اہمیت، نزاکت اور عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں؛ کیونکہ مفتی درحقیقت اپنی رائے پیش نہیں کرتا بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمان بن کر حکم شریعت کا اظہار کرتا ہے، اس لحاظ سے دینی مناصب میں افتاء کی ذمہ داری سب سے زیادہ مشکل اور نازک بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں علمائے حق اور ائمہ دین منصب قضا وافتاء کے قبول کرنے سے

گریز کرتے رہے۔

فکری آوارگی اور دین بیزاری کے اس دور میں جہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ دین وشریعت سے بے پرواہوکرزندگی گذاررہاہے، وہیں اب بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد عقائد، ایمانیات، عبادات اور معاملات میں مفتیانِ کرام سے رجوع کرنے میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

''دارالعلوم دیوبند'' کو اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے ہی محبوبیت اور مرجعیت کا جو مقام بلند عطا فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں جہاں طالبین علومِ نبوت کا جم غفیر دارالعلوم سے اکتسابِ فیض کرنے کے لیے یہاں اُمڈا پڑتا ہے، وہیں دینی مسائل اور معاملات میں حکم شرعی دریافت کرنے کے لیے ''دارالافتاء'' سے مراجعت کا غیر منقطع سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پہلے مراجعت کے دوطریقے تھے، دستی یا بہ ذریعہ ڈاک اور اب جب کہ ای میل اور فیکس کے ذریعہ جوابات حاصل کرنے کی سہولت دستیاب ہوگئی ہے استفتاء کی کثرت حد سے تجاوز کرگئی ہے۔

آمدہ سوالات میں ذاتی اور وقتی نوعیت کے سوالات کے علاوہ بعض ایسے مسائل اور معاملات سے متعلق بھی سوالات ہوتے ہیں جن کے جوابات تفصیل طلب ہوتے ہیں اور جن کی افادیت عام ہوتی ہے۔ ان میں وہ مسائل بھی شامل ہیں جو دورِجدید کی سائنسی ایجادات اور صنعت وتجارت اور معاملات کی نئی نئی شکلوں کے نتیجہ میں استفتاء کا موضوع بنے ہیں۔

جناب مولانا مفتی ''زین الاسلام'' صاحب مفتی دارالافتاء، دارالعلوم/ دیوبند نے جن کو فتویٰ نویسی کا طویل تجربہ ہے، انھوں نے کچھ ایسے فتاویٰ کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق جدید مسائل ومعاملات سے ہے یا جن کی ضرورت عام طور پر پیش آتی ہے۔ اس انتخاب میں بیشتر ان کے اپنے تحریر کردہ فتاویٰ ہیں اور بعض ایسے فتاویٰ بھی ہیں جو تدریب افتاء کے طلبہ نے ان کی نگرانی میں تحریر کیے تھے اصلاح وترمیم کے بعد مفتی صاحب کے دستخط سے جاری ہوے اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ان کو دارالعلوم کی طرف سے شائع کرایا جائے تو اس سے امت کو بہت نفع ہوگا، خوشی کی بات ہے کہ ''دارالعلوم دیوبند'' کی موقر مجلس شوریٰ کے ارکانِ گرامی نے اس مجموعہ کی اشاعت کی اجازت دے دی، اور یہ ہدایت بھی دی کہ اشاعت سے قبل حضرت مولانا مفتی ''سعید احمد'' صاحب پالن پوری اس پر نظر ثانی فرمالیں، چناں چہ حضرت مفتی صاحب نے مکمل کتابت شدہ مسودہ کا بنظر غائر مطالعہ فرمایا

اور مناسب مشوروں سے بھی نوازا، اب یہ مجموعہ ''چند اہم عصری مسائل'' پر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر کیے گئے فتاویٰ کے نام سے طباعت کے لیے تیار ہے۔

امید ہے کہ اس مجموعہ فتاویٰ کی اشاعت سے افادۂ علمی کی ایک نئی راہ کھلے گی اور ملت کو اپنے مسائل کو حل کرنے میں سہولت حاصل ہوگی۔ والسلام

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۲/ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ

تقریظ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری، دامت برکاتہم
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده و نصلّی علٰی رسولہٖ الکریم، أمّا بعد:

اہم اور عصری مسائل پر دارالعلوم دیوبند کے مفتیانِ کرام زید مجدہم کے جاری کردہ فتاویٰ کا یہ مجموعہ پیش نظر ہے، اس میں زیادہ تر فتاویٰ حضرت مفتی زین الاسلام صاحب الٰہ آبادی زید مجدہم کے مرقومہ ہیں، میں نے یہ تمام فتاویٰ بالاستیعاب پڑھے ہیں، ماشاء اللہ سبھی فتاوی کافی وافی اور شافی ہیں، اور حوالوں سے مدلل ہیں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ زمانہ کو قرار نہیں اور مسائل فقہیہ کا انحصار نہیں، اس کی ضرورت تھی کہ اہم اور عصری مسائل منظر عام پر آئیں، وہ مستفتی کی حد تک محدود نہ رہیں، کئی مرتبہ یہ تجویز سامنے آئی کہ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں ان کے لیے ایک خاص ''کالم'' ہو، جس میں اہم مسائل کی اشاعت ہوتی رہے، مگر اب تک کسی وجہ سے اس تجویز پر عمل نہیں ہوسکا۔

اب خوشی کی بات ہے کہ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی زید مجدہم (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے جناب مولانا مفتی زین الاسلام صاحب کو متوجہ کیا کہ وہ اپنے ہزاروں فتاویٰ میں سے اہم اور عصری مسائل کو چھانٹ کر الگ کریں، اور ان کا ایک مجموعہ مرتب کریں،

حضرت اقدس مہتمم صاحب مدظلہ (مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی) نے اس کی تائید کی، تو یہ گنج گرانمایہ مرتب ہوکر امت کے سامنے آیا، اللہ تعالیٰ اس کو مفید بنائیں اور اس کے فیض کو عام فرمائیں۔ (آمین)

کتبہ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۲۷/ رجب ۱۴۳۳ھ

چند اہم عصری مسائل

پر

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر کیے گئے فتاویٰ

افادات: مفتی زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی
مفتی دارالعلوم دیوبند

فہرست

حدیث، فقہ وفتاویٰ اور تقلید

عقائد، تصوف، اور مختلف فرقے

طہارت اور نماز سے متعلق بعض مسائل

روزہ، حج اور قربانی سے متعلق بعض مسائل

نکاح، طلاق، حضانت اور وراثت سے متعلق بعض مسائل

بیع اجارہ اور وقف کے بعض مسائل

عورتوں کے پردے اور لباس سے متعلق بعض احکام

سود، رشوت اور ٹیکس کے بعض مسائل

تصویر، ضبطِ تولید، تبدیلیِ جنس کے بعض اہم مسائل

متفرقات

اطلاع

درج ذیل کتابیں، جن کے حوالے بہ کثرت آئے ہیں، مکتبہ ''زکریا دیوبند'' کی مطبوعہ ہیں۔

(۱) الدّرّالمختار مع ردّالمحتار (الدّر مع الرّد)

(۲) البحر الرّائق

(۳) الفتاوی الهنديّة

(۴) الخانية على الهنديّة

(۵) الفتاوی التّاتارخانية

(۶) بدائع الصّنائع

(۷) إمداد الفتاوی

(۸) إمداد الأحكام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند اہم عصری مسائل

پر

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر کیے گئے فتاویٰ

افادات: مفتی زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی
مفتی دارالعلوم دیوبند

حدیث، فقہ وفتاویٰ اور تقلید

حدیث إنَّ اللّٰهَ أرحم بعبادهٖ من الأُمّ بولدها پراشکال کا جواب

سوال: ﴿۱﴾ مسلمانوں کے دو عقیدے ہیں: (۱) اللہ اپنے بندوں سے ماں سے ۷۰/ گنا زیادہ محبت کرتا ہے (۲) جب انسان اپنی ماں کے پیٹ ہی میں ہوتا ہے تب فرشتے اللہ کے حکم سے اس انسان کی قسمت میں ''بد بخت'' یا ''خوش بخت'' لکھ دیتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ: جس بندے کی تقدیر میں اللہ کے حکم سے ''بد بخت'' لکھا گیا ہے، اس انسان سے اللہ ماں سے ۷۰/ گنا زیادہ محبت کرنے والا کیسے ہے؟ براہِ کرم تفصیل سے جواب دیں۔ (۱۵۶۳/ د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) جو کچھ امور ظہور پذیر ہونے والے ہیں یا جو کچھ انجام کار ہونا ہے، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم محیط کی بنا پر پہلے سے لوح محفوظ میں لکھ دیا (۱) اسی کو ''تقدیر'' کہتے ہیں، بچے کے ماں کے پیٹ میں ہونے کی حالت میں، فرشتہ کے ذریعے اسی نوشتہ تقدیر کی تثبیت ہوتی ہے۔ (۲)

(۲) اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی دولت عطا فرمائی، ارادہ واختیار کی قدرت دی، پھر ہدایت وراہنمائی کے لیے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا، پھر بھی انسان خلاف عقل سلیم اور خلاف ہدایت مرسلین گمراہی وبے راہ روی کا طریقہ اپنے ارادے سے اختیار کرتا ہے، جس کا انجام جہنم ہوتا ہے جو شقاوت وبدبختی کی آخری منزل ہے، جسے بد بخت انسان نے خود اپنے عمل واختیار سے اپنایا۔

(۳) اولاد آدم کے ساتھ محبت الٰہی کا کیا ٹھکانا! ازل سے ابد تک بے انتہا اس کے مظاہر ہیں، پیدائش سے قبل اور بعد ظاہری وباطنی نعمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمانا، ہدایت واستقامت کے لیے انبیا ومرسلین کو مبعوث فرمانا، ملک وملکوت میں اس کے لیے بے شمار ذرائع پیدا فرمانا، یہ سب محبت

---

(۱) عبادة بن الصامت قال: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ''إن أوّل ما خلق الله القلم، فقال: اكتب، فقال: ما أكتب؟ قال: أكتب القدر ما كان وما هو كائن إلى الأبد. (أخرجه الترمذي: ۵۲/۴، رقم: ۲۱۵۵. باب ومن سورة ''ن'')

ترجمہ: عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا، پھر حکم دیا کہ لکھ، تو اس نے پوچھا کہ کیا لکھوں؟ تو (اللہ تعالیٰ) نے فرمایا: ''تقدیر کو لکھو''، یعنی جو کچھ ہو چکا ہے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک) اور جو کچھ قیامت تک ہوگا۔

(۲) عن أنس بن مالك، عن النبيّ صلّى الله عليه وسلّم قال: إنّ الله عزّ وجل وَكَّلَ بالرّحم ملكًا، يقول: يارب! نطفة، يارب! علقة، يارب! مضغة، فإذا أراد أن يقضي خلقه قال: أذكر أم أنثى؟ شقي أم سعيد؟ فما الرّزق والأجل؟ فيُكتَبُ في بطن أمّه. (أخرجه البخاري باب قول الله عزّ وجل ''مخلقة''. رقم: ۳۱۸.

حضرت انس سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے رحم مادر کو ایک فرشتے کے حوالے کیا، وہ فرشتہ پوچھتا ہے ''اے رب نطفہ!، اے رب! گوشت کا لوتھڑا! پھر جب اس کو اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو فرشتہ پوچھتا ہے کہ نر یا مادہ؟ بد بخت یا نیک بخت؟ رزق کی کیا شکل ہوگی؟ اور موت کب آئے گی؟ پھر یہ چیزیں ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہیں۔

کی واضح دلیلیں ہیں، قدم قدم کی ٹھوکریں، وقت وقت میں ابتلاء وآزمائش کی گھڑیاں، زندگی میں کبھی غربت وافلاس، کبھی تونگری وخوشحالی، کبھی مرض، کبھی صحت یہ سب امور راہ راست پر لانے کے لیے الارم اور گھنٹیاں ہیں، ان سب کے باوجود بد بخت انسان نے اپنی پسند سے راہ جہنم تجویز کی، ہادیٔ خیر کو نہ پہچانا، منادیٔ خیر کی طرف کان نہ دھرا، اور اپنی تجویز کردہ راہ جہنم پر جما اور ڈٹا رہا حتی کہ موت آ گئی، بدبختی اس نے خود اختیار کی اور اپنے اختیار ومرضی سے اسے اپنائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم محیط کی بنا پر اس کی اختیاری بدبختی کو پہلے سے لکھ دیا تھا، یا فرشتوں سے اس کی تثبیت فرمادی، اس میں محبت الٰہی کا قصور نہیں، قصور اس بد بخت و بدنصیب انسان کا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی داخلِ جہنم ہونے والے کو اللہ تعالیٰ کی محبت یا انصاف میں کمی کی شکایت نہ ہوگی، بلکہ کھلے لفظوں میں اپنے ہی قصور کا اعتراف ہوگا(۱)

رسول اللہ ﷺ سے اس طرح کا سوال ایک عورت نے کیا تھا؛ **حیث قالت: أليس اللّٰه بأرحم بعباده من الأمّ بولدها، قال صلّى اللّٰه عليه وسلّم: بلىٰ، قالت: إن الأم لاتلقي ولدها في النّار، فأكب رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم، يبكي، ثمّ رفع رأسه إليها، فقال: إنّ اللّٰه لا يعذب من عباده إلاّ المارد المتمرِّدَ الّذي يتمرّدُ على اللّٰه وأبى أن يقول: لآ إله إلاّ اللّٰه . رواه ابن ماجة عن عبد اللّٰه بن عمر . كذا في المشكاة(۲)**

ترجمہ: ایک عورت نے عرض کیا: ماں کے اپنے بچے پر رحم کرنے کے مقابلے میں کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر زیادہ رحم کرنے والے نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں (اس) عورت نے کہا: یقینًا ماں اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالتی، پس رسول اللہ ﷺ سر جھکا کر رونے لگے، پھر عورت کی طرف سر اٹھا کر فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف انہیں لوگوں کو عذاب دیں گے، جو اللہ تعالیٰ سے تمرد اور سرکشی اختیار کرنے والا ہوگا، اور کلمہ طیبہ لآ إلٰـه اِلاّ اللّٰـه کہنے سے انکار کرے گا۔

پس عباد دو قسم کے ہوئے: ایک مرحومین اور ان پر اس قدر رحمت ہے کہ والد کو ولد پر نہیں،

(۱) رُبَـمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (حجر: ۲) ترجمہ: کفار خواہش کریں گے کہ اے کاش وہ مسلمان ہوتے۔

(۲) ابن ماجة ، رقم الحديث: ۴۲۹۷، كتاب الزّهد، باب ما يرجى من رحمة اللّٰه يوم القيامة.

دوسرے غیر مرحومین سوان پر آخرت میں رحمت ہی نہ ہوگی، پھر زیادتی کمی کا کیا ذکر۔ **کــذا فــي امداد الفتاوی**: ۵/۴۷۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ مفتیان دار الافتاء دارالعلوم دیوبند

فتوی کی جامع تعریف

فتوی جاری کرنے کا مجاز کون ہے؟

فتوی کی اشاعت کے حوالے سے میڈیا کی ذمے داری

محترم مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مہاتما گاندھی انٹرنیشنل ہندی یونیورسٹی وردھا مہاراشٹر میں ''طلعت صدیقی'' ایم فل ٹیلی مواصلات کے شعبہ میں پی۔ ایچ۔ڈی کررہی ہیں، ان کا موضوع ہے ''عورتوں کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والے فتووں کی اسٹیڈی کرنا''، وہ آپ سے رابطہ کرکے کچھ سوالات کریں گی، مہربانی کرکے ان کا تعاون کریں۔

اختر عالم، ٹیلی مواصلات اسسٹنٹ پروفیسر ٹیلی مواصلات مہاتما گاندھی انٹرنیشنل یونیورسٹی، مہاراشٹر۔

برائے کرم درج ذیل سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں؛

سوال: ﴿۲﴾......... (۱) آپ کی نظر میں فتویٰ کیا ہے؟

(۲) فتویٰ کون جاری کرسکتا ہے؟

(۳) آج کل اخبارات میں جس طرح فتاویٰ کو پیش کیا جارہا ہے، آپ کی اس پر کیا رائے ہے؟

طلعت صدیقی (۲۶/۷/ د ۱۴۳۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) ''فتوی'' عربی زبان کا لفظ ہے جو ''افتاء'' سے ماخوذ ہے، لغۃً ''افتاء'' کے معنی کسی چیز کو واضح

کرنا ہے، کہا جاتا ہے ”أفتاه في الأمر يعني أبانه“ (القاموس المحيط)، فقہی اصطلاح میں ”فتوی“ کسی شخص کے خاص معاملے میں حکمِ شرعی دریافت کیے جانے کے وقت اس معاملے کے حکم شرعی سے آگاہ کرنے کو کہا جاتا ہے، اس معنی کو عربی میں درج ذیل الفاظ کے ذریعے ادا کیا گیا؛

”الإخبار بحكم الله تعالىٰ عن الوقائع بدليل شرعي لمن سأل عنها، وقال البعض: تبيين الأحكام الصّادرة عن الفقهاء في الوقائع الجزئية(۱).

(الفتوى ونشأتها وتطورها، أدب المفتي للعلامه عميم الاحسانؒ)

مذکورہ بالا تعریف سے معلوم ہوا کہ فتوی درحقیقت شرعی حکم سے باخبر کرنا ہے، نہ کہ کسی پر کوئی چیز لازم کرنا، جیسے قاضیٔ شرعی فریقین پر احکام لازم کر دیتا ہے، مفتی (فتوی جاری کرنے والا) مستفتی (فتوی طلب کرنے والے) پر اپنی طرف سے کسی حکم کو لازم نہیں کرتا اور نہ اس کا وہ مجاز ہے؛ بل کہ مفتی کی ذمہ داری، مستفتی کو حکم شرعی سے واقف کرنا ہے(۲)، باقی عمل، تو یہ مستفتی اور خدا تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ ہے، نیز اس تعریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ”فتوی“ حکم شرعی کی ایسی اطلاع کو کہتے ہیں جو کسی سوال کے جواب میں ہو، سوال واستفسار کے بغیر اپنی طرف سے حکمِ شرعی کی جو رہنمائی کی جائے، وہ وعظ وارشاد ہے یا پھر مسائل کی تذکیر وتعلیم ہے۔

(۲) مفتی (فتوی جاری کرنے والا) چوں کہ درحقیقت رسول اکرم ﷺ کے نائب ہونے کی حیثیت سے، احکامِ الٰہی کے بیان میں ربِ کائنات کا ترجمان اور اس کی نیابت میں دستخط کرنے والا ہوتا ہے(۳)؛ اس لیے کارِ افتاء میں مصروف ہونے (فتوی جاری کرنے) میں قابلِ اعتماد ہونے

---

(۱) علم الفتاوى: علم تروى وتبين فيه الأحكام الصادرة عن الفقهاء في الوقائع الجزئية. (أدب المفتي، رسالة من رسائل قواعد الفقه: /۵۶۴، م: دار الكتاب).

(۲) إنّ المفتي مخبر بالحكم والقاضي ملزم به (شرح عقود رسم المفتي: /۴۵، دار الكتاب)

(۳) الف: لم تصلح مرتبة التّبليغ بالرواية والفتيا إلا لمن اتصف بالعلم والصّدق ....
وإذا كان منصب التوقيع عن الملوك بالمحل الذي لاينكر فضله ولايجهل قدره.......
فكيف بمنصب التّوقيع عن رب الأرض والسّماوات (اعلام الموقعين لابن القيم: ۱/۹۱).
ب: المفتي موقع عن اللّٰه تعالىٰ (شرح عقود رسم المفتي، باب آداب الفتوىٰ والمفتي والمستفتي، ص: ۴، ط: زكريا ديوبند).

کے لیے فقہاء نے کچھ شرائط ذکر کی ہیں جن سے آراستہ ہوئے بغیر کوئی شخص فتوی دینے کا اہل نہیں سمجھا جائے گا، وہ شرائط (۱) درج ذیل ہیں:

(الف) وہ شخص صحیح العقیدۃ اور اہلِ سنت والجماعت کے زمرے میں شامل ہو، (ب) اس شخص نے علومِ دینیہ معتمد علماء سے حاصل کیا ہو، (ج) کسی قابلِ اعتماد، ماہر فقیہ ومفتی کے پاس رہ کر فتوی نویسی کا سلیقہ، نیز اس کے اصول وضوابط کو باضابطہ سیکھا ہو، (د) زمانے کے عرف اور اہلِ زمانہ کے احوال سے واقف ہو، (ھ) وہ شخص خود صاحبِ بصیرت ہو، نیز جدید ودقیق مسائل کے سمجھنے میں بیدار مغز ہونا اور اخذ واستنباط کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی ضروری ہے، (و) وہ شخص ظاہری اعمال، حتی کہ وضع قطع میں بھی شریعت کا پابند ہو، نیز تقوی وانابت الی اللہ کی صفت سے آراستہ ہو وغیرہ۔

(۳) آج کل اخبارات میں فتووں کو جس طرح عموماً توڑ مروڑ کر، عبارت میں کتر بیونت کر کے پیش کیا جاتا ہے، نہ فتوے کا اصل متن (عبارت) منظرِ عام پر لایا جاتا ہے اور نہ ہی اس سوال کو بلفظہ نقل کیا جاتا ہے، جس کے جواب میں فتوی جاری کیا گیا ہے، مزید یہ کہ اخبار نویس (صحافی) اس پر عنوان اپنی طرف سے لگاتا ہے، جو بسا اوقات اشتعال انگیز اور بے بنیاد غلط رجحان پیدا کرتا ہے، یہ طریقہ صحافتی دیانت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ، عقلی واخلاقی اعتبار سے بھی سراسر غلط ہے؛ اس لیے کہ سائل اپنے معاملے کا (بسا اوقات) محض ایک جزء استفتاء میں نقل کر کے حکمِ شرعی معلوم کرتا ہے، جس کا حکم مختصر طور پر جواب میں بتلا دیا جاتا ہے، جس میں ظاہر ہے کہ معاملے کے تمام شقوں کا احاطہ ممکن نہیں ہوتا، نیز سوالات عموماً عوام الناس کی طرف سے ہونے کی وجہ سے، بسا اوقات جواب میں قانونی قیود کا لحاظ بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ عام فہم جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح جب کوئی شخص اپنے معاملے میں مذہب کا ضابطہ معلوم کرتا ہے، تو جواب میں اس ضابطے کی طرف رہنمائی کر دی جاتی ہے، مگر ایک خاص پس منظر اور مخصوص حالات کے تناظر میں جاری کردہ اس فتوے کو، میڈیا والے ایک عام اور ہر شخص کے لیے واجب العمل فتوے کے طور پر پیش کرتے ہیں

(۱) شرط المفتي كونه مكلفًا مسلمًا ثقةً مامونًا متنزّهًا عن أسباب الفسق وخوارم المروءة، فقيه النّفس سليم الذّهن، رصين الفكر، صحيح التّصرّف والاستنباط، متيقظًا(شرح عقود رسم المفتي نقلاً عن شرح المهذب للنّووي).

اور اس پر اپنی طرف سے گھٹا بڑھا کر تبصرے بھی کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں کم علم لوگ یا جدید تعلیم یافتہ؛ بلکہ کبھی زمرۂ دانشوراں میں شامل لوگ بھی اس سے متاثر ہوکر بیان بازی شروع کر دیتے ہیں، جس کا بہت غلط اثر عوام پر پڑتا ہے، مثال کے طور پر عورتوں کی ملازمت کا مسئلہ ہے؛ اس (ملازمت) کے عدمِ جواز (ناجائز ہونے) کا فتوی اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ملازمت کے دوران، عورتوں کے لیے عموماً شرعی پردے کی رعایت نہیں ہوتی یا مردوں کے ساتھ بے محابا اختلاط لازم آتا ہے، نیز بسا اوقات شوہر مصلحۃً اس (اپنی بیوی) کو ملازمت کی اجازت نہیں دیتا، ورنہ عورتوں کے لیے شوہر کی اجازت سے پردہ میں رہ کر، بہ وقتِ ضرورت ملازمت کرنا فی نفسہ جائز ہے(۱)، لیکن میڈیا والوں نے ناجائز ہونے کی وجوہات کو نظر انداز کر کے، یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی کہ عورتوں کی ملازمت مطلقاً ناجائز اور حرام ہے۔

الغرض میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی ذمے داری ہے کہ اگر کوئی فتوی منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں تو اس فتوے کا پورا متن بلفظہ مع سوال وجواب اور فتوی نمبر کے حوالے کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کریں، میڈیا کا سوال وجواب کے الفاظ میں تصرف کرنا یعنی کمی بیشی کرنا، تقدیم وتاخیر کر کے الٹ پھیر کرنا یا اپنے طور پر اس کا مفہوم متعین کر کے اپنے الفاظ میں پیش کرنا، ہرگز مناسب نہیں، بلکہ یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے۔

اور جہاں تک کسی فتوے پر کسی صاحبِ علم ودانش کی طرف سے علمی اشکال کی بات ہے تو اس سلسلے میں بہتر ہے کہ اخباری بیانات یا تبصرے کے بجائے براہِ راست ''دارالافتاء'' یا کسی معتمد مفتی سے رابطہ کیا جائے، تاکہ بات واضح ہو جائے، ہاں اگر کسی وجہ سے اخبار میں تبصرہ شائع کرانا ضروری معلوم ہو، تو کبھی بھی میڈیا کی طرف سے شائع کردہ، پروپیگنڈہ اور تصرف پر مشتمل فتوے پر اعتماد ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ فتوی (سوال وجواب) کی اصل کاپی یا نقل عکسی میڈیا سے یا (فتوی نمبر اور تاریخ اجراء بتلا کر) براہِ راست فتوی جاری کرنے والے ادارہ سے حاصل کی جائے، پھر اس کی روشنی میں کوئی تبصرہ شائع کیا جائے۔

نیز یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اخبار میں آنے والے دینی مسائل سے متعلق ہر بات کو فتوی

(۱) عورتوں کی ملازمت سے متعلق تفصیلی فتویٰ اس مجموعہ کے ص: ۲۹۷-۳۱۱ پر موجود ہے، ملاحظہ کر لیا جائے۔

خیال کیا جاتا ہے، حالاں کہ فتوی کی تعریف کے ضمن میں گزر چکا ہے کہ فتوی کسی مستند تربیت یافتہ مفتی کی طرف سے (بہ حیثیت مفتی) کسی سوال کے جواب میں بتلائے ہوئے شرعی حکم کو کہا جاتا ہے، نہ کہ ہر کس و ناکس کی بات، جو بھی دین سے متعلق ہو، اسے رائے، رجحان، عندیہ اور وعظ ونصیحت وغیرہ سے تو تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن فتوی بہر حال نہیں، اس لیے صحافت سے جڑے لوگوں کو ہمیشہ اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

املاہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/۴/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

فتوی کی اہمیت، فتوی غلط ہو تو کون ذمے دار ہوگا؟

سوال: ﴿۳﴾......... (۱) اسلامی شریعت میں فتوی کی کیا اہمیت ہے؟

(۲) اگر کوئی عالم کسی شخص کو کوئی فتوی دے اور وہ اس فتوی کی بنیاد پر عمل کرے؛ مگر وہ فتوی غلط ثابت ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس تناظر میں اللہ کے سامنے کون ذمہ دار ہوگا؟ عالم یا وہ شخص جس نے فتویٰ لیا تھا؟

(۳) کیا کسی عالم کے فتوی پر عمل کرنا ضروری ہے؟ یا ہم اس پر عمل نہ کریں؟

(۴) کبھی فتوی کے سلسلے میں مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ راست جان کاری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عالم کی ان کے محدود علم کے مطابق جانکاری ہے۔ براہِ کرم اس پر روشنی ڈالیں۔

محمد رفیع بنگلور (۱۰۰۴/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) فقہی اصطلاح میں فتویٰ کسی خاص معاملے میں حکم شرعی دریافت کیے جانے کے وقت اس معاملے کے حکم شرعی سے آگاہ کرنے کو کہا جاتا ہے "**الاخبار بحکم اللّٰہ تعالٰی عن الوقائع بدلیل شرعی لمن سأل عنہ، وقال البعض: تبیین الأحکام الصّادرة عن الفقهاء في الوقائع الجزئية.** ترجمہ: نئے پیش آمدہ معاملات میں دلیل شرعی کے ذریعے اللہ کے حکم سے اس شخص کو باخبر کرنا، جس نے مفتی سے اس کا حکم معلوم کیا ہے (فتوی کہلاتا ہے)، بعض لوگوں نے کہا: جزئی واقعات

میں فقہاء کی طرف سے صادر ہونے والے احکام کو بیان کرنا (فتویٰ ہے)(۱)، اگر شرعی مسئلہ کا حکم معلوم نہ ہو تو اسے معتمد و مستند مفتیان کرام سے معلوم کرنا چاہیے، قرآن کریم میں اس کا حکم دیا گیا: ”فَاسْأَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ“ (سورۃ النحل: آیت:۴۳)، اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہلِ علم سے پوچھ کر دیکھو۔ چنانچہ صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ سے مسائل پوچھا کرتے تھے، قرآن کی آیات اور احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں، رسول اکرم ﷺ نے زندگی بھر یہ کام کیا ہے، بے شمار فتاویٰ دیے ہیں(۲)، کتب احادیث آپ کے فتاویٰ سے بھری ہیں، آپ ﷺ کے زمانہ ہی میں اور آپ ﷺ کے بعد یہ فریضہ اجل صحابہ نے بھی انجام دیا ہے، جس سے نامعلوم مسائل شرعیہ میں حکم معلوم کرنے اور اس کا جواب دینے کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے۔

(۲)”فتویٰ“ بابصیرت، خداترس، علم شریعت میں گہری واقفیت رکھنے والے سے پوچھنا چاہیے(۳)، ہر کس وناکس سے نہیں، اس کے باوجود اگر پختہ دلائل سے فتویٰ کا غلط ہونا ثابت ہوجائے تو مفتی کو اس سے رجوع کرلینا چاہیے، البتہ گناہ کسی کو نہیں ہوگا؛ نہ فتویٰ لینے والے کو اور نہ ہی فتویٰ دینے والے کو اگر اس نے لاپروائی سے کام نہ لیا ہو، حدیث میں اس کا ذکر ہے(۴)

(۳)(الف)مفتی” فتویٰ جاری کرنے والا“ مستفتی(فتویٰ لینے والے) پر اپنی طرف سے

---

(۱) الفتوی نشاتها وتطورها (أدب المفتي)

(۲)”فتاوی رسول اکرم“ کے نام سے”شیخ عبدالرحمٰن حیدرآبادی“ نے چار سو صفحات پر مشتمل ان احادیث کو فقہی ابواب کے طرز پر جمع کیا ہے، جس میں حضور ﷺ سے کسی دینی امر سے متعلق حکمِ شرعی دریافت کیا گیا ہے، نیز علامہ ابن قیمؒ نے بھی دو سو صفحات پر مشتمل”فتاوی رسول اللہ ﷺ“ کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ اسی طرح فتاویٰ محمدی: تصنیف مولانا اصغر حسین صاحب بھی اس موضوع پر اچھی کتاب ہے۔

(۳)شرط المفتي كونه مكلّفًا مسلمًا ثقةً مامونًا متنزّهًا عن أسباب الفسق وخوارم المروءة. ....صحيح التصرف والا ستنباط، متيقّظًا (شرح عقود رسم المفتي، باب آداب الفتوى والمفتي والمستفتي:/٦،م: دار الكتاب).

(۴) عن عمرو بن العاص أنه سمع رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يقول: إذا حكم الحاكم فاجتهد، ثم أصاب، فله أجران، وإذا حكم فاجتهد، ثم أخطأ، فله أجر (أخرجه البخاري: رقم: ۷۳۵۲،باب أجر الحاكم إذا اجتهد فأصاب.

حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب حاکم کسی فیصلے میں اجتہاد کرتا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے تو اس کو دو اجر ملیں گے اور اگر اجتہاد میں غلطی کرتا ہے تو اس کو ایک اجر ملے گا۔

کوئی حکم لازم نہیں کرتا، اور نہ ہی اس کا وہ مجاز ہے؛ بلکہ مفتی کی ذمہ داری مستفتی کو قرآن وحدیث کی روشنی میں اس حکم شرعی سے آگاہ کرنا ہے، باقی رہا عمل تو یہ مستفتی اور خدا تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ ہے ''ولا فرق بين المفتي والحاكم إلاّ أن المفتي مخبر بالحكم والقاضي ملزم به'' (رسم المفتی: ۷۴، م: زکریا دیوبند) حاکم اور مفتی کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ مفتی حکم (شرعی) کی اطلاع دیتا ہے اور حاکم (قاضی) اسے لازم کرتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے حکم شریعت پر عمل کرنا اس طور پر کہ، اپنی ضرورت کے ایک ایک مسئلہ کا حکم سیکھ کر عمل پیرا ہوں، ضروری ہے، خواہ مستند کتابیں پڑھ کر یا معتمد عالم سے معلوم کرکے یا احکامِ شریعت پر گہری نظر رکھنے والے مفتی سے فتویٰ لے کر۔ فتویٰ شرعی جس شخص کے بھی حال کے مطابق ہو، اس کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ وہ شریعت کا ایک حکم ہے۔ (ب) آپ اگر کسی فتویٰ پر عمل نہیں کرتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟

(۴) کسی مستند مفتی کا فتویٰ اس کی ذاتی رائے نہیں ہوتی؛ بلکہ قرآن وحدیث سے نکلے ہوئے حکم شرعی کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے فتویٰ لینے والے کو حکم شرعی کی عظمت ملحوظ رکھنا چاہیے، اسی طرح فتویٰ دینے والے مفتی کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔

از: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی

الجواب صحیح: محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ، مفتیان دارالعلوم دیوبند

ایک ہی فقہی مسلک کی پیروی کیوں ضروری ہے؟

سوال: ﴿۴﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ہذا میں: میں حنفی مسلک سے تعلق رکھتا ہوں چونکہ میرے ذہن میں ایک سوال ہمیشہ اٹھتا ہے، میں اس سوال کا جواب آپ لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ، جب چاروں مسلک، حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی برحق ہیں، حضور کی سنت کے مطابق ہیں، تو سب کو الگ الگ تقسیم کرنے کا کیا مطلب؟ تمام لوگ ہر مسلک پر کیوں نہیں چل سکتے، ہر آدمی ہر مسلک پر ہر وقت کیوں عمل نہیں کرسکتا؟ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ ان اماموں نے مسلمانوں کو آپس میں تقسیم کردیا، اگر سب کو ایک ہونا ہے تو سب کو ہر مسلک پر عمل کرنا ہوگا، ورنہ ایک سنت

چھوٹ جائے گی اور ایک پکڑی جائے گی، مسلمانوں کو ہر سنت پر عمل کرنا چاہیے جو کہ حضور ﷺ نے کی، حنفی والا شافعی سنت کو چھوڑتا ہے، شافعی والا حنفی سنت کو چھوڑتا ہے، اسی طرح باقی دو مسلک کا یہی حال ہے۔ حدیث وقرآن کی روشنی میں واضح کریں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں مسلک نہ تھے تو آپ کے بعد یہ مسلک کیسے پیدا ہوگئے، وہی تمام سنت جو آپ ﷺ کے زمانے میں تھی ہم تک ویسے ہی کیوں نہیں پہنچی، ان مسلک کا آپ کے بعد ظاہر ہونے کا مطلب اور ان مسالک کے آنے کی وجہ بیان کریں؟ جزاکم اللہ خیراً۔

عامر مسعود مشتاق کوپاگنجی (۹۲۱/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ہر آدمی ہر مسلک پر کیوں نہیں چل سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ قرون اولیٰ میں خیر کا غلبہ تھا (۱)، نفسانی خواہشوں کا عامۃً دین میں دخل نہیں تھا؛ اس لیے جو شخص بھی اپنے جس بڑے سے مسئلہ دریافت کرتا، نیک نیتی سے دریافت کرتا اور اس پر عمل کر لیتا تھا، چاہے نفس کے موافق ہو یا خلاف، مگر بعد کے دور میں یہ بات نہیں رہی؛ بلکہ لوگوں میں ایسا داعیہ پیدا ہونے لگا کہ ایک مسئلہ ایک عالم سے دریافت کیا، اس میں نفس کو تنگی محسوس ہوئی تو دوسرے عالم سے معلوم کیا، جس میں سہولت معلوم ہوئی بس اسی کو اختیار کر لیا، پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی؛ بلکہ ہر مسئلہ میں اس کی فکر لگی کہ کہاں سے سہولت کا جواب ملتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ طلبِ حق کا داعیہ نہیں، بلکہ اتباعِ ہویٰ ہے۔

اس طریقہ کے اختیار کرنے میں بعض دفعہ بڑی خرابی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً: کسی باوضو آدمی نے بیوی کو ہاتھ لگایا، اس سے کسی شافعی المذہب نے کہا کہ: وضو دوبارہ کرو، کیوں کہ یہ ناقضِ وضو ہے، تو یہ شخص جواب میں کہتا ہے کہ: میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا ہوں، ان کے نزدیک ناقضِ وضو نہیں

---

(۱) عن عمر بن الخطّابؓ، عن النّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال: خير النّاس قرني، ثمّ الّذين يلونهم، ثمّ الّذين يلونهم، ثمّ يفشو الكذب حتّى يشهد الرّجل ولا يستشهد (التّرمذي: رقم/ ۲۳۰۳)

ترجمہ: بہترین لوگ ہمارے زمانے کے لوگ ہیں، پھر جو ان سے متصل ہیں، پھر جو ان سے متصل ہیں، پھر جھوٹ پھیل جائے گا، یہاں تک کہ ایک آدمی گواہی دے گا حالانکہ اس سے گواہی کی درخواست نہیں کی جائے گی۔

ہے؛ بلکہ اس وضو سے نماز درست ہے، پھر اس نے قے کی اس پر ایک حنفی المذہب نے کہا کہ: وضو دوبارہ کرو؛ کیوں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قے ناقض وضو ہے، اس نے جواب دیا کہ: میں امام شافعیؒ کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں، ان کے نزدیک قے ناقض وضو نہیں ہے؛ بلکہ اس وضو سے نماز درست ہے، اب اگر یہ شخص اسی حالت میں نماز پڑھے گا تو اس کی نماز نہ امام شافعیؒ کے نزدیک درست ہوگی نہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، اسی کا نام تلفیق ہے، جو باتفاق امت باطل اور ناجائز ہے۔

درحقیقت یہ طریقہ اختیار کرنا نہ امام شافعیؒ کی تقلید ہے نہ امام ابوحنیفہؒ کی؛ بلکہ یہ تو خواہش نفسانی کا اتباع ہے، جو کہ شرعاً ممنوع ہے، اس کا نتیجہ خدا کے راستے سے ہٹنا اور بھٹکنا ہے۔ ''وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' (ترجمہ) اور نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ وہ خدا کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گی (سورہ ص:۲۶)، اس لیے ضروری ہوا کہ ایک ہی امام کی تقلید کی جائے، چوں کہ قرآن نے اتباع کو انابت کے ساتھ مربوط کیا ہے ''وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ'' اس شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو (سورہ لقمان:۱۵)، اس بنا پر مجموعی حالات سے کسی کو امام ابوحنیفہؒ کے متعلق ظن غالب ہوا کہ ان کا اجتہاد قرآن وحدیث کے زیادہ موافق ہے، اس لیے ان کی تقلید اختیار کی، کسی کو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ میں سے کسی کے متعلق یہ ظن غالب ہوا، تو اس نے ان کی تقلید کی، اب یہ درست نہیں کہ اپنے امام کو چھوڑ کر جب دل چاہا کسی دوسرے کے مذہب پر عمل کر لیا جائے، کیوں کہ اس میں تلفیق بھی ہو جاتی ہے، اور خواہش نفسانی کا اتباع بھی، جن کا نتیجہ حق سے بُعد اور گمراہی ہے۔

ان چاروں ائمہ نے مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا؛ بلکہ ان مسالک سے امت کے لیے توسع کی راہ پیدا ہوتی ہے، اور خیر انہی چاروں میں ہے، اگر ان کو چھوڑ کر ہر شخص کو آزادی دے دی جائے تو مسلمان ہزاروں حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ہر شخص سہولیات کا طالب اور خواہش کا غلام بن جائے گا، اور ہر امام کے یہاں سے سہولتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس پر عمل کرے گا اور دین ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔

نیز حضور ﷺ کی جتنی سنتیں ہیں، بیک وقت ان تمام پر عمل ان ہی چاروں ائمہ کی وجہ سے ہو رہا ہے، اگر لوگ چاروں مسلکوں کو چھوڑ کر فقط ایک مسلک پر عمل کرنے لگیں، تو اس صورت میں

صرف ایک ہی سنت پر عمل ہو سکے گا، دوسری سنت یقیناً متروک ہوگی مثلاً: حضور ﷺ کا عمل رفع یدین اور ترک رفع یدین دونوں حدیثوں میں آیا ہے(۱)، چار مسلک ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ رفع یدین پر عمل کرتے ہیں اور کچھ لوگ ترک رفع یدین پر، اس طرح دونوں سنتوں پر بہ یک وقت دنیا میں عمل ہورہا ہے اور اگر تمام لوگ ایک ہی مسلک پر عمل پیرا ہوں تو اس صورت میں اگر رفع یدین پر عمل ہوگا تو ترک رفع یدین کی سنت بالکلیہ متروک ہوگی، اسی طرح اس کے برعکس۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسالک مسلمانوں کے لیے خیر ہیں (۲)، اسی میں رہ کر مسلمان ضلالت وگمراہی سے بچ سکتا ہے، چنانچہ حضرت امام ''شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ'' نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف وجوہ سے یہ مبرہن کیا ہے کہ تمام مفاسد کا سد باب اور مکمل حزم واحتیاط اسی میں ہے کہ ان ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید کی جائے، فرماتے ہیں: **اعلم أن في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحة عظيمة وفي الإعراض عنها مفسدة كبيرة** (عقد الجيد: /۱۳، المطبعة السلفية، القاهرة)، جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب سے یکسر روگردانی میں بڑا فساد ہے۔

(۲) ان مسالک کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہوا کہ بعض مسائل میں حضور اقدس ﷺ سے دو قول منقول ہیں مثلاً: رفع یدین وترک رفع، دونوں حضور اقدس ﷺ سے مروی ہیں، حضور ﷺ کے دونوں عمل صحابہ کرامؓ نے بعد والوں کو بتائے، تو بعض حضرات نے ان دلائل کی بنیاد پر جو ان کے

---

(۱) **عن سالم عن أبيه قال: رأيت النبيّ صلّى اللّه عليه وسلّم إذا افتتح الصّلاة يرفع يديه حتّى يحاذي بها منكبيه، وإذا ركع، وإذا رفع رأسه عن الرّكوع ولا يرفع بين السّجدتين (ابن ماجة: رقم /۸۵۸، وأخرجه البخاري وغيره بمعناه).**

عن ابن مسعود: ألاأصلي بكم صلاة رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم؟ فصلى، فلم يرفع يديه إلاّ في أوّل مرّة (أخرجه التّرمذي: رقم /۲۵۷، باب رفع اليدين عند الرّكوع)

(۲) **فالتمذهب للمجتهدين سر ألهمه اللّه تعالى العُلَماء وجمعهم عليه من حيث يشعرون أو لايشعرون (الإنصاف: از شاه ولي اللّه محدث دهلویؒ** بہ حوالہ مجموعہ رسائل ومقالات/۳۸۶، ط: دارالعلوم دیوبند). ترجمہ: ائمہ مجتہدین کے مسالک کو اختیار کرنا ایک راز ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے علماء کے دل میں ڈال دیا اور شعوری اور غیر شعوری طور پر امت کو اس پر متفق کر دیا۔

نزدیک راجح تھے رفع یدین کو لیا، اسی طرح بعض لوگوں نے ترکِ رفع یدین کو اختیار کیا۔

نیز حضرات صحابہ کرامؓ کے مابین بھی بے شمار مسائل میں اختلاف رہا، ان حضرات کے باہمی اختلاف کی بے شمار مثالیں حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے صحابہ کے اختلاف کے چند نمونے ذکر فرمائے ہیں: **وقد كان في الصّحابة والتّابعين ومن بعدهم من يقرأ البسملة ومن لا يقرأ إلخ** (حجۃ اللہ البالغۃ: ۱/۳۴۲، دار احیاء العلوم، لبنان) صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے زمانہ میں بعض حضرات نماز میں بسم اللہ جہراً پڑھتے اور بعض جہراً نہیں پڑھتے تھے، بعض قے کرنے کی وجہ سے وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے، بعض لوگ آگ سے پکی ہوئی اشیاء کھانے کے بعد وضو کرتے تھے اور بعض لوگ نہیں کرتے تھے، ائمہ اربعہ نے چونکہ انہی حضرات صحابہ اور ان سے فیض یافتہ حضرات کی فہم وبصیرت پر اعتماد کیا ہے، اور ان ہی کے اقوال ومذاہب کو اختیار کیا ہے، اس لیے ائمہ اربعہ میں بھی مسائل میں اختلاف واقع ہوا۔

اور جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوا تو نت نئے ایسے مسائل وجود میں آئے جن کا صریح حکم، قرآن وحدیث میں نہ تھا، ان مسائل میں مجتہدین کو اجتہاد سے کام لے کر، اس کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کرنا پڑا، چونکہ علم وفہم اور قوت اجتہاد میں فرق ایک طبعی اور فطری چیز ہے، اس لیے ان کے اجتہادی فیصلوں میں بھی اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف مبنی علی الاخلاص تھا، اس لیے مذموم نہیں؛ بلکہ پسندیدہ اور باعثِ رحمت ہے، چنانچہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "**اختلاف أمّتي رحمة**" (۱) میری امت کا اختلاف رحمت ہے، حدیث پاک میں جس اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا اس کا صحیح مصداق یہی صحابہ کرامؓ وائمہ حضرات کا اختلاف ہے، چونکہ ان چاروں ائمہ کے شاگرد زیادہ ہوئے، انھوں نے ان کے علم کو مدون ومحفوظ کر کے پوری دنیا میں پھیلایا، اس لیے جب علماء نے لوگوں کے اندر

---

(۱) جامع الأحاديث للسّيوطي: رقم الحديث: ۸۷۴، وفيه وفي المقاصد الحسنة للسّخاوي مزيد من البحث حول هذا الحديث النّبوي. ملخصه: أن هٰذا الحديث مشهور على الألسنة، وقد ذكره الخطّابي في غريب الحديث مستطرداً، وردّ على من اعترض عليه، وأشعر الخطّابي بأن له أصلاً عنده، وفي جامع الحديث: أن هٰذا الحديث قد أخرجه نصر المقدسي والبيهقي والحليمي وغيرهم ولكن لم يوجد له سند، من الممكن أنه خرج في بعض كتب الحفاظ الّتي لم تصل إلينا.

دیانت وامانت کو گھٹتے ہوے دیکھا تو ان چاروں ائمہ کے مسلک کی تقلید کو واجب قرار دے دیا، اور اس پر پوری امت کا اجماع بھی ہوگیا، اس طرح یہ مسالک وجود میں آئے جو درحقیقت قرآنی آیات، رسول اللہ ﷺ کے اقوال واعمال، صحابہ کرامؓ کے آثار اور اجماع وقیاس شرعی پر مبنی ہیں، اور ان حضرات نے اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت اور حضور ﷺ کی تمام سنتوں کو پوری دیانت وامانت کے ساتھ، عمدہ طریقے سے امت تک پہونچایا ہے، ان حضرات کا پوری امت پر احسان ہے کہ انھوں نے تن من دھن کی بازی لگا کر احکام شرعیہ کو ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں مدوّن ومرتب فرمایا، اور ہمارے لیے دین پر چلنا آسان کر دیا، اللہ ان تمام حضرات کو پوری امت کی طرف سے ان کے شایانِ شان اجر عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۶/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلندشہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

الحمد للہ! جواب کافی، وافی اور شافی ہے۔ ائمہ کی تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں کی جاتی ہے، اور ان میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں، باقی شریعت میں کسی امام کی تقلید نہیں کی جاتی، اللہ اور رسول ہی کی پیروی کی جاتی ہے، اور وہ تین قسم کے مسائل فقہ کا بیس فیصد حصہ ہیں، مگر وہ علاحدہ مرتب نہیں کیے گئے، بلکہ پوری فقہ ایک ساتھ مرتب کی گئی ہے، اور ان تین قسم کے مسائل کے اعتبار سے فقہ حنفی، شافعی وغیرہ کہا جاتا ہے، باقی اسّی فیصد مسائل اہل حق کی فقہوں میں مشترک مسائل ہیں۔

اور وہ تین قسم کے مسائل یہ ہیں:

۱- کبھی نص فہمی میں اختلاف ہو جاتا ہے، کسی آیت کا یا حدیث کا مطلب کیا ہے؟ اس میں مجتہدین میں اختلاف ہو جاتا ہے: ایک امام کہتا ہے: یہ مطلب ہے، دوسرا کہتا ہے: یہ مطلب ہے، اور عربی زبان کی رو سے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں، پس تقلید کے علاوہ چارہ نہیں رہتا، اور ایسی جگہ دو اماموں کی ایک ساتھ تقلید ممکن نہیں ہوتی۔

۲- کبھی ناسخ ومنسوخ متعین کرنے میں اختلاف ہو جاتا ہے یعنی کون سی روایت مقدم ہے اور کو سی مؤخر: اس میں اختلاف ہو جاتا ہے، پس یہاں بھی تقلید کے علاوہ چارہ نہیں۔

۳- کبھی مسئلہ استنباطی ہوتا ہے، نص کی تہ سے مسئلہ نکالنا پڑتا ہے، جس میں اصول فقہ کو پیش نظر رکھنا

ضروری ہوتا ہے، پس استنباط میں اختلاف ہوجاتا ہے، اس صورت میں بھی تقلید ناگزیر ہوجاتی ہے۔

اور ان تینوں کی مثالیں میری کتاب ''علمی خطبات'' حصہ اوّل، ص: ۹۶ میں ہیں، پس اگر سائل اسی بات کو سمجھ لے تو اس کا اشکال حل ہوجائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

حررہ: سعید احمد پالن پوری

فقہ الاقلیات: حقیقت، حکم اور فی سبیل اللہ کا مصداق

باسمہٖ تعالیٰ: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں: عکسی کاپی (فوٹو اسٹیٹ) (۱)

(سوال سے متعلق حاشیہ: استفتاء سے منسلک مضمون طویل ہونے کی بناء پر اختصار کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے)

مضمون نگار لکھتے ہیں:

(۱) یہاں ایک دومثالیں پیش کی جارہی ہیں جن سے عہد حاضر میں فقہ الاقلیات کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے:

(الف): یورپ میں ''یورپین کونسل فار فتویٰ اینڈ ریسرچ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے جس کے صدر شیخ یوسف قرضاوی ہیں۔ جولائی ۲۰۰۱ء میں اس کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ یورپ میں اہل کتاب سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی کے درمیان بیوی مسلمان ہوجاتی ہے اور شوہر اپنے دین پر قائم رہتا تھا، مجلس نے گہرائی کے ساتھ اس مسئلے پر غور وفکر کیا اور یورپ میں مسلم اقلیت کے مخصوص حالات کی بناء پر یہ فیصلہ کردیا کہ کسی بھی مسلم عورت کے لیے ابتداءً غیر مسلم مرد کے ساتھ شادی کرنا حرام ہے، لیکن اگر بیوی شادی کے بعد مسلمان ہوئی ہو اور شوہر اپنے مذہب پر قائم ہو، دونوں کے درمیان جسمانی تعلق بھی قائم ہوچکا ہو اور مدتِ عدت بھی گزر چکی ہو، تو عورت اپنے شوہر کے اسلام لانے کا انتظار کرے، خواہ یہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، پھر اگر شوہر اسلام لے آئے تو دونوں پہلے نکاح پر باقی سمجھے جائیں گے اور اس نکاح کی تجدید کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

یورپ کے اس ادارے کا یہ فتویٰ مذاہب اربعہ کے فیصلے سے مختلف ہے، مگر اس میں مقامی حالات کی رعایت پوشیدہ ہے۔ مذاہب اربعہ کے نزدیک تو ایسی نومسلم عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ عدت گزارنے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ رہے، یا اس کو اپنے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنے دے، لیکن مذاہب اربعہ سے ہٹ کر بعض علماء کی رائے ہے کہ عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے اسی شوہر کے ساتھ رہے، ان تمام حقوق وواجبات کے ساتھ جو بیوی ہونے کے ناطے وارد ہوتے ہیں؛ بشرطیکہ وہ امید کرتی ہو کہ شوہر اسلام لے آئے گا اور شوہر کے ساتھ رہنا عورت کے دین میں کوئی رکاوٹ نہ بنے گا، یہ رائے یورپ کے اس ادارے نے اس حکمت کے تحت قائم کی ہے کہ کہیں عورتیں یہ جان کر اسلام میں داخل ہونے سے نہ رک جائیں کہ اسلام لانے سے ان کا =

ارسال خدمت ہے؟

سوال: ﴿۵﴾......(ا) صاحب مضمون نے فقہ الاقلیت پر کافی زور دیا ہے۔

(الف) فقہ الاقلیت سے مقصود و مراد کیا ہے؟

(ب) اور شرعی نقطۂ نظر سے جواز وعدم جواز کے بارے میں اس کی حقیقت کیا ہے؟

= اپنے شوہروں کو چھوڑ نا اور خاندان کو خیر باد کہنا لازم آئے گا۔ اس رائے کے حامل علماء اپنی دلیل میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے اس فیصلے کا حوالہ دیتے ہیں، جو آپ نے ''حیرہ'' میں رہنے والی اس عورت کے بارے میں دیا تھا جو خود اسلام لائی تھی، مگر اس کا شوہر مسلمان نہیں ہوا تھا کہ وہ اگر چاہے تو اس آدمی کو چھوڑ دے یا اسی کے ساتھ رہے۔

اسی طرح علماء کرام حضرت علیؓ کی اس رائے کو بھی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی عیسائی عورت جو کسی یہودی یا عیسائی مرد کی بیوی ہو، اسلام لے آئے تو چوں کہ اس کے ساتھ ایک عہد ہو چکا ہے؛ اس لیے اس مرد کا اس عورت کے جسم پر حق رہے گا۔ یہی رائے ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ اور حماد بن ابی سلیمانؒ سے ثابت ہے۔

فقہ الاقلیات کا مطلب یہی ہے کہ موجودہ عہد کے تبدیل شدہ حالات میں مختلف علماء کے اقوال کی روشنی میں بہتر فیصلہ کیا جائے، خواہ وہ روایتی فقہی مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مذکورہ بالا مسئلے میں ''تیسیر'' اور ''رفع حرج'' کے اصول کو بھی سامنے رکھا گیا ہے اور نص سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

(ب) ہم یہاں پر صرف علامہ قرضاوی کی کتاب ''فقه الأقليات المسلمة'' کا حوالہ دیں گے جس میں انہوں نے ''یوروپین کونسل فار فتویٰ اینڈ ریسرچ'' کے صدر کی حیثیت سے ایک استفتاء کا جواب دیا ہے۔ فتویٰ پوچھنے والے نے ان سے یہ دریافت کیا تھا کہ ''یورپ'' یا ''امریکہ'' کے ایک شہر میں اسلامک سنٹر قائم کرنے کے لیے (جس میں مسجد، لائبریری، عورتوں کے لیے نماز کی علاحدہ جگہ، امام وخطیب کی قیام گاہ اور دیگر سہولیات مہیا کی جائیں گی) زکوٰۃ کی رقم حاصل کی جاسکتی ہے؟ شیخ قرضاوی نے ''بناء المركز الإسلامية عن أموال الزكوٰة'' کے عنوان کے تحت اس کا جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ بیان کیے گیے ہیں ان میں ایک مصرف ''في سبيل الله'' بھی ہے، في سبيل الله کے الفاظ میں قدیم مفسرین اور جمہور فقہاء ''میدانی جہاد'' مراد لیتے ہیں، اس زمانے میں میدانی جہاد کے مواقع شاذ ونادر پیش آتے ہیں؛ لیکن کسی ملک میں دینی اعتبار سے مسلمانوں کی پوزیشن مستحکم کرنا، ان کو دین کے بارے میں واقفیت بہم پہنچانا، اسلام یا مسلمانوں کے بارے میں غیر مسلموں کے شکوک وشبہات دور کرنا، اور غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانا، مسلمانوں کو عددی اور معنوی دونوں اعتبار سے طاقتور بنانا، یہ سارے کام ''في سبيل الله'' کے دائرے میں آتے ہیں اور اس دور کا جہاد یہی ہے، اگر اسلامی سینٹر قائم کرنے والے مخلص، بے ریا اور امانت دار ہوں اور ملت کا اعتماد انہیں حاصل ہو تو اس صورت میں ملت اسلامیہ کی مجموعی بہبود کو سامنے رکھ کر، سینٹر کے قیام کے لیے زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنا درست ہوگا۔

(۲) "**في سبيل الله**" کی تفسیر میں بحوالہ علامہ "یوسف قرضاوی" بہت سی اقسام قلم برداشتہ تحریر فرمادی ہیں یہ کہاں تک صحیح ہے؟　المستفتی حکیم عبدالرؤف عفی عنہ قاسمی (۵۹۲/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق، حامداومصلیاومسلما:

(۱)(الف وب) "فقہ الاقلیات" کی اصطلاح اس دورِ جدید کی ایجاد ہے، قدیم فقہاء کی کتابوں میں اس طرح کا کوئی عنوان نہیں ملتا؛ البتہ اگر مسلمان کسی ملک میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، یا انہیں اسلامی قانون پر عمل کرنے کی کھلی اجازت نہیں ہے، یا بعض احکام پر عمل پیرا ہونا دشوار ہے وغیرہ، ان جیسی صورتوں کے مخصوص احکامِ شرعیہ، فقہاء کرام نے مختلف ابواب کے ضمن میں بیان کیے ہیں، ممکن ہے کہ اس طرح کے مسائل کو مستقل طور پر یکجا جمع کردیا گیا ہو اور ان کا نام "فقہ الاقلیات" رکھ دیا گیا ہو؛ لیکن اس کی پوری حقیقت، اس کا پس منظر، اس کے موجدین کے متعلق تفصیلی معلومات ہمیں نہیں ہے۔

بہر حال صرف مسلمانوں کے کسی ملک میں عدداً کم ہونے یا وہاں کی تہذیب وثقافت کے مختلف ہونے کی وجہ سے، امت کے اجماعی مسائل یا نصوص قرآن وحدیث کے خلاف کوئی راہ اپنانا قطعاً جائز نہیں، اس طرح کے حالات ہر زمانہ میں پیش آتے رہے ہیں اور وقت کے بالغ نظر علماء نے شرعی نصوص کے دائرے میں رہ کر احکام کا استنباط کیا ہے؛ لیکن مسلّماتِ شرعیہ سے خروج کو کسی طرح جائز نہیں سمجھا، لہٰذا کسی مسلمان خاتون ـــــــ خواہ شروع سے مسلمان ہو یا غیر مسلم مرد سے شادی کے بعد مسلمان ہوئی ہو ـــــــ کے لیے اپنے کفر وشرک پر قائم خاوند کے ساتھ آئندہ رہنے کی قطعاً گنجائش نہیں، اس امید پر کہ وہ شوہر بھی اسلام قبول کرلے گا۔ شوہر بیوی میں سے کسی ایک کے مسلمان ہونے کی مثالیں اور نظائر تو عہدِ نبوی میں بھی ملتے ہیں؛ لیکن حضور ﷺ نے حالات کے پیشِ نظر احکامِ شرعیہ کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا مثلاً: اسلام سے پہلے بعض صحابۂ کرامؓ کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں "**عن الحارث عن قيس قال: أسْلمت وعندي ثمان نسوة، فذكرت ذلك للنبي – صلّى الله عليه وسلّم – فقال النّبي – صلّى الله عليه وسلّم –: اخترمنهنّ أربعًا**"(۱)، اور بعض کے نکاح میں دوسگی (حقیقی) بہنیں تھیں "**عن الضّحاك بن فيروز، عن أبيه قال: قلت: يارسول الله! إنّي أسلمت وتحتي أختان؟ قال: طلّق أيتها شئتَ**" (۲)، آپ ﷺ نے

(۱) سنن أبي داوٗد: رقم: ۲۲۴۱، باب في من أسلم وعنده نساء أكثر من أربع .

(۲) أخرجه أبو داوٗد: رقم: ۲۲۴۳، الباب السابق.

اسلام لانے کے بعد انھیں اسی حالت میں رہنے کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ صرف چار ہی بیویاں رکھنے کی اجازت دی اور دو بہنوں میں سے ایک کو طلاق دے کر جدا کرنے کا حکم دیا؛ حالاں کہ وہاں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ یہ لوگ اس ملک (عرب) میں اقلیت میں ہیں اور نئے نئے مسلمان بھی ہو رہے ہیں، اگر اپنی سابقہ حالت پر قائم نہ رہنے دیا جائے گا، تو ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں، اس خوف سے کہ ہمیں تو اپنی بیوی سے ہاتھ دھونا پڑے گا جب کہ یہ مصلحت وہاں بھی داعی بن سکتی تھی کہ ایک ساتھ دس بیویاں یا دو حقیقی بہنیں ایک شخص کے نکاح میں رہیں گی، تو شوہر کی صحبت اور اس کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر بیویاں بھی اسلام قبول کرلیں گی؛ لیکن ان تمام احتمالات کا قطعًا اعتبار نہیں کیا گیا تو آج یورپ، امریکہ وغیرہ میں اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہونے پر مُبیّنہ احتمالات کی وجہ سے حضور ﷺ کے عمل، نیز اجماعی مسئلے کی خلاف ورزی کرنے کی ہرگز گنجائش نہیں ہوگی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ''یورپین کونسل فار فتویٰ اینڈ ریسرچ'' کا منسلکہ فیصلہ کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی عورت کو اپنے سابق کافر شوہر کے ساتھ رہنے کی اجازت ہے، بالکل غیر شرعی اور خارق للاجماع ہے۔ رہے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے آثار، تو چوں کہ مضمون نگار نے ان کا کوئی حوالہ نہیں دیا؛ اس لیے ان کی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں! ان (آثار) کے خلاف حضرت عمرؓ کا فیصلہ منقول ہے؛ چناں چہ صاحبِ بدائع نے نقل کیا ہے کہ ''بنوتغلب'' کے ایک شخص کے نکاح میں ایک خاتون تھی جس نے اسلام قبول کرلیا تھا؛ لیکن شوہر نے اسلام قبول نہیں کیا تو حضرت عمرؓ نے دونوں کے درمیان تفریق کردی (یہ روایت سننِ سعید بن منصور میں تفصیل سے مذکور ہے)، نیز امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے '' **إذا أسْلَمَتْ النّصرانيّة قبل زوجها بساعة حرمت عليه**'' یعنی اگر کوئی نصرانی خاتون اپنے شوہر سے پہلے مسلمان ہوجائے گی اگرچہ تھوڑی دیر پہلے ہو، پھر بھی وہ (خاتون) اس (اپنے سابق شوہر) پر حرام ہوجاتی ہے۔

(۲) ''**في سبيل الله**''، لفظی معنی کے اعتبار سے بہت عام ہے، اس میں وہ تمام امور داخل ہو سکتے ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیے جائیں؛ لیکن صحابۂ کرام جنہوں نے براہِ راست قرآن کریم کو رسول اکرم ﷺ سے پڑھا اور سمجھا ہے، ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان تمام میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے، اور ایک حدیث

میں ہے: کہ ایک شخص نے اپنا ایک اونٹ ''في سبيل الله'' وقف کر دیا تھا، تو آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو'' **روي أن رجلًا جعل بعيرًا له في سبيل الله، فأمر رسول الله ــ صلّى الله عليه وسلّم ــ أن يُحْمَل عليه الحجّ** '' (۱)

امام ''ابن جریر''، ''ابنِ کثیر'' قرآن کریم کی تفسیر، روایاتِ حدیث ہی سے کرنے کی پابندی کرتے ہیں، ان سب نے لفظ ''**في سبيل الله**'' کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لیے مخصوص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو، اور جن فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے، کہ وہ فقیر و حاجت مند ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر اور حاجت مند خود ہی مصارفِ زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا، جب بھی وہ مستحقِ زکاۃ تھے؛ لیکن ائمہ اربعہ اور فقہائے امت میں سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارفِ زکاۃ میں داخل ہیں، بل کہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکاۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہائے حنفیہ میں سے ''شمس الأئمہ سرخسی'' نے مبسوط اور شرح سیر میں اور فقہائے شافعیہ میں سے ''ابوعبید'' نے ''کتاب الاموال'' میں اور فقہائے مالکیہ میں سے ''دردیر'' نے ''شرح مختصر خلیل'' میں اور فقہائے حنابلہ میں سے ''موفق'' نے ''مغنی'' میں اس کو پوری تفصیل سے لکھا ہے، ائمہ تفسیر اور فقہائے امت کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے تو اس مسئلے کے سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے، وہ یہ کہ اگر زکاۃ کے مسئلے میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات وعبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو، تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے اور رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے .... کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارف صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا؛ بلکہ خود ہی آٹھ مصرف متعین فرما دیے (۲)، تو اگر ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں

(۱) المبسوط للسّرخسي. باب عشر الأرضين: ۳/۱۰، ناشر: دار المعرفة بيروت.

(۲) عن زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله– صلى الله عليه وسلم – فبايعته فذكر حديثًا طويلًا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطِني من الصّدقة، فقال له رسول الله –صلّى الله عليه وسلّم =

داخل ہیں اوران میں سے ہر ایک میں زکاۃ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشاد نبوی بالکل غلط ٹھہرتا ہے، معلوم ہوا کہ ''فی سبیل اللہ'' کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے؛ بل کہ مراد وہ ہے جو رسول کریم ﷺ کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے (معارف القرآن:۴/۴۰۸)

حاصل کلام یہ ہے کہ ''في سبيل الله'' میں اس قدر عموم کرنا کہ مدارس یا مساجد کی تعمیر کرنے اور دیگر دینی ضروریات میں خرچ کرنے، چینل قائم کرنے کو داخل کرنا خلافِ اجماع ہے ''ولا يجوز أن يبني بالزّكاة المسجد وكذا القناطير والسّقايات وإصلاح الطرقات إلخ'' (۱)، اور تمام متقدمین مفسرین (جن میں صحابہ، تابعین اور بعد کے مفسرین شامل ہیں) کے خلاف ایک نئی راہ قائم کرنا، جس کی قطعاً اجازت نہیں۔

املاہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۳/۳۲ھ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ،

قرآن سے قطع نظر کر کے صرف حدیث کی بنیاد پر کسی مسئلہ کی تغلیط کرنا باعث گمراہی ہے

سوال: ﴿۶﴾ اگر ''ذاکر نائک'' غیر مقلد نہیں! وہ کہتے ہیں کہ چاروں اماموں نے کہا ہے کہ اگر تم کو میرا کوئی بھی فتویٰ سنت کے خلاف ملے تو اس کو رد کردو، پہلے حدیث کی کتابیں جمع نہیں کی گئی تھیں، اس لیے کسی نے یہ موازنہ نہیں کیا کہ کون سی حدیث زیادہ مضبوط ہے اور کون سی زیادہ کمزور، کیوں کہ انسان بلاشبہ قوی حدیث کی طرف جاتا ہے۔ یہی بات ذاکر نائک کہتے ہیں کہ:

= – إنّ الله تعالىٰ لم يرض بحكم نبي ولاغيره في الصّدقات حتّى حكم فيها هو فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقّك. (أبوداوٗد: رقم: ۱۶۳۰، باب من يُعطى من الصّدقة). فقط والله تعالىٰ اعلم

(۱) الفتاوىٰ الهندية، الباب السّابع في المصارف: ۱/۱۸۸.

(۱) میں اماموں کی بات قبول کرتا ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں اور شافعی اور حنفی کی اقتداء کرتا ہوں، مگر اپنے ساتھ کسی کا لیبل (جیسے حنفی، شافعی) نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ امام صاحب نے بذات خود کہا ہے کہ اگر تم میرا کوئی فتوی سنت کے خلاف پاؤ تو اس کو رد کر دو، اس لیے اگر فقہ حنفی میں کوئی حدیث ضعیف ہو، تو

(۲) کیا ہم شوافع کی قوی حدیث کی اقتدا کر سکتے ہیں؟

(۳) کیا ان کا (ذاکر نائک کا) کہنا غلط ہے؟ (۱۳۳۵/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) احادیث نبویہ کے ذخائر اور آیاتِ قرآنیہ کے مدلولات پر نظر رکھنے کے ساتھ، ان سے استخراجِ مسائل کے لیے کچھ اصول وقواعد مقرر کیے جاتے ہیں، جیسا کہ ائمہ اربعہ میں سے ہر امام نے اپنے اصول مقرر فرمائے ہیں، اور انہیں اصول کے تحت مسائل کا استخراج کیا ہے، پھر شرقاً وغرباً ان کے مسالک کو تلقی بالقبول حاصل ہوئی ہے، اب اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں ایک امام کی پیروی کرے اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے امام کی، اسے "تلفیق" کہتے ہیں جو باجماع امت حرام ہے، اگر موصوف (ڈاکٹر ذاکر نائک) غیر مقلد نہیں ہیں تو مذکورہ طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے " تلفیق" کی راہ پر گامزن ہیں، جو خود خطرناک راستہ ہونے کے ساتھ، باجماعِ امت حرام ہے، استنباط مسائل میں صرف حدیث کی صحت وضعف کو بنیاد نہیں بنایا جاتا؛ بل کہ دیگر بہت سی چیزوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، بطورِ مثال سمجھیے؛ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ" (مزمّل: ۲۰) اس آیت سے قرآن پاک کے کسی بھی جز کا نماز میں پڑھنا فرض ہوا، جس میں سورۂ فاتحہ کی تخصیص نہیں کی گئی، لیکن حدیث میں سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز پوری نہ ہونے کی بات فرمائی گئی ہے، تو اب ایسا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوگا، جس سے قرآن کا اطلاق بے اثر نہ ہو اور حدیث پر بھی عمل ہو جائے، لہٰذا مطلق قرأت قرآن تو فرض ہوگا اور سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب قرار دیا جائے گا جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کہتے ہیں، ورنہ قرآن پر عمل ترک ہو جائے گا، اسی طرح دوسرا حکمِ قرآنی ہے "وَاِذَا قُرِءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا" (الاعراف: ۲۰۴) جس میں قرأت قرآن کے وقت استماع وانصات (سننے اور خاموش رہنے) کا حکم ہے، لیکن اگر "**لاصلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب** "

الحدیث (أخرجه مسلم، باب وجوب قراءة الفاتحة: رقم :۳۹۴) کی بنا پر مقتدی کو بھی سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم کیا جائے تو "وَاِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَاَنْصِتُوْا" پر عمل نہ ہوسکے گا؛ لہٰذا حکم قرآنی کی بنا پر مقتدی کے ذمہ، جہری نماز میں استماع اور سری نماز میں انصات (خاموش رہنا) واجب ہوا، اور قرأتِ سورۂ فاتحہ، مقتدی کے ذمہ ضروری نہیں رہی؛ جیسا کہ امام اعظم ''ابوحنیفہؒ'' فرماتے ہیں، کیوں کہ ضروری ٹھہرانے کی صورت میں استماع وانصات (حکم قرآنی) پر عمل متروک ہوجائے گا، اس معنی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا "من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة"(۱) کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت کی طرف سے کافی ہوجائے گی، اب اگر کوئی ناواقف شخص کہے کہ "لا صلاة إلاّ بفاتحة الكتاب" والی روایت زیادہ قوی ہے ''من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة'' کی روایت کم قوی ہے؛ لہٰذا دوسری کو چھوڑ دیا جائے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک صحیح نہیں ہے کیوں کہ ان کا مستدل کمزور حدیث ہے، تو یہ اس شخص کی بہت بڑی غلطی اور استخراج مسائل کے اصول وضوابط سے ناواقفیت کی علامت ہوگی؛ کیوں کہ امام صاحب کا مستدل احادیث کے ساتھ ساتھ آیاتِ قرآنی اور کہیں آثارِ صحابہ بھی ہوتے ہیں۔

(۲) نہیں۔ حکم پہلے لکھ دیا گیا کہ ''تلفیق'' کہلائے گی جو کہ حرام ہے، تفصیل کے لیے ''الکلام المفید في إثبات التّقلید'' مؤلفہ مولانا سرفراز خاں صفدر، اور ''مطالعہ غیر مقلدیت'' مؤلفہ مولانا محمد امین صاحب صفدر، یا ''دین کی باتیں اور تقلید کی ضرورت'' مؤلفہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کا مطالعہ فرمائیں۔

(۳) (الف) کسی حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم کس آیت یا حدیث سے ثابت ہے؟

(ب) ایسا شخص جو براہِ راست قرآن وحدیث سے استنباط کرتا ہے اور اس کے لیے اس نے اصول وقواعد مقرر کر رکھے ہیں، مجتہد کہلاتا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف اگر اس زمرہ میں ہیں، تو ان کے استنباط اور ترجیح کے اصول موضوعہ ومقررہ کیا ہیں؟ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/۸/۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

---

(۱) أخرجه ابن ماجة، باب إذا قرأ الإمام فأَنْصِتُوا، رقم: ۸۵۰.

عقائد،تصوف،اور مختلف فرقے

روضۂ اقدس کا وہ حصہ جو جسد اطہر سے مس کیا ہوا ہے اس سے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے

السلام علیکم

سوال:﴿۷﴾ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ کیا دیوبندی عقائد کے مطابق روضۂ رسول (ﷺ) کا مقام، خانہ کعبہ سے بھی اونچا ہے؟ اور عرش سے بھی اونچا ہے؟ اور کرسی سے بھی؟ اگر ہے تو وضاحت کا طالب ہوں کہ دیوبند اس کو کس تناظر میں دیکھتا ہے کیا یہ عقیدہ اللہ کی حاکمیت سے اونچا نہیں؟ براہِ کرم اس پر روشنی ڈالیں تا کہ موقف واضح ہو۔

محمد صفدر کراچی (۱۶۸۴/د ۱۴۳۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

''روضۂ اطہر'' کا وہ حصہ جو آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے جسدِ اطہر سے مس کیا ہوا ہے وہ خانۂ کعبہ نیز عرش وکرسی سے افضل ہے، یہ کوئی ایسا عقیدہ نہیں ہے، جس پر ایمان وکفر کا مدار ہو، ہاں عقیدہ غیر قطعیہ کے طور پر (مذکورہ بالا عقیدہ) علمائے اہلِ سنت بہ شمولِ علمائے دیوبند کے نزدیک مسلم ہے۔(۱)، قاضی

---

(۱) إنّ البقعة الشّريفة والرّحبة المنيفة الّتي ضم أعضاءه ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ أفضل مطلقًا حتّى من الكعبة ومن العرش والكرسي كما صرح به فقهاؤنا رضي اللّٰه عنهم (المهنّد على المفنّد:۴۰، والمزيد من التّفصيل في إمدادالفتاوى:۶/۱۱۴،ط:إدارة تاليفات ديوبند)

عیاض نے اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے (۱)، دلائل، حکمت، مصلحت وغیرہ تفصیلات کے لیے "ردّالمحتار"، "الخصائص الکبریٰ" ملاحظہ فرمائیں، نیز "شرح الزّرقاني علی المواهب اللدّنية" میں بہت بسط سے اسے بیان کیا گیا ہے۔

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۲/۱۰/۲۷ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلندشہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

حیاۃ النبی ﷺ کا عقیدہ

سوال: ﴿۸﴾ براہِ کرم "حیات النبی" کی حقیقت اور اس کی تفصیلات کے سلسلے میں احادیث کے حوالے بتائیں؛ کیوں کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ اپنی قبر میں زندہ نہیں ہیں، میں حوالے اور تفصیلات چاہتا ہوں۔　محمد آفاق کناڈا　(۱۸۷۳/د ۱۴۳۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

مذکورہ بالا مسئلے میں محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام قبر میں زندہ ہیں اور اس پر بہت سے دلائل قائم ہیں۔ **أخرج الإمام أبو داؤد في أبواب الجمعة: عن أوس بن أوس قال: قال رسول اللّٰه ـ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ـ إن من أفضل أيامكم يوم الجمعة، فيه خلق آدم، إنّ اللّٰه عزّ وجلّ حرّم على الأرض أجساد الأنبياء (۲)(وفي شرحه بذل المجهود: ۱۶۰/۲ أبواب تفريع الجمعة) من أن تأكلها؛ فإن الأنبياء في قبورهم أحياء.** ابوداؤد شریف میں حضرت اوس بن اوس سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے

(۱) وقد نقل القاضي عياض وغيره الإجماع على تفضيله حتّى على الكعبة وإنّ الخلاف فيما عداه ونقل عن ابن عقيل الحنبلي أن تلك البقعة أفضل من العرش وقد وافقه السّادة البكريون على ذلك. (الدّر مع الرّد: ۵۳/۴ مطلب في تفضيل قبره المكرم)

(۲) أبو داؤد، أبواب تفريع الجمعة، رقم: ۱۰۴۷.

(ایک طویل حدیث کے ضمن میں) فرمایا: کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ،انبیاء کرام کے اجسام کو زمین پر حرام کردیا،اورابوداوٗد کی شرح ''بذل المجهود ''، میں حدیث مذکور کی تشریح میں لکھا ہے کہ اللہ نے زمین پر، انبیاء کرام کے اجسام کو کھانا حرام کردیا؛ اس لیے کہ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔اور''شرح الصّدور بشرح حال الموتیٰ: ۱/۱۸۶، ط:دار المعرفة لبنان'' میں ہے''أخرج أبويعلى والبيهقي وابن منده عن أنس رضي اللّٰه عنه، أنّ النّبي ــ صلّى اللّٰـه عليه وسلّم ــ قال:الأنبياء أحياء في قبورهم يصلون (۱). ترجمہ:شرح الصدور مؤلفہ علامہ سیوطی میں حضرت انس کی ایک روایت ابو یعلی بیہقی وغیرہ کے حوالے سے نقل کی گئی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں،نماز پڑھتے ہیں۔ وفي المهنّد على المفنّد للعلاّمة خليل أحمد السّهارنفوري: ۴۳، عندنا وعند مشائخنا حضرة الرّسالة ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ حي في قبره الشّريف، وحياته ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ دنيوية من غير تكليف وهي مختصة به ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم، وبجميع الأنبياء صلوات اللّٰـه عليهم، والشّهداء لا برزخية كما هي حاصلة لسّائر المسلمين؛ بل لجميع النّاس كما نص عليه العلاّمة السّيوطي في رسالته''إنباء الأذكياء بحياة الأنبياء''حيث قال: قال الشّيخ تقي الدّين السّبكي: حياة الأنبياء والشّهداء في القبر كحياتهم في الدّنيا ويشهد له صلاة موسىٰ عليه السّلام في قبره؛ فإنّ الصّلاة تستدعي جسدًا حيًا إلىٰ آخر ما قال: فثبت بهذا أن حياته دنيوية برزخية لكونها في عالم الأرواح إلخ . ترجمہ:حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے بلا مکلّف ہونے کے،اور یہ حیات مخصوص ہے آنحضرت ﷺ اور تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اور شہداء کے ساتھ، برزخی نہیں ہے جو حاصل ہے تمام مسلمانوں؛ بلکہ سب آدمیوں کو،چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ ''إنباء الأذكياء بحياة الأنبياء'' میں بتصریح لکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علامہ تقی الدین سبکی نے فرمایا ہے کہ انبیاء وشہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسی دنیا میں تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اس کی دلیل ہے؛ کیوں کہ نماز زندہ جسم کو

(۱) مسند أبي يعلى، رقم: ۳۴۲۵، مكتبة الثّقافة العربيّة.

چاہتی ہے الخ۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی ہے، اور اس معنی کر برزخی بھی ہے کہ عالم برزخ میں حاصل ہے۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۰/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

مصائبِ زمانہ یا کسی اور وجہ سے دلبرداشتہ ہوکر کلماتِ کفر بول دینے کا حکم

سوال: ﴿۹﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

السلام علیکم: بعدہ عرض ہے کہ احقر مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کا طالب علم ہے، فراغت کے بعد تخصّصات کے شعبوں میں ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ احقر نے بوجوہ چند کفریہ کلمات اپنی اس گندی زبان سے بک ڈالے ہیں، پہلی وجہ: احقر روزِ اول سے ہی گھر والوں سے پریشان ہے، بوجہ نا انصافی، دوسری وجہ: احقر روزِ اول سے ہی مسلسل بیماریوں کا شکار رہا ہے کہ جو غیر اختیاری تھیں، اسی کے ساتھ کچھ اختیاری امراض بھی ساتھ لگ گئے جو تا حال ہیں، تیسری وجہ: احقر مسلسل دسیوں سال سے آنکھ بھر کر نہیں سویا، شب میں ڈراؤنے خواب بیدار کر دیتے ہیں، اور احقر رو رو کے رات کاٹتا ہے، مذکورہ وجوہات میں سے پہلی وجہ سے تو احقر نے کوئی کفریہ کلمہ غالباً نہیں نکالا، البتہ دوسری اور تیسری وجہ کو سامنے رکھ کر احقر نے بعض اوقات کفریہ کلمات بکے ہیں، بعینہٖ الفاظ تو یاد نہیں رہے، لیکن جو مضمون ذہن میں تھا وہ اس طرح ہے کہ اللہ کو میرے سے دشمنی ہے (نعوذ باللہ)، میں اللہ کا انکار کرتا ہوں مگر محمد کا نہیں (العیاذ باللہ)، کچھ نہیں ہے سب بیکار ہے (العیاذ باللہ)، اس سے اچھا تو میں ہندو ہوتا (العیاذ باللہ) امثالہ واشباہہ، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ احقر نے نہ نماز چھوڑی، نہ قرآن وحدیث وغیرہ۔ احقر چوں کہ اسے طبعی جوش کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس لیے عقل نے ان الفاظ کو کبھی قبول نہ کیا، لیکن چوں کہ جس وقت یہ جملے کہے گئے عقل مغلوب ہو چکی تھی؛ لہٰذا یہ کفر عقلی بھی ہو گیا؛ کیوں کہ عقل نے روکا نہیں، اور یہ کیفیت مختلف سالوں میں مختلف ومتعدد بار پیش آچکی ہے، اب ان سطور کے لکھنے سے قبل بھی احقر متعدد مرتبہ توبہ کر چکا ہے اور جب بھی یہ واقعہ پیش آیا اس کے بعد توبہ کر لی، اگر چہ ان سطور کے لکھتے وقت اب تاریخیں یاد نہیں رہیں کہ کن کن تاریخوں میں کفریہ جملے یا مفضی الی الکفر جملے کہے اور کن کن تاریخوں میں توبہ کی..................اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) احقر کو اپنے ایمان میں شک ہے کہ ایمان ہے یا نہیں؟

(۲) اگر ایمان ہے تو جس وقت جملے کہے اس کے اور توبہ کے درمیان کا جو زمانہ ہے وہ کفر کا ہے یا ایمان کا؟

(۳) اور اگر ایمان نہیں ہے تو کیا احقر کے گذشتہ تمام اعمال ضائع ہو گئے ہیں؟

(۴) اور کیا کوئی بھی نیک عمل میرے پاس نہیں رہا ہے؟

(۵) اور کیا دوبارہ ایمان لانے سے جو نمازیں چھٹی ہوئی ہیں ان کی بھی قضا کرنی ہوگی **وغیرها من العبادات؟**

اخیر میں احقر عرض کرتا ہے کہ اگر مسئلے کی پوری حقیقت سمجھنی ہو تو یوں سمجھو کہ کوئی شخص زندگی سے عاجز آ کر، کفریہ جملے کہہ ڈالے مگر پھر فوراً عقلاً متنبہ ہوا اور توبہ کر لے، تو کیا حکم ہے؟ امید ہے کہ مسئلے کے تمام جزئیات کو سامنے رکھ کر کافی، شافی، وافی جواب عنایت فرمائیں گے۔ والسلام

محمد عبداللہ　(۲۸۱/د ۱۴۲۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

شیطان وساوس کے ذریعہ ہر صاحبِ ایمان کو پریشان کر کے اس کے ایمان کو غارت کرنا چاہتا ہے، یہی وساوس کبھی غالب آ کر مفضی الی العمل ہو جاتے ہیں، خواہ قول سے یا فعل سے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو بھی وساوس نے پریشان کیا، جس کا بیان انہوں نے ان الفاظ میں کیا: ”**إنّي أحدث في نفسي بالشّيء لأن أكون حُمَمَةٌ أحب إلي من أن أتكلم به، الحديث،** ترجمہ: کسی چیز کے بارے میں میرے دل میں ایسی بات آتی ہے کہ میں جل کر کوئلہ ہو جاؤں یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں وہ بات زبان پر لاؤں۔ (مشکوٰۃ: ۱۹/)

وفي حديث آخر: إنّا نجد في أنفسنا ما يتعاظم أحدنا أن يّتكلم به، قال: أو قد وجدتموه؟ قالوا: نعم! قال: ذاك صريح الإيمان، ترجمہ: ہمارے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں جس کا زبان پر لانا ہم بہت بڑی بات سمجھتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کیا تم واقعی ایسا اپنے اندر پاتے ہو، صحابہ کرام نے کہا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بات تو صاف ایمان کی دلیل ہے (مشکوٰۃ: ۱۸/)، اسی طرح وساوس اگر حدیث النفس کے طور پر ہیں تو وہ معاف ہیں؛ **لقوله**

عليه السلام: إن اللّٰه تجاوز عن أمتي ماوسوست به صدورها مالم تعمل به أو تتكلم ترجمہ: آنحضرت نے ارشادفرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو میری امت سے معاف فرمادیا جو وسوسے کے طور پر ان کے دلوں میں آتی ہیں، جب تک ان پرعمل نہ ہو یازبان سے نہ کہے(متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۸)، وساوس کا آنا خود ایمان کی دلیل ہے؛ **لأنّ اللص لا يدخل البيت الخالي. قال في الهندية: من خطربقلبه ما يوجب الكفر، إن تكلم به وهو كاره لذلك، فذلك محض الإيمان (۲/۲۸۳)**، ترجمہ: جس کے دل میں ایسےخیالات آئیں کہ ان کا زبان پرلانا کفر ہے، مگر یہ شخص ان برے خیالات کو ناپسند کرتا ہوتو یہ صاف ایمان کی علامت ہے، آپ نے جن کلمات کے زبان سے جاری ہونے کی بات لکھی ہے، اگرچہ ان میں سے بعض کلماتِ کفر ہیں؛ لیکن بعض دوسرے قرائن یعنی بطور وسوسہ زبان پر جاری ہونے یا قائل کے مغلوب العقل ہونے کی بناء پر کفر یا خارج عن الایمان ہوجانے کا حکم نہیں لگے گا، **كما في "الهندية"...... لم يكن الإرتداد، وكذا لوكان معتوهًا أوموسوساً أو مغلوبًا على عقله بوجه من الوجوه، فهو على هذا، كذا في السّراج الوهّاج (۲/۲۵۲)، وقال أيضًا: ماكان في كونه كفرًا اختلاف، فإن قائله يؤمر بتجديد النّكاح وبالتوبة والرجوع عن ذلك بطريق الاحتياط، وما كان خطأً من الألفاظ ولا يوجب الكفر، فقائله مؤمن على حاله، ولا يؤمر بتجديد النّكاح والرجوع عن ذلك. وقال أيضًا: إذا كان في المسئلة وجوه توجب الكفر، ووجه واحد يمنع، فعلى المفتى أن يميل، إلى ذلك الوجه............ ثمّ إن كان نية القائل الوجه الّذي يمنع التّكفير فهو مسلم** (الہندیۃ:۲/۲۸۳)۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں:

(۱) شک اور تردد کو دل سے نکال دیں، یہ وسوسۂ شیطانی ہے حسب فرمانِ نبوی **"ذاك صريح الايمان"**، نعمتِ ایمان پرشکر خداوندی بجالایئے۔

(۲) **ذاك صريح الإيمان.**

(۳) توبہ واستغفار کرتے ہوئے قبولیت اعمال کی دعا کرتے رہیے۔ **" اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ"** (سورۂ توبہ،آیت:۱۲۰)

(۴) ان شاء اللہ ایسا نہیں ہے۔

(۵) جو ادا کر چکے ہیں ان میں سے کسی کی قضا واجب نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ سے رجا (امید کرنا) واجب ہے، جب فوراً متنبہ ہو کر توبہ کر لی تو معتوہ اور مغلوب العقل پر سوائے توبہ واستغفار کے اور احتیاطاً تجدید ایمان کے اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدید نکاح کے اور کچھ واجب نہیں ہے، مومن کو اس طرح کی گھاٹیاں پیش آتی ہیں، اس سے حفاظت کے لیے یہ دعائیں پڑھیے "**أللّٰهُمّ إنّي أعوذ بك من أن أشرك بك شيئًا وأنا أعلم وأستغفرك ممّا لا أعلم**" نیز "**ألـلّٰهُمّ ثَبّتْ قلبي على دينك** اور **أللّٰهُمّ إنّي أسئَلُكَ إيْمَانًا لاَ يرتد**"

نوٹ: کسی متبع سنت بزرگ سے اصلاحی تعلق قائم کرنا ان ورطات ومہلکات سے خلاصی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

کتبہ: الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/۶/۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

کفر سے اسلام کی طرف عود کرنے کے بعد، کفر کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں

سوال: ﴿۱۰﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلے ذیل کے بارے میں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...

اس تحریر کا خاص مقصد یہ ہے کہ میں آپ سے کچھ مسائل دریافت کرنا چاہتی ہوں امید کرتی ہوں کہ جس طرح ہمارے نبی محمد عربی ﷺ نے ہمیں زندگی گزارنے کے تمام مسائل سے واقف کرادیا اسی طرح میں امید کرتی ہوں کہ ان شاء اللہ میرے اس مسئلے کا حل بھی مل جائے گا۔

میں ممبئی کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، گھر کا ماحول بفضلِ الٰہی دیندار ہے، یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب میں بارہویں پڑھتی تھی، "انجمن اسلام گرلز ہائی اسکول" میں ایک غیر مسلم لڑکے سے محبت ہونے کی وجہ سے اسی کے رسم ورواج کے مطابق میرا اس سے نکاح ہو گیا؛ لیکن ٹھیک ایک سال بعد میرا دل مجھ کو اندر ہی اندر ملامت کرنے لگا اور بہت کوششوں کے بعد میں دوبارہ

دینِ اسلام میں لوٹ آئی،عرصہ گزر گیا اور مجھے اللہ نے دولڑکیوں سے نواز دیا،دوبارہ مذہبِ اسلام میں آنے سے قبل میں اپنے شوہر کو اسلام کی برابر دعوت دیتی رہی اور میں ان کے مذہب کا کوئی کام نہیں کرتی تھی،انہیں پیارمحبت سے الگ الگ طریقوں سے سمجھاتی رہی؛لیکن جب مجھے اس بات کا یقین ہوچلا کہ وہ اسلام نہیں لائیں گے،تو میں اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ اسلام لے آئی،اس وقت کچھ لوگوں نے میری مدد کی اور کرائے پر کمرہ لے کر، دوسروں کے گھر میں کام کاج کرکے اپنے اخراجات کو پورا کرتی رہی اس طرح ایک سال کا عرصہ گزرگیا،اس کے بعد والدین کو خبر ہوئی وہ چوری چھپ کے مجھ سے ملنے آئے،معافی تلافی کا معاملہ ہوا اور ان کے دل صاف ہوگئے؛لیکن میرے بھائیوں کو یہ بات منظور نہیں تھی کہ میرے والدین مجھ کو دوبارہ اپنائیں،وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح تھے چونکہ ان کے دلوں کو چوٹ لگی تھی،والدین کے مشورے کے مطابق مجھ کو دینی مدرسے کے ہوسٹل میں رکھ دیا گیا،وہیں پر میری بچیاں تعلیم حاصل کرنے لگیں،اور میں بہ طور نگراں وہاں مقرر ہوگئی،اسی دوران والدصاحب مجھ سے بار بار نکاح کرنے کے لیے کہتے رہے اور میں برابر انکار کرتی رہی؛لیکن والدصاحب کی طبیعت ناساز رہنے لگی اور مجھ پر بد سے بدتر حالات آتے گئے،مال کی وجہ سے نہیں بلکہ بچیوں کے سرٹیفیکٹ اور دستاویزات کی وجہ سے؛ کیوں کہ یہ بات اب تک راز میں ہی تھی، میں نے کسی کو یہ باتیں بتلائیں نہیں تھیں، میرے پاس راشن کارڈ اور گھر نہ ہونے کی وجہ سے میری پریشانیاں بڑھتی گئیں۔

جن چندلوگوں کو سچائی کا پتہ تھا ان کے مشوروں کے مطابق میں نکاح کے لیے راضی ہوگئی اور جس سے نکاح کرنا تھا اس کو ساری سچائی بتلادی گئی اور بچیوں کے بارے میں بھی بتلا دیا گیا وہ دیندار تھے،''سعودیہ عربیہ'' میں رہتے تھے،آٹھ مرتبہ حج کرچکے تھے؛اس لیے میں نے کہا ٹھیک ہے،میری شادی کرادیں اور وہ بھی رضامند تھے اور ہمارا نکاح ہوگیا۔اب تقریباً دو مہینے بعد سے ہی انہوں نے مجھے پریشان کرنا شروع کردیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ تم اپنی بچیوں کو کہیں بھی چھوڑ آؤ؛ کیوں کہ کفر کی بو باس کبھی نہیں جاسکتی ہے، یہ بات میں نے والدین سے بتلائی تو انہوں نے کہا کہ تم اپنے فیصلے خود کرو ہم کچھ نہیں جانتے، میں نے اللہ کی رضامندی چاہی، میرے دل میں یہی بات آئی کہ یہ شخص ہمیں نہیں رکھے گا، اب اس شخص نے آہستہ آہستہ میری پچھلی زندگی کے بارے میں سبھی سے کہنا

شروع کر دیا، اس وقت میں بچیوں کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر ایک انگلش اسکول میں ٹیچر تھی، وہاں میری سہیلیوں سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس شخص کی تین شادیاں ہوچکی ہیں اور یہ آدمی کسی بھی عورت کی عیب جوئی کرتا رہتا ہے، خیر دوسرے شوہر سے بھی ہماری طلاق ہوگئی تقریباً دس مہینے کے اندر؛ لیکن اس شخص کی ایک بات نے میرے دل، ضمیر اور آنے والی زندگی میں اس قدر بھونچال کر دیا ہے کہ اب مجھے لگتا ہے کہ خودکشی ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے؛ لیکن اب تک میں اپنے آپ کو سنبھالے ہوے ہوں، برائے مہربانی آپ میرے سوالوں کے جواب تحریر کر دیجیے۔

(۱) میں جانتی ہوں شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے؛ لیکن یہ بات مجھے دوبارہ اسلام میں آنے کے بعد جب میں مدرسے میں رہی تب پتہ چلی ہے، میں اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے توبہ کرتی ہوں اور ہر ذلت ورسوائی کو اپنی سزا مانتی ہوں تو کیا اللہ تعالیٰ مجھے معاف نہیں فرمائے گا؟

(۲) میری بچیاں جو پانچ سال کی عمر میں دائرہ اسلام میں داخل ہوگئیں تھیں، تو کیا اب تک ان سے کفر کی بو باس نہیں گئی؟

(۳) میں اس وقت ان بچیوں کو اپنے ہمراہ اس لیے لائی تھی کہ کل قیامت میں یہ میرا دامن پکڑیں گی اور میں کیا جواب دوں گی، اگر میں نے یہ غلط کیا ہے تو اب یہ بچیاں وہاں بالکل بھی جانے کو تیار نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمیں مار ڈالو؛ لیکن وہاں مت بھیجو، میں کیا کروں؟

(۴) کیا میں نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں بتا کر غلط کیا اور مجھے یہ راز میں ہی رکھنا چاہیے تھا؟

(۵) میری پچھلی زندگی میرے لیے ایک سیاہ دھبہ ہے آج بہت سے لوگ جو عوام ہیں وہ بھی مجھ سے بدظن ہیں اور اس کا سیدھا اثر میری بچیوں پر پڑتا ہے ان حالات میں میں کیا کروں؟

بچیاں بڑی ہورہی ہیں ٹھیک چار سالوں میں ان کے نکاح کا مسئلہ آجائے گا، ان حالات میں میں اکیلی کیا کروں گی؟ اور ان کا نکاح کس کے گھر کروں گی؟ اگر مدرسے میں نکاح ہوجائے تو داماد مدرسے میں کیسے نکاح کر سکتے ہیں؟ مدرسوں کے بھی کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں، آگے کی زندگی ہم اب کیسے گزاریں؟

ان سب پریشانیوں کو دیکھتے ہوے میں سمجھ گئی ہوں کہ ہمارے لیے کوئی نہ کوئی سزا ضرور ہوگی؛ جیسے ہماری اب اس دنیا میں رہنے کی ضرورت نہیں، اگر ہمارے لیے کوئی سزا ہے؛ جیسے قتل کردیا جائے، یا قید کردیا جائے تو برائے مہربانی یہ سزا ہمیں کہاں ملے گی؟ اور کہاں جانا ہوگا؟ تفصیل سے لکھیں ہم وہاں پر انشاء اللہ ضرور جائیں گے۔

نوٹ: عورت ناقص العقل ہوتی ہے اگر اس تحریر میں کوئی غلطی ہو تو تہہِ دل سے معاف فرمائیں۔

العارض: گناہوں سے لبریز بندی خدا حافظ (۱۸۱۷/د ۱۴۳۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق:

آپ کی وہ حالت اور زندگی کے وہ ایام بہت ہی خراب اور لائقِ نفرت تھے، جب آپ دائرہ اسلام سے العیاذ باللہ نکل کر ارتداد کی طرف چلی گئی تھیں، ارتداد اختیار کرنا؛ یعنی دین سے پھر جانا ایسا سنگین جرم ہے کہ دنیا ہی میں اس کی سزا دائمی قید مقرر کی گئی ہے، اگر اسلامی حکومت ہو اور کسی عورت کا ارتداد ثابت ہو جائے تو ہمیشہ کے لیے اسے قید کیے جانے کا حکم ہے(۱)، وہ ایام جو ایسی حالت میں گذرے آپ کی زندگی کے بدترین ایام تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی رحمت سے جب دوبارہ اسلام کی طرف آنے کی سعادت ملی اور سچے دل سے آپ نے اسلام کو اپنا کر پیش آنے والی مشکلات کا سامنا کرتے ہوے، اسلام کے سایہ میں عافیت کی زندگی گذارنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور اپنے پچھلے کرتوت پر دل سے نادم وشرمندہ ہو کر تائب ہو گئیں تو یقیناً آپ کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے اور آپ کا اسلام وایمان عنداللہ معتبر ومقبول ہو گیا، حضرت عمرو بن العاصؓ جب اسلام لانے کے لیے حاضر ہوے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ حضرت ''عمرو بن العاص'' نے کہا یہ کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے (سابقہ گناہ معاف فرمادے) آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو! کیا تمہیں معلوم نہیں

(۱) كل مسلم ارتد فإنه يقتل إن لم يتب إلا جماعةً: المرأة إلخ: ۳۸۸/۶، ردّالمحتار، مطلب: توبة اليأس مقبولة وفيه أيضًا: بخلاف المرتدّة فإنّها تجبر على الإسلام بالضّرب والحبس ولاتقتل: ۳۹۱/۶۔

کہ اسلام لانے سے پچھلے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں(۱)۔ قرآن پاک میں ہے: بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہے ان پر اللہ کی رحمت کے فرشتے (موت کے وقت) آکر تسلی دیتے ہیں کہ کسی قسم کا خوف محسوس نہ کرو اور (دنیا کی نعمتوں کے چھوٹنے پر) کوئی غم نہ کرو، اور جنت (اور اس کی لامتناہی نعمتوں کے ملنے) کی خوشخبری حاصل کرو۔(حٰم السجدۃ: ۳۰)

آپ کی تسکین واطمینان کے لیے قرآن کی ایک آیت اور رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد نقل کردیا گیا، آپ ہر طرح ایمان پر جمنے، اسلام کے احکام واعمال پر عمل کرنے کی کوشش کریں، اور اپنے عزم کی پختگی سے مشکلات وپریشانیوں کو برداشت کرنے میں صبر کا دامن نہ چھوڑیں، اللہ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے: ''اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا'' (الانشراح: ۵)۔ بے شک ہر تنگی اور مشکل کے بعد آسانی اور وسعت ہے۔ ''وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا. وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ'' (الطلاق: ۲-۳) جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مضرتوں سے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہونچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، البتہ آزمائش اور صبر کی گھڑیاں کبھی طویل بھی ہوسکتی ہیں؛ اس لیے دل مضبوط کرکے گناہوں سے اجتناب اور احکامِ الٰہیہ کی پابندی کو اپنا شعار بنالیں، اللہ کا وعدہ ہے: ''اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر: ۱۰) کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب ان کا پورا پورا بدلہ (انعام) عطا فرمائیں گے۔

(۱-۲) ان دونوں باتوں کا جواب اوپر ذکر کی گئی تفصیلات سے معلوم ہوگیا، آپ کی بچیوں کا بھی حکم یہی ہے کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کفر کی بوباس ختم ہوگئی، اسلامی نہج پر ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کردیں، بچیوں کا کوئی اسلامی مدرسہ ہو اس میں داخل کریں، بچیوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش کرنے پر جو ذمہ داری اور پریشانی آپ پر پڑے گی اور آپ اسے پورا کریں گی، اس پر بھی بے انتہا اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دو بچیوں کی پرورش کی، ان کی تعلیم وتربیت کا اچھا بندوبست کیا، وہ جنت میں میرے اتنے قریب ہوگا؛ جیسے دو انگلیاں آپس میں قریب ہوتی ہیں درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔(۲)

---

(۱) مسلم: رقم: ۱۲۳، باب كون الإسلام يهدم ما قبله.

(۲) من عال جاريتين حتّى تبلغا جاء يوم القيامة أنا وهو، وضمّ أصابعه، مسلم: رقم: ۲۶۳۴، باب فضل الإحسان إلى البنات.

(۳) آپ بچیوں کو اپنے ساتھ رکھیں، کافر باپ کے حوالہ کرنا آپ کے لیے جائز نہیں۔

(۴) جو کچھ ہو چکا اسے سوچنے اور خواہ مخواہ کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آئندہ بلا ضرورت اس کا چرچا کرنے کی حاجت نہیں؛ البتہ کہیں اپنے اسلام وکفر کا حال بتانا شرعاً ضروری ہو وہاں بقدرِ ضرورت بتلاسکتی ہیں، صحابہ کرام بھی اپنے دورِ جاہلیت اور زمانہ کفر کے بعض واقعات کا کبھی کبھار تذکرہ کرتے تھے۔

(۵) جس دھبہ کو اللہ تعالیٰ نے معاف کرنے اور دھودینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ اب دھبہ کہاں رہا؟ لہٰذا اس سے اب صرف نظر کرلیں، حدیث میں ہے: **التّائب من الذّنب كمن لاذنب له** (۱)، گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا پاک صاف ہوجاتا ہے؛ جیسے معصوم بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ شکستہ دلوں کے قریب ہوتے ہیں آپ شکستہ دلی اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کریں گی ان شاء اللہ وہ بچیوں کے حق میں بھی ضرور قبول ہوں گی، اور غیب سے کوئی بندوبست ان کی شادی بیاہ کا ہوجائے گا، اللہ پر بھروسہ رکھیں، اسی کو اپنا کارساز سمجھیں، وہی شکستہ دلوں کا سہارا، پریشان حال انسانوں کا مددگار، اسباب ووسائل سے خالی اور نہتے لوگوں کا کارساز وغم گسار ہے۔ ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ'' کا ورد رکھیں، آپ نے اخیر میں جو لکھا کہ میں سمجھ گئی کہ میرے لیے کوئی نہ کوئی سزا ہے یہ آپ کا قصورِ فہم ہے جس کی اصلاح جواب میں مذکور باتوں کو سمجھ کر پڑھنے سے ہوجائے گی انشاء اللہ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/۱۱/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ

جس کو اسلام کا علم ہی نہیں، اس کو آخرت میں سزا کیوں کر ہوگی؟

السلام علیکم!

سوال: ﴿۱۱﴾ میرا ایک غیر مسلم دوست ہے جو اسلام قبول ہی کرنے والا ہے، لیکن کچھ سوالات

(۱) ابن ماجة، رقم: ۴۲۵، باب ذكر التّوبة.

اسے پریشان کررہے ہیں :(۱) سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کیسے کریں گے، جنہیں اسلام کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہے؛ مثال کے طور پر اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں، جنہیں اسلام کا علم ہی نہیں ہے، تو انہیں مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے سزا کیوں دی جائے گی؟

(۲) نیز ان لوگوں کا کیا ہوگا جو غلامی، قحبہ گری وغیرہ جیسے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو سزا دینا کیسے جائز ہوگا؟

(۳) سوال کا آخری جزء یہ ہے کہ ایسے اچھے خاندانوں کے سلسلے میں کیا حکم ہوگا جو غیر مسلم ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں؟

المختصر اس کا کہنا ہے کہ کیوں غیر مسلمین کو اسلام کا پیغام پانے کے لیے مسلمانوں پر انحصار کرنا چاہیے؟ یہ تو درست نہیں ہے کہ انہیں کسی مسلمان سے مدد لینا ضروری ہو، ان لوگوں کا کیا ہوگا جو مسلمان دوست نہیں رکھتے؟ مجھے معلوم ہے کہ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں اپنے ایمان ویقین کے متعلق علم ہونا چاہیے؛ لیکن انھیں ان کے سوالوں کا بہت زیادہ اطمینان بخش جواب چاہیے۔ قرآن کے حوالے سے جواب عنایت فرمائیں۔ واضح رہے کہ وہ لوگ بھی یہی سوال کرتے ہیں جو ملحد یا خدا بیزار ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔　　مصطفیٰ آسٹریلیا　(۱۴۸/د ۱۴۲۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) تمام کائنات کو پیدا کرنے والی ذات اللہ جلّ مجدہ ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور عقل کی دولت سے اس کو نوازا، مفید اور مضر چیزوں میں تمیز کرنے کا ملکہ عطا کیا، جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: ''اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی'' (سورۃ الاعلیٰ:۲) یعنی وہ ذات جس نے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو ٹھیک بنایا، جس نے جانداروں کے لیے ان کے مناسب چیزوں کو تجویز کیا، پھر ان جانداروں کو ان چیزوں کی طرف راہ بتلائی؛ یعنی ان کی طبیعتوں میں ان چیزوں کا تقاضہ پیدا کیا۔ نیز انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ'' (سورۃ البلد:۱۰)، ''ترجمہ: کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور ہونٹ نہیں دیے پھر اس کو دونوں راستے خیر وشر کے بتلا دیے''، کائنات میں نظر رکھنے کے لیے

آنکھیں، نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے لیے عقل؛ اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جن کی وجہ سے انسان اچھائیوں کے اختیار کرنے اور برائیوں سے اجتناب کرنے کا مکلّف ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر دور میں انبیاء کرام کو مبعوث فرماتے رہے ہیں، تاکہ انسان ان کے بتلائے ہوئے راستے پر چلے اور ہدایت یاب ہو، انبیاء کرام کو ان کی بات کی صداقت کے لیے، بطور دلیل وحجت معجزات عطا کیے گئے، تاکہ کسی کو مجالِ انکار نہ رہے، جس شخص نے نبی کا دور نہیں پایا، لیکن نبی کی خبر اس کو پہنچی تو نبی کے لائے ہوئے پیغام کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اگر اسلام اور نبی کے بارے میں اس کو کوئی خبر ہی نہیں ملی یا ایسی جگہ میں ہے جہاں اسلام اور نبی کا کوئی تعارف موجود نہیں، تو وہاں اسے اپنی عقلِ خداداد سے اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے اور اس کے خالق ہونے کا یقین کرنا ضروری ہے ؛ کیوں کہ کائنات کا سراپا وجود اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی خالق ہے اور پورے نظامِ کائنات کا ایک تسلسل میں جڑا ہونا اور کسی خلل ونزاع کا اس میں راہ نہ پانا، اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ ذات تنِ تنہا خالقِ کائنات ہے، اس میں کوئی اس کا شریک نہیں " لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا " (سورۃ الانبیاء:/۲۲)، زمین میں یا آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو دونوں درہم برہم ہوجاتے۔ اس تفصیل سے بطورِ نتیجہ یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین کرنا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، ہر انسان پر عقلی طور پر واجب ہے، پس انسان نے اگر اس عقلِ خداداد کے فیصلہ کے خلاف، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا یا اس کو خالق نہ مانا، تو بہت بڑا ظلم کیا، اپنے خالق ومالک کے ساتھ ظلم کیا، ربِ کائنات کے ساتھ ظلم کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (سورۃ لقمان:/۱۳)، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے، اور "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ" (نساء:/۱۱۶)، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے، اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہیں گے معاف فرمادیں گے۔ جب انسان نے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا انکار کردیا یا اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ عتابِ خداوندی کا مورد بن گیا۔

اور اگر کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھا، اس کے ساتھ شرک نہیں کیا، مگر مذہبِ اسلام کے بارے میں وہ نہ جان سکا اور احکامِ خداوندی اسے معلوم نہ ہوسکے، تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

اس کو معاف کردیں،مگر یہ اس جگہ کی بات ہے، جہاں اسلام اور اس کے پیغام کا کسی نے نام تک نہ سنا ہو؛لیکن دنیا میں ایسا خطہ شاید ہی کوئی ہو جہاں اسلام کے نام سے بھی لوگ ناواقف ہوں،لہٰذا اگر کسی نے صرف اسلام کا نام سنا ہے مگر تفصیلات سے ناواقف ہے،اس کے ذمہ مذہب اور عقیدہ کے لحاظ سے اسلام کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے،جس میں کوتاہی کی وجہ سے وہ عنداللہ جواب دہ ہوگا۔

(۲) انسان کا اپنا اختیار کردہ ماحول اور سوسائٹی اسے کہاں سے کہاں پہنچادیتی ہے؛اس لیے اچھا ماحول اختیار کرنا انسان کی ذمہ داری ہے،اگر گندے اور فحش ماحول میں پیدا ہونے اور رہنے والا شخص،اپنے ضمیر اور عقل کی آواز پر کان لگاتا اور اپنے ماحول کو بہتر بنانے یا بہتر ماحول کے اختیار کرنے کی فکر کرتا تو رفتہ رفتہ وہ ایسے ماحول میں پہنچ جاتا، جہاں حق کا تلاش کرنا اور مقصد تخلیق کو سمجھنا اس کے لیے آسان ہوجاتا،اس شخص نے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی،اس کا جواب دہ اسے ہونا ہے،اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:''اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى'' (البقرۃ:/۱۶)،''ترجمہ:انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو اختیار کرلیا''۔

چنانچہ یہ شخص اپنی عقل کے تقاضہ،ضمیر کی آواز اور فطرت سلیمہ کی راہنمائی سے ہدایت کا راستہ حاصل کرسکتا تھا،مگر اس نے اپنی عقل کا رخ بدل دیا،ضمیر کی آواز کو دبا دیا اور فطرت سلیمہ کو بیکار کردیا، جس کے نتیجہ میں وہ گمراہی کا اختیار کرنے والا اور اس کے خمیازے کو بھگتنے والا بنا۔

(۳) رہی ان کی بات جو اچھے خاندان کے لوگ ہیں، اگر انہوں نے اسلام کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو اپنے ایمان کے سلسلہ میں آخرت میں ان کو بھی جواب دہ ہونا ہوگا؛البتہ جو اچھے کام مثلاً: خدمت خلق،غرباء، ومساکین کی امداد، والدین اور اعزاء کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ انہوں نے کیے،ان کے نیک اور اچھے کاموں کا بدلہ اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں انہیں دے دیتے ہیں؛ کیوں کہ آخرت میں اچھے اعمال کا اچھا بدلہ ملنے کے لیے ایمان شرط ہے۔

اللہ تعالیٰ کا پیغام حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ بشکل اسلام دنیا میں آیا،اس پر ایمان لانے اور اس کو ماننے والے مسلمان کہلاتے ہیں۔یہ کسی برادری یا قوم کا نام نہیں، یا کسی خاص ملک کے رہنے والے یا کسی خاص زبان کے بولنے والے کو مسلمان نہیں کہا جاتا؛ بلکہ دنیا کا ہر شخص خواہ کسی ملک کا رہنے والا، یا کسی زبان کا بولنے والا ہو،اسلام کا نمایندہ بن سکتا ہے۔اسلام کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ

نے قرآن پاک نازل فرمایا اور اس کو سمجھانے کے لیے حضرت محمد ﷺ کو بھیجا؛ لہٰذا اسلام کو سمجھنے کے لیے قرآن کا مطالعہ اور حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ آیتِ کریمہ: ''اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا'' میں بتلایا گیا کہ آنحضرت ﷺ کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے اور دوسری آیت: ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ'' میں بتلایا گیا کہ دین اللہ کے نزدیک، صرف اسلام ہی معتبر ہے اور تیسری آیت: ''وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ'' میں بتلایا گیا ہے کہ جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اختیار کرے گا، تو وہ اللہ کے نزدیک معتبر ومقبول نہیں ہوگا۔

امید ہے کہ ان باتوں سے آپ اور آپ کے دوست کو تسلی ہو جائے گی، نیک کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے اور جس نیکی کا سراغ لگ جائے، دوسروں تک اس کے پہنچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ فقط

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/ ۵/ ۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

کیا یہود ونصاری کو مومنین میں شمار کرنا صحیح ہے؟

کیا فرماتے ہیں اہلِ اسلام علماء ومفتیانِ کرام دریں مسئلہ کہ:

سوال: ﴿۱۲﴾ ڈاکٹر محمد .... صاحب نے اپنے ادارہ.................... میں کرسمس ڈے کی تقریب کا انعقاد کیا، جس میں انہوں نے کرسمس کا کیک کاٹا، پھر سامعین کو خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار فرمایا:

''پوری دنیا میں جب تقسیم کی جاتی ہے، تو بلیورز (Believers) اور نان بلیورز (Non Believers) کی تقسیم کی جاتی ہے۔ ''نان بلیورز'' کو کفار کہتے ہیں علمی اصطلاح میں، اور ''بلیورز'' ان کو کہتے جو اللہ کی بھیجی ہوئی وحی پر، آسمانی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں، مذہب ان کا کوئی بھی ہو، تو جب بلیورز اور نان بلیورز کی تقسیم ہوتی ہے تو یہودی عقیدے کے ماننے والے لوگ اور مسیحی برادری اور مسلمان، یہ تین مذاہب ''بلیورز'' میں شمار ہوتے ہیں، یہ کفار میں شمار نہیں ہوتے''۔

پھر انہوں نے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''آپ اپنے گھر میں آئے ہیں، قطعًا کسی دوسری جگہ

پے نہیں،آپ کی عبادت کا وقت ہوجائے تو ابھی مسلمان عبادت مسجد میں کریں گے،اگر آپ کی عبادت کا وقت ہوجائے تو یہ مسجد کسی ایک وقت کے ایونٹ (event) کے لیے نہیں کھولی تھی ، ابدالآباد تک آپ کے لیے کھلی ہے''۔

نیز وہ ہر سال با قاعدہ طور پر اپنے ادارے میں،اس پروگرام کو اہتمام سے مناتے ہیں۔چنانچہ سوال وجواب کی ایک نشست میں کہتے ہیں:

"We celebrate the chrirtsmas day every year"

(۱) آپ واضح فرمائیں کہ جو شخص موجودہ دور کے عیسائیوں اور یہودیوں کو ان کے نظریات سے مطلع ہوتے ہوئے بھی مومن کہے اور انہیں Belivers میں شمار کرے،اس کے متعلق شریعتِ اسلامیہ کا کیا حکم ہے؟ اور ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ موقف اور اسے اسلام کے مطابق ظاہر کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ علاوہ ازیں ڈاکٹر...صاحب نے حضرت سیدنا''ابوبکر صدیق اکبرؓ'' کو محض سیاسی وظاہری خلیفہ قرار دیا ہے اور باطنی وروحانی خلیفہ حضرت''سیدنا علی المرتضیٰؓ '' کو بتایا ہے۔ اس کی بالتفصیل وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''سیاسی وراثت کے فردِ اوّل،حضرت ابوبکر صدیقؓ ہوئے،روحانی وراثت کے فردِ اول حضرت علی المرتضیٰؓ ہوئے...............خلافتِ ظاہری،دین اسلام کا سیاسی منصب ہے،خلافتِ باطنی خالصتاً روحانی منصب ہے،خلافتِ ظاہری انتخابی وشورائی امر ہے،خلافتِ باطنی محض وہبی واجتبائی امر ہے،خلیفۂ ظاہری کا تقرر عوام کے چناؤ سے عمل میں آتا ہے،خلیفۂ باطنی کا تقرر،خدا کے چناؤ سے عمل میں آتا ہے.....خلافت میں جمہوریت مطلوب تھی؛ اس لیے حضور ﷺ نے اس کا اعلان نہیں فرمایا،ولایت میں ماموریت مقصود تھی اس لیے حضور ﷺ نے وادی غدیرخم کے مقام پر اس کا اعلان فرما دیا، حضور ﷺ نے امت کے لیے خلیفہ کا انتخاب عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا،مگر ولی کا انتخاب اللہ کی مرضی سے خود فرمایا......خلافت افراد کو عادل بناتی ہے،ولایت افراد کو کامل بناتی ہے،خلافت کا دائرہ فرش تک ہے،ولایت کا دائرہ عرش تک ہے''(السّیف الحلبی علی منکرِ ولایتِ علی ص:۸-۹)

(۲) اس پر بھی قرآن وسنت اور ائمہ کی تصریحات کے مطابق حکم بیان فرمائیں!

(۳) ان عبارات کا سرگودھا کے شیخ الحدیث،حضرت مولانا مفتی محمد فضل رسول سیالوی صاحب

(جو تقریباً ۵۰؍ سال سے افتاء وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں) نے قرآن وسنت اور اقوالِ ائمہ کی روشنی میں محاسبہ کیا اور ''قرآن کی فریاد'' کے نام سے ایک فتویٰ مرتب فرمایا، اس میں انہوں نے ڈاکٹر...... صاحب کو یہودیوں اور عیسائیوں کو بی لیور (مومن) کہنے کے بدلے کافر قرار دے دیا؛ آیا مفتی صاحب کا اس مسئلہ میں ڈاکٹر...... پر حکم کفر لگانا حق وصواب ہے یا نہیں؟ دونوں میں سے جو درست صورت ہو، اسے مؤید ومبرہن فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ **أللّٰهمَّ أرني الحقّ حقًّا وارزقْني اتباعه، أللّٰهُمّ أرني الباطل باطلاً وارزقني اجتنابه.** فقط واللہ تعالیٰ اعلم

امداد اللہ مشتاق مئوی (۱۲۲۷/ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق: حامداومصلیاومسلما:

(۱) ''ایمان'' ایک شرعی اصطلاح ہے، جس کے معنی آخری نبی حضور ﷺ کی لائی ہوئی تمام باتوں جیسے: وحدانیت، سابقہ تمام ادیان کی منسوخی، محمد بن عبد اللہ ﷺ کا آخری نبی ہونا وغیرہ کو؛ مکمل طور پر دل سے مان لینا ہے **الإیمان: التّصدیق للرّسول فیما علم مجیئه به ضرورةً فتفصیلاً فیما علم تفصیلاً وإجمالاً فیما علم إجمالًا** (۱)، نیز قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اہلِ ایمان اور یہود ونصاری کو الگ الگ جماعت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، **اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا الآية (الحج: ۱۷)** ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اور یہود اور صابئین اور نصاری اور مجوس اور مشرکین، اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان قیامت کے روز (عملی) فیصلہ کرے گا، اور قرآن کریم میں ہے **''وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ''** (سورہ نساء: ۸۵)؛ یعنی حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین (اللہ کے نزدیک) قابلِ قبول نہیں، یعنی تمام ادیان کو دینِ اسلام نے منسوخ کر دیا۔

الغرض مذکورہ بالا تعریف، قرآنی تعبیر، آیت قرآنیہ، نیز دیگر بے شمار دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت محمد بن عبد اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد ''مومنین'' وہی لوگ ہیں جو آخری نبی محمد ﷺ کی شریعت کو دل سے مانتے ہیں، لہٰذا یہود ونصاری کو ''مومنین'' کی فہرست میں شامل کرنا خطرناک

(۱) كتاب المواقف: ۳/ ۵۲۷، ط: دار الجيل، بيروت.

تلبیس اور مداہنت فی الدین ہے، اگر واقعۃً اس کا اعتقاد بھی ہو تو اندیشۂ کفر ہے۔

(۲) یہ کہنا کہ ''سیاسی وراثت کے فردِ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوے اور روحانی وراثت کے فردِ اول حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوے بالکل غلط ہے؛ بلکہ حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ جس طرح حضور ﷺ کے سیاسی وارث تھے، اسی طرح آپ (ابوبکرؓ) آنحضرت ﷺ کے روحانی وارث بھی تھے، پھر یکے بعد دیگرے چاروں خلفاء تک خلافتِ ظاہرہ جس طرح منتقل ہوئی، خلافتِ باطنہ بھی منتقل ہوئی (۱)، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس کی صراحت کی ہے (ملاحظہ ہو: منہاج السنۃ اور ازالۃ الخفاء وغیرہ)، اس لیے اس طرح کی تقسیم گمراہی اور راہِ حق سے انحراف کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف کے شیعی پروپگنڈے سے متاثر ہونے کی علامت ہے۔

(۳) حضرت مولانا مفتی فضل رسول صاحب سیالوی کا فتویٰ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے؛ اس لیے اس کے بارے میں کچھ لکھنے سے معذور ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلندشہری، وقار علی غفرلہ

اضافہ از حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ العالی

الحمدللہ! جواب صحیح ہے، قرآن کریم میں سورۃ البینۃ میں دوجگہ یہود ونصاریٰ پر کفروا کا اطلاق آیا ہے، پہلی ہی آیت میں ہے: لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ الآية: جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے (آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے) کافر تھے وہ (اپنے کفر سے) جدا ہونے والے نہیں تھے جب تک ان کے پاس واضح دلیل نہ آئے، یعنی اللہ کا عظیم رسول (محمد ﷺ) جو (ان کو) پاک صحیفے (قرآن) پڑھ کر سنائے، جس میں قیمتی مضامین ہوں

(۱) راجع منهاج السّنّة النّبوية للعلّامة ابن تيمية، الفصل الخامس من كلام الرّافضي أنّ من تقدَّمَ عليًا لم يكن إمامًا والرّدّ عليه.

حضرت مولانا عبدالرحیمؒ والد ماجد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ یوں رقم طراز ہیں: ''حضرت امام مقتدیٰ خواجہ'' محمد پارسا'' قدس سرہ نے رسالہ ''قدسیہ'' میں لکھا ہے کہ: اہل تحقیق برآنند کہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ بعد از حضرت رسالت پناہ ﷺ ازاں خلفاء کہ بر امیر المومنین مقدم بودہ اند ہم نسبت باطن تربیت یافتہ اند، یعنی اہل تحقیق کے نزدیک حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے آنحضرت ﷺ کے بعد ان خلفاء سے جو آپ سے پہلے خلیفہ ہوئے، نسبت باطنی کی تربیت پائی ہے۔ (معارف صوفیہ: / ۵۳۸ بحوالہ ارشاد رحیمیہ: / ۷)

(پس جو قرآن و رسول پر ایمان لائیں گے وہی بلیورز ہوں گے، اور جو ایمان نہیں لائیں گے وہ بدستوران بلیورز رہیں گے)۔

پھرآیت۶ میں ہے:اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ الآیة: بےشک جولوگ اہل کتاب اورمشرکین میں سے منکر ہوئے وہ دوزخ کی آگ میں جائیں گے، جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہی لوگ بدترین خلائق ہیں (پس جو یہود ونصاری نبی ﷺ پر ایمان نہیں لائے وہ بلیورز کیسے ہوسکتے ہیں؟)

حررہ:سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

زندوں کو بھی ثواب پہنچایا جا سکتا ہے؟

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں امید کہ عنایت فرمائیں۔

سوال: ﴿۱۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ایسے شخص کے بارے میں جو کہ قرآن مجید پڑھ کر، یا پھر کسی اور خیر کے کام میں حصہ لے کر، اس کا ثواب اپنے زندہ والدین کو پہونچانا چاہتا ہے، حضرت مفتی صاحب سے درخواست ہے کہ مکمل جواب مع حوالہ جات، خصوصًا قرآن وحدیث سے اس کا جواب عنایت فرمائیں، امید کہ حضرت اس درخواست کو قبول فرمائیں گے۔ والسلام (۱۱۶۷/د۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق: حامداومصلیا ومسلما،امابعد:

قرآن مجید پڑھ کر یا دیگر کسی کارِ خیر میں حصہ لے کر، مردوں کی طرح زندوں کو بھی ایصالِ ثواب کرنا درست ہے، کتاب وسنت ونیز فقہاء کی عبارات میں اس کا ثبوت ہے، قرآن شریف میں ہے: ''وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (سورۃ محمد:الآیۃ:۱۹/)، وفي سورة الحشر: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ الخ (الآیۃ:۱۰) یہ دعا معاصرین کو بھی عام ہے (بیان القرآن:۲/۱۲۵)، وفي سورة نوح: رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (الآیۃ:/۲۸)،وفی سورة الإسراء: وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا (الآیۃ:/۲۴)،ان آیات میں دعا اور استغفار کے ذریعہ تمام مومنین کو

ثواب پہونچانے کا ذکر ہے، جس میں زندہ اور مرحومین سب داخل ہیں، نیز ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی طرف سے بھی ایک مینڈھے کی قربانی کی "إنّ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم – إذا أراد أن يضحي كبشين عظيمين سمينين أقرئين أملحين موجوئين فذبح أحدهما عن أمّته لمن شهد اللّٰه بالتّوحيد وشهد له بالبلاغ، وذبح الآخر عن محمّد وعن آل محمّد – صلّى اللّٰه عليه وسلّم" (ابن ماجة رقم الحديث: ۳۱۲۲، باب أضاحي رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم) حدیث بالا سے ظاہر ہے کہ اس قربانی میں اس وقت موجود، گذشتہ اور آئندہ آنے والی ساری امت داخل ہے، اسی طرح جنازہ میں ماثورہ دعا: أللّٰهمّ اغفر لحيّنا وميّتنا إلخ (۱)، (ہمارے زندوں کو بھی بخش دے) سے بھی زندوں کے لیے ایصال ثواب کی تائید ہوتی ہے۔

البحر الرائق میں ہے: فإنّ من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة. كذا في البدائع، وبهذا علم أنّه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيًا. (۳/۱۰۶-۱۰۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير).

مذکورہ بالا نصوص سے معلوم ہوا کہ زندوں کو بھی ایصالِ ثواب کرنا درست ہے خواہ قرآن مجید پڑھ کر یا دیگر کسی کارِ خیر میں شرکت کر کے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/ ۷/ ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

تواضع، تکبر اور عزتِ نفس کی حقیقت اور باہمی فرق

السلام علیکم

سوال: ﴿۱۴﴾ اسلام کا عزت نفس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز اسلام میں (۱) نفس (۲) عزتِ نفس (۳) احترام اور (۴) عزت سے کیا مراد ہے؟ مجھے اس کے بارے میں کچھ مواد فراہم

(۱) أخرجه أبو داوٗد باب الدّعاء للميّت، رقم: ۳۲۰۱.

کریں۔ والسلام (۲۳۵۲/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) نفس انسان کے اندر ایک قوت ہے، جس سے کسی چیز کی وہ خواہش کرتا ہے خواہ خواہش خیر ہو یا شر ہو، اگر اکثر شر کی خواہش کرے اور نادم بھی نہ ہو، اس وقت وہ "**نفس أمّارة**" کہلاتا ہے، اور اگر نادم بھی ہونے لگے تو "**نفس لوّامة**" کہلاتا ہے، اور اگر اکثر خواہش خیر کی کرے اس وقت "**مطمئنّة**" کہلاتا ہے۔

نفس کے یہ تین درجات ہیں، مشائخِ طریقت کی صحبت میں رہ کر آدمی ریاضت اور مجاہدہ کر کے "**نفس أمّارہ**" سے ترقی کر کے "**نفس مطمئنّة**" تک پہنچتا ہے۔

نفس کے اندر کچھ اخلاقِ رذیلہ ہوتے ہیں، جن کی اصلاح اور تزکیہ کر کے اخلاقِ حمیدہ اور فاضلہ پیدا کیے جاتے ہیں، جن اخلاق حمیدہ کا نفس میں پیدا کرنا مطلوب و مستحسن ہے ان میں اعلیٰ درجہ کا خلق، تواضع ہے۔

"تواضع" کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو حقیقت میں کمتر سمجھے، اپنے کسی کمال وخوبی پر گھمنڈ نہ کرے، نہ اترائے، نہ شیخی بگھارے، محض انعام الٰہی سمجھ کر اس کا شکر بجالائے۔

اخلاق رذیلہ مذمومہ جن سے نفس کا تزکیہ کرنا ضروری ہے ان میں بدترین رذیلہ "تکبر" ہے؛ جس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کمالِ دنیوی یا دینی میں اپنے آپ کو بہ اختیارِ خود دوسرے سے اس طرح بڑا سمجھنا کہ دوسرے کو حقیر سمجھے یہ حرام اور معصیت ہے۔ تواضع اور تکبر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۲) عزت نفس: ان دونوں (تواضع وتکبر) کے درمیان کی چیز ہے کہ تواضع کی راہ اختیار کرنے میں ایسا کوئی طریقہ نہ اختیار کرے، جس سے اپنی ذات کی تذلیل و بے غیرتی، یا ذلت ورسوائی ظاہر ہو مثلاً: کسی ضرورت مند کے لیے دوسرے سے کوئی چیز مانگنا فی نفسہٖ جائز ہے، اور مانگ لینے میں اظہار کمتری ہے جو بظاہر تواضع ہے؛ لیکن نفس کو تذلیل سے بچانے کے خیال سے اظہارِ سوال سے گریز کرنا، عزتِ نفس ہے کہ اپنے نفس کو سوال کی ذلت سے اوپر اٹھالینا اور ہاتھ پھیلانے کی رسوائی سے بالا رکھنا، عزت نفس کے تقاضہ سے ہے، جس میں بظاہر کبر کی بو ہے مگر درحقیقت کبر نہیں ہے؛ بلکہ وصف محمود ہے، پس عزت نفس کو ملحوظ رکھنا اپنے موقعہ پر مستحسن چیز ہے۔

(۳) احترام: کسی کی بڑائی اور عظمت کا احساس کرنا، اس کا مقابل اہانت ہے۔

(۴) عزت کے معنی ہیں بزرگی، بڑائی، آبرو، شان، عظمت (فیروز اللغات) بربنائے انسانیت کسی کا احترام اور اس کی عزت کرنا، بزرگوں، والدین، اساتذہ وعلماء کی تعظیم اور عزت کرنا؛ یعنی ان کے ساتھ اہانت آمیز یا بے ادبی پر مبنی کوئی سلوک کرنے سے احتراز کرنا، اسلامی تعلیمات میں شامل ہے، اسی طرح اپنے نفس (ذات) کی عزت اور احترام کرنے کا حکم ہے یعنی تکبر سے احتراز کرتے ہوئے تواضع کا طریقہ اختیار کرے؛ لیکن ایسا طریقہ نہیں جس سے نفس یعنی آپ کی ذات کو ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے، یہی عزت نفس (خودداری) ہے، کسی مومن کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرنا، جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۹/۱۲/۲۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

قلب اور روح کے ذاکر ہونے کا مطلب

السلام علیکم

سوال: ﴿۱۵﴾ ہمارے جامعہ اشرفیہ کے شیخ نے ہم کو کہا ''جب آپ ایک ہزار مرتبہ کلمہ پڑھتے ہیں تو اس کو دل ایک مرتبہ پڑھتا ہے اور جب دل اس کو ایک ہزار مرتبہ پڑھتا ہے تو روح اس کو ایک مرتبہ پڑھتی ہے'' جیسا کہ میں شیخ پر اعتماد کرتا ہوں اس لیے میں حوالہ نہیں جاننا چاہتا ہوں، لیکن میرے دوست جنہوں نے اس کو سنا وہ لوگ حوالہ مانگ رہے تھے اب میرے تین سوال ہیں:

(۱) کیا اس بات کا کوئی حوالہ موجود ہے؟

(۲) جب ہم کسی شیخ سے ملاقات کررہے ہوں اور بغیر حوالہ کے کوئی نئی چیز سن رہے ہوں تو کیا ہم کو ہر وقت حوالہ تلاش کرنا چاہیے؟

(۳) اگر ہم کو اعتماد کرنا چاہیے اور ہر وقت حوالہ کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے تو ایسا کیوں؟ والسلام

طارق محمود کوپا گنجی متعلم دارالعلوم دیوبند (۱۱۶۹/ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب باللہ التوفیق:

(۱) کسی واسطے سے شیخ ہی سے حوالہ معلوم کرلیتے تو زیادہ طمانینت کا موجب بنتا............ یہ قرآن وحدیث کی کوئی منصوص بات نہیں ہے نہ ہی کوئی فقہی مسئلہ ہے، میرے خیال میں اپنی فراست یا حذاقت سے شیخ نے یہ بات فرما کر آپ کو ذکر کے وقت توجہ تام الی جانب القلب رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے؛ کیوں کہ غفلت، غیر اللہ کی طرف توجہ، اور علائق دنیویہ سے تلبس کے کثرت کی بنا پر، انسان زبان سے ذاکر ہوبھی جائے تو بھی قلب میں ذکر کا رسوخ آسانی سے نہیں پیدا ہوتا؛ اس لیے کہ جب انسان یکسوئی کے ساتھ ذکر باللسان کرتا رہتا ہے، تو علائقِ دنیویہ اس کے قلب سے منقطع ہوتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ قلب کو توجہ تام مذکور حقیقی ذات الٰہی کی طرف حاصل ہوجاتی ہے، اس وقت قلب ذاکر بنتا ہے، اسی طرح روح جو اس سے بھی اعلیٰ اور الطف ہے اسے توجہ تام مذکور حقیقی کی طرف قلب کے بہ کثرت ذاکر ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اسی کو شیخ نے سالکِ خاص کے احوال کے مطابق ایک ہزار کی تعداد سے مقید کرکے ظاہر کیا، ورنہ مذکور حقیقی ذات باری تعالیٰ کی طرف توجہ تام علی اختلاف احوال السالکین اس سے کم مقدار میں بھی حاصل ہوسکتی ہے، اور بعض کو اس پر حاصل نہ ہو تو یہ بھی بعید نہیں، اور جنہیں رسوخ فی ذکر اللہ حاصل ہوچکا انہیں ادنی توجہ سے ذکر قلبی کی توفیق مل جاتی ہے، ایسے کاملین کے لیے مذکور فی السوال عدد کہاں شرط ہوا! ہوسکتا ہے کہ مشائخِ طریقت نے اپنے تجربات کی روشنی میں سالکین کے اکثری احوال کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بات فرمائی ہو اور انہیں میں سے کسی کا یہ مقولہ ہو۔

(۲-۳) اپنے شیخ کی باتوں پر اعتماد وطمانینت کے ساتھ یقین کرنا چاہیے، جو اشکال ہو خود شیخ سے ہی اس کا حل دریافت کرنا چاہیے خواہ تحریری طور پر ہی ہو، اس سے راہ سلوک جلد طے ہوگا، ورنہ کبھی اس طرح کے اشکالات مانع بن کر سد راہ ہوجاتے ہیں، پھر فیض پہنچنا بند ہوجاتا اور تعلق بے فائدہ ہوجاتا ہے۔ باقی جو امر صراحۃً حکم شریعت کے خلاف معلوم ہو اور اس کی تحقیق شیخ سے کرنا دشوار ہو تو دوسری جگہ سے تحقیق کرسکتے ہیں، مگر شیخ جو کہ متبع سنت اور پابند شریعت ہو اس کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لینا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　یکم رجب ۳۲/ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام

روحانیت کی حقیقت

کیا روحانیت مذہب سے بالاتر کوئی چیز ہے؟

السلام علیکم

سوال: ﴿۱۶﴾ان لوگوں کو کیسے سمجھایا جائے، جومحسوس کرتے ہیں کہ روحانیت مذہب سے بالاتر ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر مذہب میں عالمی صداقت اور عالمگیر محبت کے بنیادی اصول کی تعلیم موجود ہے؛ اس لیے صرف اسلام کو ماننا ضروری نہیں،صوفیوں، کریا یوگی کرنے والوں اور دوسرے مشہور ہندوستانی غیر مسلم سنتوں کو اپنا پیشوا اور روحانی رہنما مانو؟ براہ کرم راہ نمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ والسلام

عرب متحدہ امارات (۵۳۹/د ۱۴۲۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اللہ تعالیٰ تمام کائنات کے تنہا خالق، مالک، رازق ہیں، وہی یکتا ذات رب کائنات ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور دوسری تمام مخلوقات سے جدا انسان کے لیے رب کائنات کی مرضی اور احکام کے مطابق زندگی گذارنے کو اس کی تخلیق کا مقصد قرار دیا؛ جیسا کہ ارشاد باری: ”**اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً**“ (سورہ ملک:۲) ترجمہ: ”جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے“، نیز ”**وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ**“ (الذاریات:۵۶) ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں“ سے ظاہر ہے۔

انسان کے ساتھ حوائج بشریہ بھی ہیں، جنہیں پورا کرنے کی ذمہ داری ہے اور رب کائنات کی مرضی کے مطابق زندگی گذار کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرنا بھی اس کے ذمے ہے، اور ان

دونوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ربّ کائنات نے عقل وشعور سے نواز کر، اسے ارادہ واختیار سے عمل کرنے کی قوت بخشی، انسان کی عقل وشعور اور ارادہ واختیار کی قوت، دوسرے حیوانات کے عقل وشعور اور ارادہ واختیار سے بعض لحاظ سے ممتاز اور جدا ہونے کے ساتھ ایک بڑا فرق یہ رکھتی ہے کہ؛ دوسرے حیوانات سے صرف افعال صادر ہوتے ہیں مثلاً: کھانا پینا، لڑنا، بھڑنا، لیکن ان افعال سے کوئی نور یا ظلمت کی کیفیت ان کے اندر پیدا نہیں ہوتی، جب کہ انسان سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں تو افعال یا ان کے متعلقات کی وجہ سے، اس کے قلب میں ظلمت ونور کا اثر بھی پیدا ہوتا ہے اور ہر عمل کا اثر اچھے برے ہونے کے اعتبار سے ظلمت ونور کی شکل میں نفس انسانی کے اندر سرایت کرتا جاتا ہے، اچھے عمل کرنے اور برے عمل کو چھوڑنے اور ان کے لیے کیے جانے والی ریاضتیں اور مجاہدات کی وجہ سے نور کی کیفیت اس کے اندر راسخ ہوتی جاتی ہے، یہ کیفیت نورانیہ اگر اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والی ہے تو وہ حقیقی اور واقعی روحانیت ہے، ورنہ یہ کیفیت صرف وقتی چمک اور شیطانی چکمہ ہے، حقیقی روحانیت نہیں ہے؛ کیوں کہ ربّ کائنات کی مرضی کے مطابق اعمال صالحہ کرنے یا برے اعمال کے ترک میں، مجاہدہ وریاضت کرنے سے جو نورانیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام روحانیت ہے، رب کائنات سے قریب کرنے والی اس روحانیت کو پیش کرنے، بتلانے اور عمل کرکے سکھلانے کے لیے رب کائنات ہر دور میں رسول اور نبی کو مبعوث فرماتے رہے ہیں؛ جو روحانیت کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے، اور ان کا لایا ہوا طریقہ روحانیت کا صحیح ترین طریقہ ہوتا تھا؛ لیکن انبیائے سابقین کی پوری تعلیمات اور ان کا مستند اسوہ حیات محفوظ نہیں رہا تو رب کائنات نے ان کے مذاہب کو منسوخ کرکے اس کام کے لیے سب سے اخیر میں محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو اور نقش قدم روحانیت کا زینہ ہے۔ ارشاد باری ہے: **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (الاحزاب:۲۱) ترجمہ: ''تم لوگوں کے لیے (ایسے شخص کے لیے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو) رسول اللہ ﷺ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا''، اور آپ ﷺ کو دی ہوئی شریعت (مذہب) ہی اصلی روحانیت کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ رب کائنات نے اعلان کردیا: ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ'' (آل عمران:۱۹) ترجمہ: ''بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے'' اور ''وَمَنْ يَّبْتَغِ

غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِیْ الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ‘‘(آل عمران:۸۵)

ترجمہ:’’اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول نہ ہوگا اور آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا‘‘۔

کوئی غیر مسلم خواہ کریا یوگی ہو یا سنت مہنت، جب اپنی مرضی سے کسی عمل کو یا انسانی ذہن کے اختراعی اعمال کو، سبب روحانیت سمجھ کر اختیار کرتا ہے اور مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ اس کو پختہ کرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ ریاضی عمل سے اس کے قلب میں صفائی پیدا ہو جائے اور وہ چمک محسوس کرے، مگر چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوے اعمال کے ذریعہ نہیں ہے؛ اس لیے حقیقی روحانیت اس سے حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ مجاہدہ اور ریاضت قربِ خداوندی کا ذریعہ بن سکتا ہے، یہ سراب کو آب سمجھنے کا دھوکہ ہے ـــــــــــ یہ کہنا کہ روحانیت مذہب سے بالاتر ہے، انسان کے خود ساختہ مذہب اور اختراعی طریقہ کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ روحانیت اس خود ساختہ مذہب سے بالاتر ہے؛ کیوں کہ روحانیت رضائے الٰہی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوے طریقہ سے حاصل کرنے کا نام ہے، لیکن جو شریعت (مذہب) رب کائنات نے نازل کی ہے اور انسانوں کے اختیار کرنے کے لیے جس نمونہ کو پسند کر کے اس نے خود بھیجا ہے، اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ روحانیت اس شریعت (مذہب) سے بالاتر ہے، یہ صریح دھوکہ ہوگا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت (مذہب) کی پیروی تو عین روحانیت ہے ـــــــــــ نیز یہ دعویٰ کرنا بھی غلط ہے کہ ہر مذہب میں عالمی صداقت اور محبت کے بنیادی اصول کی تعلیم موجود ہے؛ کیوں کہ زندگی میں پیش آنے والے گوناگوں جزئیات میں صداقت کی چند ادھوری باتیں، اگر کسی خود ساختہ مذہب میں پائی بھی جاتی ہوں، مگر وہ بھی کسی نہ کسی آسمانی مذہب کا بچا کچا حصہ ہیں؛ لیکن انسان کی پوری زندگی اور اس کے حیات وممات کو محیط طریقہ عمل، جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق واضح غیر مبہم تفصیلات، نیز عبادات، اخلاقیات، حقوق العباد کے ہر ہر پہلو کی مفصل صاف صاف تعلیمات موجود ہوں، کارخانہ عالم کے قیام کا منشا اور انسانی زندگی کا مقصد واضح اور صریح طور پر بیان کیا گیا ہو، تمام شعبہائے زندگی میں غلط وصحیح رخ کی ’’معروف ومنکر‘‘ کے عنوان سے دوٹوک نشاندہی کی گئی ہو۔ اسی

طرح قیامت کیا ہے؟اس کا تعلق انسانی زندگی سے کس قسم کا ہے؟ قیامت کا یقین انسانی زندگی پر صلاح وفساد کے اعتبار سے کس درجہ اثر انداز ہے؟ زندگی کے اعمال کا نتیجہ قیامت میں جنت وجہنم کے یقینی تصور کے ساتھ کس طرح ظاہر ہوگا؟ ان سب باتوں کو عقلی دلائل اور نقلی پختگی کے ساتھ مضبوط طریقہ سے آشکارا کیا گیا ہو، یہ ساری تفصیلات زندگی کے پورے دستورِ حیات کی شکل میں صرف دین اسلام میں موجود ہیں۔ رب کائنات نے اس ابدی مذہب کی تعلیمات واصول خود بیان فرمائے ہیں، اور چھوٹی بڑی ہر تعلیم پر یقین اور عمل کو ذریعہ نجات اور قرب ورضا کا باعث قرار دیا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کو اس کا داعی پیغمبر اور نمونہ بنایا ہے، آپ ﷺ کے طریقہ اور سنت کے مطابق جو زندگی ہوگی وہ روحانیت والی زندگی ہوگی، جس میں ترک لذات کا بے سود مجاہدہ نہیں ہے؛ بلکہ لذات کو شریعت الٰہیہ کے تابع کرنے کا مجاہدہ ہے، بقول صحابی رسول اللہ ﷺ: ”احتسب نومتي ما أحتسب في قومتي“، یعنی جس طرح میں اپنی نماز کو قرب الٰہی اور ثواب کا ذریعہ سمجھتا ہوں، اسی طرح اپنی نیند (سونے) کو جو سنت کے مطابق رضائے الٰہی کے لیے ہو، قرب وثواب کا ذریعہ سمجھتا ہوں (۱)، لہٰذا دین اسلام پر عمل ہی روحانیت حاصل کرنے کا طریقہ ہے، اور شریعت اسلامیہ عین روحانیت ہے، ”روحانیت“ شریعت اسلامیہ سے جدا کوئی چیز نہیں ہے اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل کی جاسکتی ہے؛ جیسے آم کی مٹھاس آم سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

اس سے واضح ہوگیا کہ اختراعی ریاضت ومجاہدہ کرنے یا اپنی مرضی سے خلافِ شریعت ترک لذات کرکے، روحانیت حاصل ہونے کا دعویٰ کرنا نرا دھوکہ ہے ”ایں خیال است ومحال است

(۱) عن أبي موسیٰ قال لمعاذ: كيف تقرأ؟ قال: سأنبئك بذلك أما أنا فأنام، ثم أقوم فاقرأ واحتسب نومتي ما أحتسب في قومتي (أخرجه الخمسة إلاّ الترمذي) یعنی حضرت ابوموسیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت معاذؓ سے (جبکہ زمانہ حکومت یمن میں دونوں ملے تھے) فرمایا کہ تم کس کیفیت سے (شب کو نماز میں) قرآن پڑھتے ہو؟ انہوں نے فرمایا کہ میں تو سوتا ہوں پھر اٹھتا ہوں پھر (نماز میں) قرآن پڑھتا ہوں (ساری رات بیدار نہیں رہتا) اور میں اپنے سونے میں ویسا ہی ثواب سمجھتا ہوں جیسا اپنی شب بیداری میں سمجھتا ہوں، روایت کیا اس کو بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی نے (التکشف عن مہمات التصوف:۳۵۱)

وجنوں''۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵ شعبان ۱۴۲۸/ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

اہل سنت والجماعۃ کی تعریف اور اس کا مصداق

سوال: ﴿۱۷﴾ اب دنیا میں کون سی جماعت اہلِ سنت والجماعت ہے؟ (۱۷۰۴/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کو سمجھنے سے پہلے اہل سنت والجماعت کی حقیقت سمجھیے، اہل سنت والجماعت دو باتوں پر مشتمل ہے (۱) اتباع سنت، (۲) اجماع امت، ان دونوں باتوں کو ماننے والے اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں۔

پہلی بات اتباع سنت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ خلفاء راشدین کی سنت کو بھی شامل کرنا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک دنیا میں رہے، صحابہ کرام کا عمل وفعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء پر ہوتا، دین کی باتوں میں صحابۂ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ پوچھ کر عمل پیرا ہوتے، لیکن بعد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنی سنت کی اتباع کے ساتھ خلفاء راشدین کی سنت کی اتباع کرنے اور اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی تلقین فرماتے۔ **كما ورد في الحديث: عليكم بسنّتي وسنّة الخلفاء الرّاشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنّواجذ** (۱)، اس حدیث میں ''بھا'' کی جگہ ''بھما'' نہیں فرمایا گیا، یعنی مفرد کی ضمیر لائی گئی اور قاعدہ یہ ہے کہ ضمیر، قریب مرجع کی طرف لوٹتی ہے، لہٰذا ''ھا'' کا مرجع ''سنۃ الخلفاء'' ہوا، اور اس تاکید کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو تو ہر مسلمان بہ سروچشم قبول کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، مگر خلفاء کی سنت کو ماننے میں متردد یا منکر ہوسکتا ہے؛ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ میری سنت کے ساتھ میرے خلفاء کی سنت کو بھی لازم پکڑو۔

دوسری بات اجماع امت ہے، جس کے تعلق سے ارشاد باری ہے: ''**وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَ تْ**

---

(۱) مشكاة المصابيح: /۳۰، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة.

مَصِيْرًا (سورہ نساء:۱۱۵)،اور جو شخص رسول مقبول ﷺ کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہولیا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے، کرنے دیں گے اور (آخرت) میں اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔ یہ آیت حجیتِ اجماع کی سب سے بڑی دلیل ہے (۱) پس اہل سنت والجماعت کا مجموعہ دو باتیں ہوئیں: پہلی بات اتباعِ سنت بہ شمول سنت خلفاء، دوسری اجماع امت؛ لہٰذا اہلِ سنت والجماعت میں سے ہونے کے لیے اتباعِ سنت اور اجماعِ امت کو ماننا ضروری ہوا۔

آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمالینے کے بعد امت میں افتراق وانتشار پیدا ہوا اور بہت سے فرقے وجود میں آئے ،بعض نے تو ضروریاتِ دین ہی کا انکار کردیا،سو یہ لوگ کافر و مرتد ہوگئے (۲) مگر اکثریت ضروریاتِ دین کو تسلیم کرتے ہوے اس پر قائم رہی، پھر ایک عرصہ کے بعد ان اہل قبلہ میں بعض نے ان مسائل میں اختلاف کیا جو قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت تھے، مثلاً: سوال قبر، پل صراط پر گزرنا، قیامت کے دن دیدارِ الٰہی، قیامت کے دن اعمال کا تولا جانا، کرامت اولیاء کا حق ہونا وغیرہ، اور یہ جماعت ان باتوں کو عقل پر پرکھنے کی کوشش میں لگ گئی ،نصوص میں تاویل یا انکار کی راہ اختیار کرنے لگی، جس کی بنا پر جادۂ حق سے منحرف ہوگئی ــــــ ان کے بالمقابل بڑی اکثریت نے نصوص کی پیروی میں ’’مـا أنا عليه وأصحابي‘‘ کے مطابق صحابہ کرام اور سلف صالحین کا طریقہ اپنایا اور اپنے لیے ’’اہل سنت والجماعت‘‘ کا لقب اختیار کیا، جس کا طرۂ امتیاز ،اجماع امت کو

(۱) روي أن الشافعيؒ : سئل عن آية في كتاب الله تعالیٰ تدلّ على أن الإجماع حجة، فقرأ القرآن ثلٰث مأة مرة حتى وجد هذه الآية، وتقرير الاستدلال أن اتباع غير سبيل المومنين حرام فوجب أن يكون اتباع سبيل المومنين واجباً (مفاتيح الغيب للرّازي : ۱۱/۳۵، سورة النساء، ط: دارالكتب العلمية بيروت)، واستدل الإمام الشافعيؒ على حجية الإجماع بهذه الآية (روح المعاني)، والآية تدل على حرمة مخالفة الإجماع (بيضاوي : ۱/۲۳۷ سورة نساء: آيت:۱۱۵، ط :دار الكتب العلمية بيروت).

(۲) عن أبي هريرةؓ قال: لما توفّي النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم واستخلف أبوبكر بعده وكفر من كفر من العرب (البخاري،رقم الحديث: ۷۲۸۴، باب الاقتداء بسنن رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم).

ماننا اور اتباع سنت پر گامزن رہنا ہے۔ یہی گروہ افراط وتفریط سے پاک اور صراطِ مستقیم پر رواں دواں ہے۔ علامہ ''ابنِ تیمیہ'' لکھتے ہیں: **فإن السّنة تتضمّن النّص، والجماعة تتضمّن الإجماع، فأهل السّنة والجماعة هم المتّبعون للنّصّ والإجماع** (منہاج السنۃ: ۲۷۲/۳، ط: مصر) لہٰذا جو لوگ ضروریاتِ دین کو ماننے کے ساتھ اجماع امت اور اتباع سنت بہ شمول سنت خلفاء کے پیروکار ہوں گے، ان کا شمار اہل سنت والجماعت میں ہوگا۔

اززین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۱/۱۱/۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

مفتیانِ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

اضافہ از حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ العالی

الحمدللہ! جواب بالکل صحیح ہے، اور اب اہل السنۃ والجماعۃ ائمہ اربعہ کے متبعین میں منحصر ہیں، علامہ احمد بن محمد طحطاوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۳۱ھ) جو مشہور حنفی فقیہ ہیں، اور علامہ شامی رحمہ اللہ کے استاذ ہیں، الدر المختار کے حاشیہ میں کتاب الذبائح میں تحریر فرماتے ہیں: **فعليكم معاشرَ المؤمنين باتباع الفرقة الناجية المسماة بأهل السنة والجماعة .... وهذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم في مذاهب أربعة، وهم الحنفيون، والمالكيون، والشافعيون، والحنبليون رحمهم الله، ومن كان خارجاً من هذه الأربعة في هذا الزمان فهو من أهل البدعة والنار.** (۱۵۳/۴) ترجمہ: پس اے جماعت مؤمنین! تم پر لازم ہے فرقۂ ناجیہ کی پیروی کرنا، جو اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتا ہے..........اور یہ جماعتِ ناجیہ اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں اکٹھا ہوگئی ہے، اور وہ مذاہب اربعہ: احناف، مالکیہ، شوافع، اور حنابلہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر مہربانی فرمائیں! ــــــــــ اور جو شخص اس زمانہ میں ان چار مذاہب سے باہر ہے: وہ گمراہ لوگوں میں سے اور دوزخیوں میں سے ہے۔

اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے مأۃ دروس کے سبق: ۹۵ میں لکھا ہے: **الدرس الخامس والتّسعون في المذاهب المُنْتَحِلِةِ إلى الإسلام في زماننا: أهل الحق منهم: أهل السّنّة والجماعة، المنحصرون بإجماع من يعتدُّ بهم في الحنفية، والشّافعية، والمالكية، والحنابلة**: ترجمہ: سبق: ۹۵ ہمارے زمانہ کے ان مذاہب کے بارے میں جو اسلام

کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں: اہل حق ان میں سے اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، جو منحصر ہیں باجماع ان حضرات کے جن کا اعتبار کیا جاتا ہے: حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ میں۔

کتبہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

اکابر دیوبند کے مسلک ومشرب کی وضاحت

محترم المقام حضرت العلام مفتی صاحب دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۱۸﴾......(الف) علماء کرام بریلی کے فتوے کا اقتباس درج ہے: ''اکابر علماء دیوبند کے کفر وارتداد پر یقینی طور پر مطلع ہونے کے بعد اگر ان کو ''کافر'' و ''مرتد'' نہیں مانتے اور انہیں ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھتے ہیں، تو وہ بھی انہیں میں سے ہیں، ان کی کتابیں پڑھنا، ان سے ربط ضبط قائم رکھنا، اور شادی، ولیمہ یا کسی قسم کی دعوت میں شریک ہونا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا قطعاً جائز نہیں، حرام ہے، ان کے پیچھے سرے سے نماز باطل ہے، اگر انہیں مسلمان جان کر نماز پڑھی تو خود بھی ایمان سے خارج ہو جائے گا'' انتہی۔

آج کل کے نو جوان طبقہ میں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا فتنہ فساد ہوئے بغیر سمجھاتے ہوئے، مذکورہ بالا عبارت کا ایک مدلل جواب تیار کیجئے اور ذیل کے پتہ پر بھجوایئے، ہم لوگ نہایت عمدگی کے ساتھ ان پوائنٹس کو ملحوظ رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ طلبہ اور نوجوانوں کے ذہن کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش کریں گے۔ کیا غضب ہے سمجھ میں نہیں آرہا ہے جب اکابر علماء نظامیہ خود حضرت فضیلت جنگ بانی جامعہ نظامیہ کے بعد پہلے امیر جامعہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے کو مقرر کیا گیا تو کیا کوئی کلام کی گنجائش ہے؟

اسلامیہ ہائی اسکول ورنگل نزد پاپا پیٹھ چمن شیر پورہ ورنگل۔ اے۔ پی۔ (۴۶۲/د ۱۴۲۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اکابر علمائے دیوبند مثلاً: امام العصر مولانا محمد قاسم نانوتوی، محدث وقت فقیہ النفس مولانا رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ وقدس اللہ اسرارہم، علمِ

حدیث، تفسیر، فقہ، وغیرہ، علوم شرعیہ میں مہارت کاملہ رکھنے کے ساتھ علمی تبحر میں منفردانہ شان کے مالک تھے، تقویٰ، طہارت، تدین، خدا ترسی، خشیت وللّٰہیت، محبت الٰہی اور عشقِ رسول اکرم ﷺ میں ایسے نمایاں اور ممتاز تھے کہ ان کے فیوض کی شعاعیں مثل آفتاب پورے عالم میں پھیل رہی ہیں، جو ان حضرات اکابر کی کتابوں اور ان کی خدمات، نیز ان کے تیار کردہ افراد کی زندگیوں سے بالکل آشکارا ہے ''عیاں را چہ بیاں''

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمہ آفتاب را چہ گناہ(۱)

ان کی زندگیوں کا ایک ایک لمحہ محبت الٰہی اور عشق رسول اللہ ﷺ سے معمور ہے، ان کی زندگیاں سنت رسول ﷺ اور نقش قدم نبوی ﷺ کا عکس جمیل ہیں، ان حضرات اکابرین دیوبند کی حیات طیبہ کا ہر گوشہ، عشق رسول اللہ ﷺ میں فنائیت پر شہادت دیتا ہے۔

یہ حضرات اکابر علماء دیوبند دنیا میں عشقِ رسول ﷺ سے سرشار محبتِ الٰہی میں فنائیت کی زندگیاں گذار کر اپنے اعمال حسنہ، حسن نیت اور اخلاص وتقویٰ کا ثواب وصلہ رب کائنات جل مجدہ سے پانے کے لیے اس دنیا سے چلے گئے، ان پاکباز نفوس قدسیہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں۔ **رحمهم الله رحمةً واسعةً ـــــ ورحم الله عبدا، قال: آمين .**

ان اکابر علماء دیوبند سے بالواسطہ اور بلا واسطہ خوشہ چینی کرنے والے اور ان کے علوم وعرفان کے بحر زخار سے فیض یافتہ، پورے عالم میں پھیلے ہوے ہیں اور علوم نبوت کی اشاعت، احیائے سنت، نیز اماتئے بدعت وضلالت کے ساتھ تبلیغ ووعظ، دعوت وارشاد کے کاموں میں مصروف عمل ہیں۔ یہ امور مذکورہ جس بڑے پیمانے پر اکابر علماء دیوبند کے متوسلین ومنتسبین کے ذریعہ پوری دنیا میں انجام پا رہے ہیں۔ کسی صاحبِ نظر پر مخفی نہیں ہے۔ **ذلك فضل الله يوتيه من يشاء، فللّٰه الحمد والشّكر.**

آج بھی ان اکابر علماء دیوبند امام العصر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، محدثِ وقت فقیہ النفس مولانا رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ کے ماننے والوں کی زندگیاں کھلی کتاب ہیں، جس میں آپ محبت الٰہی کی گرمی اور عشق رسول ﷺ کا نورانی

(۱) اگر چمگادڑ کو دن کی روشنی میں نظر نہ آئے تو اس میں سورج کی چمکدار ٹکیہ کا قصور نہیں ہے۔

سوز پائیں گے،اتباع سنت کا اہتمام اوراحکام شرعیہ کی پابندی دیکھیں گے،اپنی اصلاح اور دینداری کی فکر کے ساتھ اپنے بھائیوں کو دیندار نمازی بنانے کا اہتمام پائیں گے،نفس وشیطان کے دام میں الجھے ہوے بندوں کوان بندشوں سے نکال کراللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ اوراس کے رسول ﷺ کا اطاعت شعار امتی بنانے کی فکروکوشش کرنے والا پائیں گے۔

ان اکابر علمائے دیوبند کے متسبین کے طورطریقوں،ان کی کتابوں،ان کے قائم کردہ مدارس سے آج بھی دین سے دور،کفروالحاد کے دہانے پرکھڑے ہوے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہورہا ہے، اصلاح ظاہر کے ساتھ، باطن کی اصلاح کی فکر پیدا ہورہی ہے،عشق رسول ﷺ کی اصل پہچان اور علامت اتباع سنت اور بدعت سے نفرت کا جذبہ بیدار ہوکر اپنے اعمال وعقائد کو درست کرنے کی فکر پیدا ہورہی ہے۔**شكر الله سعيهم و كثر أمثالهم.**

اس کے علاوہ لوگ جوکچھ غلط سلط باتیں ان اکابر علماء دیوبند کے بارے میں کہتے ہیں،ان کی حیثیت بے بنیاد اتہامات سے زائد کچھ نہیں ہے،جس کی طبیعت چاہے اس موضوع (اکابر پر لگائے گئے اتہامات اوراس کے جوابات) پرلکھی گئی منصفانہ ومحققانہ کتابوں کا مطالعہ کرلے۔

فسوف ترى إذا انكشف الغبار

أفرس تحت رجلك أم حمار (۱)

بلاشبہ ان پاکباز نفوس قدسیہ کے لیے ” **رحمة الله عليه** “کہنا،کہنے والے کے لیے باعث اجروثواب ہے۔

فتوی مذکور فی السوال کے اقتباس ”اکابر علماء دیوبند کے کفروارتداد پر یقینی طورالخ“ کے سلسلہ میں عرض ہے:

پہلی بات یہ کہ حضرات اکابر علماء دیوبند کی کتابوں سے ازخود مطلب نکال کراسے غلط کہا گیا ہے، جب کہ وہ ان حضرات کا مقصود نہیں ہے، نہ ان کی عبارت سے نکلتا ہے،حضرات اکابر دیوبند نے خود اس سے برأت ظاہر کی ہے،ان اکابر علماء دیوبند کا حاشاوکلا اس طرح کی گستاخی کو ارادۃً اختیار کرنا بہت دور کی بات ہے، وہ تو حاشیہ خیال میں آنے کو بھی مذموم وقبیح کہہ رہے ہیں،ان کی

(۱) جب غبار چھٹ جائے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ تم گھوڑے پرسوار ہو یا گدھے پر۔

طرف ایسی گستاخیوں کو منسوب کرنا بڑی خیانت اور جاہلانہ جسارت ہے، جب کہ ان معترضین پر مختلف طور سے واضح کیا جا چکا ہے اور متعدد کتابوں، لا تعداد مضامین کے ذریعہ جواب سمجھایا جا چکا ہے، مگر یہ سمجھ کر نا سمجھ بن رہے ہیں اور عوام کو غلط باتیں بتلا کر گمراہ کرنے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں، مولانا سرفراز خاں صفدر کی کتاب ''عبارات اکابر'' میں بھی اس کی پوری وضاحت ہے، اس کو منگوا کر مطالعہ کر لیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر بفرض محال وہی مطلب کوئی نکالے جس کو معترضین زبردستی نکال کر بتلا رہے ہیں تو بھی متقدمین اور متاخرین علماء فقہاء کے یہاں متفقہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی قول میں متعدد وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ عدم کفر کی ہو تو عدم کفر کی وجہ کو اختیار کرنا مفتی کے ذمہ لازم ہے، **قال في الفتاوى الهندية: إذا كان في المسئلة وجوه توجب الكفر، ووجه واحد يمنع، فعلى المفتي أن يميل إلى ذلك الوجه. كذا في الخلاصة** (الهندية: ۲/۲۸۳، المطبعة الكبرى الأميرية، مصر)، لہٰذا اس ضابطہ کی رو سے ان کو کافر قرار دینا سراسر غلط ہے۔

تیسری بات یہ کہ فتویٰ منسلکہ کی عبارت ''کفر وارتداد پر یقینی طور پر مطلع ہونے کے بعد اگر انہیں کافر ومرتد نہیں مانتے اور ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھتے ہیں وہ بھی انہیں میں سے ہیں'' کی بابت عرض ہے کہ جب کفر ثابت نہیں؛ بلکہ اس کا شائبہ بھی نہیں ہے جیسا کہ جواب (۱) میں تفصیل سے لکھ دیا گیا، یقینی ہونا تو دور کی بات ہے جیسا کہ ''عالمگیری'' کا حوالہ نقل ہوا تو ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھنے یا کہنے سے منع کرنا کسی طرح درست نہیں ہوا، بلکہ قائل کا تحکّم (زبردستی حکم لگانا) ہے؛ لہٰذا ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہنے والا شخص نہ ایمان سے خارج ہوا، نہ ہی اس کی امامت میں کوئی کراہت پیدا ہوئی، بلکہ ان پاک باز نفوس قدسیہ کے لیے رحمۃ اللہ علیہ لکھنا اور کہنا مستحسن، باعث ثواب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/۷/۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

والمجیب مصیب: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ

اکابر دیوبند سے متعلق بعض اہم مغالطوں کا جواب

سوال: ﴿۱۹﴾.....(ب) حضرت مفتی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ———————— ''درج ذیل اشتہار ایک بریلوی مولوی کی طرف سے شائع ہوا ہے''

سنی سنی ہیں اور وہابی وہابی ہی ہیں

وہابی جماعت کے شیخ الاسلام مولوی حسین احمد (صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) اپنی کتاب ''**الشّهاب الثّاقب**'' ص:۵۳ ر میں لکھتے ہیں:

''محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتداءً تیرہویں صدی میں نجد عرب (ریاض) سے ظاہر ہوا اور چوں کہ یہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا؛ اس لیے اس نے اہلِ سنت والجماعت سے قتل وقتال کیا، ان کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، ان کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا، ان کے قتل کرنے کو باعثِ ثواب ورحمت شمار کرتا رہا، اہل حرمین کو خصوصاً اور اہل حجاز کو عموماً، اس نے تکلیف شاقہ پہنچائیں، سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے''۔ اس حوالہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ''عبدالوہاب نجدی'' بدعقیدہ، اور گمراہ تھا، اگر اہل سنت والجماعت سے ہوتا تو وہ اہل سنت والجماعت کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتا، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ سنّی سنّی ہیں اور وہابی وہابی؛ لہٰذا اس کے بعد کم از کم آج سے وہابی جماعتیں اور ان کے ماننے والے اگر ان میں اخلاق نام کی کوئی شئ ہے تو اپنے آپ کو سنّی نہیں کہنا چاہیے اور اگر دھوکہ سے کہنا بھی چاہتے ہیں تو چھوڑ دینا چاہیے۔

''وہابی'' کون؟

وہابی، اہل حدیث، تبلیغی اور دیوبندی جماعت کے اکابر علماء کے حوالے پیش کیے جاتے ہیں، کوئی بھی حوالہ اہل سنت والجماعت کے عالم کا نہیں ہے۔

(۱) بانی تبلیغی جماعت کے پیر ومرشد مولوی ''رشید احمد گنگوہی'' لکھتے ہیں ''محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو ''وہابی'' کہا جاتا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ۱/۱۱۱)

(۲) دیوبندی سربراہ مولوی ''منظور نعمانی'' اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں :اور ہم خود اپنے بارے میں صفائی سے کہتے ہیں کہ ہم بڑے سخت ''وہابی'' ہیں۔ (سوانح محمد یوسف کاندھلوی۱۹۰)

(۳) تبلیغی دیوبندی مذہب کے سرپرست مولوی ''زکریا کاندھلوی' کہتے ہیں ''مولوی صاحب میں خود تم سے بڑا وہابی ہوں''۔ (سوانح مولانا محمد یوسف:۱۹۲)

(۴) دیوبندی وتبلیغی جماعت کے مرکز ہدایت مولوی ''اشرف علی تھانوی'' کی زبانی :بھائی یہاں ''وہابی'' رہتے ہیں، یہاں فاتحہ نیاز کے لیے کچھ مت لایا کرو۔ (اشرف السوانح:۱/۴۵)

(اشتہار مذکور کی عبارت ختم ہوئی)

اس تحریر کا مدلل جواب مطلوب ہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول ورنگل

الجواب وباللہ التوفیق:

اشتہار ہذا کے حوالوں سے متعلق عرض یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی علیہ الرحمۃ کے متعلق یہ رائے جوانہوں نے ''**الشہاب الثّاقب**''میں لکھی ہے،جس کا حوالہ اشتہار ہذا میں دیا گیا ہے،اس وقت کی تھی جب تک ان کے بارے میں صحیح حالات کا علم نہیں ہوا تھا اور انگریزوں کی سازش سے ایک غلط پروپیگنڈہ الشیخ محمد بن عبدالوہاب کو بدنام کرنے کے لیے کیا جارہا تھا، بعد میں جب مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں صحیح اور تحقیقی معلومات، ان کی اصل کتب کو دیکھ کر حاصل ہوئیں تو آپ نے اپنی سابقہ رائے سے رجوع فرمالیا تھا؛ جو روزنامہ ''زمیندار'' لاہور سے اس وقت شائع ہوا، نیز ''**أكمل البيان**'' کتاب کے ص:۹ پر یہ بیان درج ہے،جس کا متن حسب ذیل ہے:

''مجھ کو اس امر کے اعلان کرنے میں ذرہ پس وپیش نہیں کہ میری وہ تحقیق، جس کو میں بخلاف اہل نجد رجوم المذنبین اور الشہاب الثاقب میں لکھ چکا ہوں، اس کی بنا ان کی تالیف وتصنیف پر نہ تھی، بلکہ محض افواہوں یا ان کے مخالفین کے اقوال پر تھی، اب ان کی معتبر تالیف بتارہی ہے کہ ان کا خلاف اہل سنت والجماعت سے اس قدر نہیں جیسا کہ ان کی نسبت مشہور کیا گیا ہے؛ بلکہ چند جزوی امور میں صرف اس درجہ تک ہے کہ جس کی وجہ سے ان کی تکفیر تفسیق یا تضلیل نہیں کی جاسکتی'' واللہ اعلم۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری عبارت اس طرح ہے:''محمد بن عبدالوہاب

کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں، ان کے عقائد عمدہ تھے اور مذہب حنبلی تھا، البتہ ان کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں، مگر ہاں! جو حد سے بڑھ گئے ہیں ان میں فساد آ گیا اور عقائد سب کے متحد ہیں، اعمال میں فرق حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کا ہے۔'' (فتاوی رشیدیہ: ۲۸۰، گلستاں کتاب گھر دیوبند)

یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ چاروں ائمہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ رکھنے والے ہیں اور ان کے ماننے والے سنی ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ خود اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''**إنّي ولـلّـه الحمد ـــ متبع ولست بمبتدع ،عقيدتي وديني الّذي أدين اللّه به هـو مـذهـب أهـل السّـنّة والـجماعة الذي عليه أئمة المسلمين مثل الأئمة الأربعة وأتبـــاعهـم**'' ترجمہ: میں الحمد للہ ائمہ سلف کا متبع ہوں مبتدع (دین میں نئی بات نکالنے والا) نہیں ہوں، میرا عقیدہ اور میرا دین جو میں اللہ کے دین کی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے ہوں وہ اہل سنت والجماعت'' کا وہی طریقہ، مسلک ہے جو امت کے ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین کا مسلک اور طریقہ ہے''، تفصیل کے لیے کتاب ''شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ'' از مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ، کا مطالعہ فرمالیا جائے۔

سوانح مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے جو دو عبارتیں نقل کی گئی ہیں یہ ایک طویل گفتگو کا ایک ٹکڑا ہے، پوری گفتگو اصل کتاب میں پڑھی جا سکتی ہے، پوری عبارت پڑھنے سے بات کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے انتقال سے چند روز قبل یہ گفتگو حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث علیہ الرحمۃ کے مابین ہوئی جو اس غور و فکر پر مشتمل تھی کہ ''دعوت و تبلیغ کا یہ کام جس سے امت کو بڑا نفع ہو رہا ہے، لوگوں کے اندر دینی بیداری پیدا ہو کر مسجدیں آباد ہو رہی ہیں، شرک و بدعت سے نفرت ہو کر سنت و شریعت سے محبت پیدا ہو رہی ہے، حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے انتقال کے بعد اس کام کو جاری و برقرار رکھنے کی فکر کی جا رہی تھی''، اگلی پچھلی عبارتوں کو دیکھنے سے بات بالکل واضح ہے کہ کسی بزرگ کے انتقال کے بعد ان کے سنت

وشریعت میں ڈھلے ہوئے کام اور طریقہ کو ترقی دینا ہی ان بزرگ سے سچی محبت اور عقیدت کی علامت ہے، نہ کہ ان کی قبر کو صرف زیارت گاہ بنا کر عقیدت ومحبت میں غلو کرنا، جو بسا اوقات شرکیہ اعمال تک پہونچا دیتے ہیں جو قبر پرستی کہلاتی ہے''۔قبر پرستی کی مخالفت اور مزارات پر غیر شرعی طریقوں اور بدعات کے مٹانے میں چونکہ شیخ عبد الوہاب نجدی کی شخصیت مشہور ہوگئی تھی، اس لحاظ سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے پہلی عبارت میں اپنے کو وہابی کہا ہے اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اپنے کو''سخت وہابی'' کہا ہے،جس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ہم مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے وصال کے بعد دعوت وتبلیغ کے ذریعہ دین کی اشاعت کر کے گمراہوں اور بے دینوں کو دین کا شیدائی اور شریعت وسنت پر عمل پیرا ہونے والا بنانے کی کوشش برقرار رکھیں گے،صرف ان کی نشست وبرخاست کی جگہ کو تبرک اور مزار کو زیارت گاہ بننا پسند نہیں کریں گے کہ لوگ ان کے کام سے نہ جڑیں، دین کی دعوت کا کام نہ کریں،صرف مزار کی زیارت کر کے تبرک حاصل کرلیا کریں، ہم اس کو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔

چوتھی عبارت اشتہار ہذا میں اشرف السوانح سے نقل کی گئی ہے؛ بات یہ ہے کہ شیرینی یا کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنا، قرآن وحدیث یا صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہیں ہے، اس خلاف سنت طریقہ کو منع کرنے میں محمد بن عبد الوہاب کی شہرت عام تھی؛ اس لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اس فاتحہ کے طریقہ کو درست نہیں سمجھتے''یہ سمجھ لو کہ یہاں وہابی رہتے ہیں، جو اس طریقہ کو سنت وشریعت کے خلاف سمجھتے ہیں''۔

حاصل یہ کہ ان حضرات اکابر نے اپنے کو وہابی رسوم وبدعات کے مٹانے اور احیائے سنت کے لحاظ سے کہا ہے، شیخ''محمد بن عبد الوہاب'' کے جملہ اقوال واعمال میں ہم خیال ہونے، یا ان سے متفق ہونے کی وجہ سے نہیں کہا، بلاشبہ حضرات اکابر دیوبند عقیدۃً اہل سنت والجماعت میں سے ہیں، مسلکاً امام اعظم ابوحنیفہ کے مقلد ومتبع ،مشرباً سلاسل اربعہ: چشتیہ صابریہ،نقشبندیہ مجددیہ،سہروردیہ، قادریہ سے ارتباط روحانی اور نسبت باطنی حاصل کرنے والے اور ولی اللّٰہی فکر کے حامل ہیں، اس بنیاد پر یہ حضرات حقیقی اور واقعی سنی ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک فتوے میں تحریر فرماتے

ہیں: اس وقت اور ان اطراف میں وہابی متبع سنت اور دیندار کو کہتے ہیں۔ فتاوی رشیدیہ: ۱۱۰ (گلستان کتاب گھر دیوبند)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/۷/۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، ظفیر الدین، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

فرقہ مہدویہ کے عقائد اور امام مہدی کی علامات احادیث کی روشنی میں

سوال: ﴿۲۰﴾ آپ نے مہدویہ فرقہ کا کافر ہونا سمجھایا، ورنہ ہم ہندوستان کے مسلمان تو انہیں عام مسلمان ہی سمجھتے تھے، میں ان کے کفریہ عقائد کو تفصیلی طور پر جاننا چاہتا ہوں، ان کے خلاف لکھی جانے والی کتابوں میں سے دو کتابیں ''ہدیہ مہدویہ'' اور ''مطالعہ مہدویت'' اگر آپ نیٹ پر ڈلوادیں؛ کیوں کہ نیٹ پر یہ لوگ کافی کام کررہے ہیں، ان کی ویب سائٹ بھی آپ کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں اس پر بھی تبصرہ کریئے گا۔ غلام محمد ۶۸۸/د ۱۴۳۱ھ

الجواب وباللہ التوفیق:

فرقۂ مہدوی کی تحریک کا قائد ''سید محمد جون پوری'' ہے، ۱۴ جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ شہر ''جون پور'' میں اس کی ولادت ہوئی، والد کا نام ''یوسف'' اور ماں کا نام ''آغا ملک'' تھا، مگر بعد میں مہدویوں نے دونوں کا نام بدل کر عبد اللہ اور آمنہ کردیا، یہ شروع سے بہت جری و بہادر تھا، بے محابا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتا، فن خطابت میں اپنی مثال آپ تھا، اس کی باتیں جادو کی طرح اثر کرتی تھیں، عرصۂ دراز تک پہاڑوں اور وادیوں میں گوشہ نشینی اختیار کی اور سخت ریاضت ومجاہدہ کیا، مگر شیخ کامل کی راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے طریقۂ مستقیم سے ہٹ گیا، الفاظ کو غلط محمل پر حمل کرکے اور اشارات غیبی کے غلط معنی سمجھ کر مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ کیا، اور مختلف مقامات پر اور اسفار میں لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دی، اور امراء وسلاطین کو دعوتی خطوط بھی ارسال کیے، جس میں اس نے لکھا کہ میں ''محمد بن عبد اللہ'' رسول اللہ کا ہم نام ہوں، مجھے اللہ نے ولایت محمدیہ کا خاتم اور اپنے نبی کی بزرگ امت پر خلیفہ بنایا ہے، میں وہی شخص ہوں، جس کے آخری زمانہ میں مبعوث

ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے، میں وہی شخص ہوں جس کا تذکرہ سابق صحیفوں میں ہے، اللہ نے مجھے مفترض الطاعۃ بنایا ہے، اے لوگو! مجھ پر ایمان لاؤ، جو مجھ پر ایمان نہیں لائے گا، اللہ اس کی سخت گرفت کریں گے۔

مذکورہ بالا باتیں ایسی تھیں جن کی قرآن وحدیث میں قطعاً گنجائش نہ تھی، چنانچہ مخلصین علماء کرام نے اس فتنہ کے سد باب کے لیے قربانیاں دیں، جن میں ہندوستان کے مشہور نامور محدث ''شیخ علی متقی'' مہاجر مدنی سرفہرست ہیں، انہوں نے ''علامہ سیوطی'' کے رسائل کی تلخیص کر کے ''محمد جون پوری'' کے دعاوی پر سخت رد کیا۔

مہدویوں کے عقائد انہیں کی کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں؛ ''شواہد الولایت'' ان کی نامور کتاب ہے، اس میں ص:۱۷ پر ہے:

(۱) بحر حقائق میں رواں بے میم احمد آئے تم۔ بے میم احمد ''احد'' ہے، اور احد صرف اللہ کی ذات ہے: ''قل هو اللّٰه أحد'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ زمین پر بہ شکل مہدی ظاہر ہوگیا (العیاذ باللہ)

(۲) میراں صاحب (سید محمد جون پوری) کا دیدار، خدا کا دیدار ہوا کرتا تھا۔

(۳) ہر لمحہ میراں صاحب کے لیے ایک تازہ خدا ہوا کرتا تھا۔

(۴) میراں صاحب پہلے خدا تعالیٰ کے عاشق تھے، مگر بعد میں خدا خود ان پر عاشق ہوگیا۔

(۵) میراں صاحب اولین وآخرین کا علم رکھتے ہیں اور ان کا منکر کافر ہے۔

(۶) میراں صاحب کسی پیغمبر سے کم نہیں۔

(۷) میراں صاحب کی صحبت کی تمنا بہت سے انبیاء نے کی ہے۔

(۸) میراں صاحب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ذات وصفات دونوں میں قطعاً ایک ہیں۔

(۹) میراں صاحب کے توسط کے بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی معرفت رب حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

(۱۰) میراں صاحب کی اطاعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح فرض ہونا قطعی امر ہے۔

(۱۱) میراں صاحب از جنس بشر نہیں تھے۔

(۱۲) میراں صاحب کو نہ کسی نے جنا نہ انہوں نے کسی کو جنا، (جب کہ یہ صفت اللہ رب العزت کی ہے: لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ)

(۱۳) میراں صاحب نے فرمایا: ہم انبیاء کے گروہ ہیں۔

(۱۴) میراں صاحب اللہ تعالیٰ کے نور کا نور اور راز کا راز تھے،ان کا مرتبہ بیان سے باہر ہے، ان کی ناقدری اللہ کی ناقدری ہے۔

(۱۵) میراں صاحب نبی کریم ﷺ کی روح اور ان کی ولایت کا مظہر ہیں۔

(۱۶) میراں صاحب کعبہ کے رب ہیں اور کعبہ ان کا طواف کرتا ہے۔

(از مطالعۂ مہدویت مؤلفہ حضرت مولانا عبدالقوی صاحب)

(۱۷) فرض نمازوں کی تعداد چھ ہے۔

(۱۸) خطبۂ جمعہ کے قائل نہیں،عید کی نماز کے منکر ہیں،ان کی ایک الگ شریعت ہے،ان کی ذات ایمان وکفر کی معیار ہے۔

(۱۹) وہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں،ان سے صغائر بھی سرزد نہیں ہوتے۔

(۲۰) ان کو عربی اور ہندی میں وحی آتی تھی۔

(۲۱) حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک،سب کے سب میراں صاحب کے فیض یافتہ ہیں۔

(۲۲) میراں صاحب کے زمانہ میں شہید ہونے والوں کا اللہ تعالیٰ خود خون بہا ہوگیا۔

ان فاسد عقیدوں کو ہندوستان کے نامور محدث ''شیخ علی متقی'' علیہ الرحمۃ نے قلم بند کر کے علمائے حرمین سے فتویٰ طلب کیا،جس میں علمائے حرمین نے بہ اتفاق ''سید محمد جون پوری'' اور ان کے متبعین کو کافر مرتد و باغی قرار دیتے ہوے، واجب القتل قرار دیا تھا، ہندوستان کے جملہ مفتیان کا بھی یہی مسلک ہے کہ وہ (میراں صاحب جون پوری) اپنے فاسد عقیدوں کی بنیاد پر کافر و مرتد ہے۔

آیاتِ قرآنیہ میں مہدویوں کی تحریف:

مہدویوں کا دعویٰ کرنا کہ (قرآن کریم میں) اٹھارہ مقامات پر ''محمد جون پوری'' کا تذکرہ ہے، یہ دعویٰ بلا دلیل، نیز تفسیر بالرائے اور تفسیر وتوضیح میں جمہور علماء سے انحراف کے باعث قابل قبول نہیں، بلکہ مردود ہے۔قرآن میں جہاں کہیں ''نور'' کا لفظ آیا ہے مثلاً: سورۂ نساء کی آیت: ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ کُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُبِیْنًا ''(نساء:۱۷۵)،سورۂ مائدہ کی آیت: ''قَدْ جَآءَ کُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتَابٌ مُبِیْنٌ ''(مائدۃ:۱۵)،تغابن کی آیت: ''فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ''(تغابن:۸)؛ان آیتوں میں انھوں نے

نور سے ولایت مہدی مراد لیا ہے، جب کہ مفسرین نے نور سے قرآن کریم یا ذاتِ نبوی کو مراد لیا ہے اور اسی پر اہلِ اسلام کا اتفاق ہے؛ اس لیے تفسیر بالرائے کی وجہ سے مذکورہ معنی مراد لینا قطعاً درست نہیں بلکہ کھلی تحریف ہے، اسی طرح انہوں نے سورۂ نساء کی آیت: ''فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ''(نساء:۶۹) سے بلا دلیل ''فرقہ مہدویہ'' کو مراد لیا ہے، اس آیت کا مصداق اپنے آپ کو گردانا بھی خیانت اور افتراء ہے؛ کیوں کہ کتبِ تفسیر مثلاً: تفسیر کبیر، روح المعانی، کشاف وغیرہ میں مذکورہ آیات کی تفسیر میں ان کا تذکرہ تک نہیں ہے، اسی طرح فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (مائدۃ:۵۴)، فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (انعام:۹۰) وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (محمد:۳۸)، اور ان جیسی دیگر آیات کا مصداق بھی انہوں نے مہدوی فرقہ کو بتایا ہے، جو سراسر تحریف ہے، جب کہ پہلی آیت سے مراد مفسرین کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اہل یمن، اہل فارس یا انصار یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ (علی حسب الاختلاف) ہیں (۱)، دوسری آیت کے مصداق مفسرین کے اقوال کے مطابق مہاجرین، انصار یا اہل فارس ہیں، اسی طرح تیسری آیت کے مصداق انصار یا اہل فارس ہیں (تفسیر کبیر:۱۳/۵۶، ط:بیروت)۔

مذکورہ بالا آیتوں کی تفسیر میں مفسرین نے نہ تو فرقہ مہدویہ کا تذکرہ کیا ہے اور نہ ان کو ان آیتوں کا مصداق ٹھہرایا ہے، اس لیے زبردستی اپنے اوپر فضیلت چسپاں کرنے کے لیے ان جیسی آیتوں کا مصداق خود کو بتانا، سراسر خیانت، تفسیر بالرائے اور اجماع امت سے انحراف ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔

سورۂ مومن کی آیت ''رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ '' (المومن:۸) میں انھوں نے کہا کہ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ ''سے میراں صاحب کے بیٹے ثانی مہدی مراد ہیں، جب کہ ان کا مراد لینا خود نص قرآنی کے خلاف ہے، کیوں کہ اس سے پہلی آیت میں حاملین عرش کا مؤمنین، صالحین کے لیے دعا کرنا بتلایا گیا ہے، یہ آیت بھی انہیں کی دعا کا جزء

(۱) اختلفوا في أن أولئك القوم من هم؟ فقال علي بن أبي طالب والحسن هم أبوبكر و أصحابه، وقال السّدّي: نزلت الآية في الأنصار، وقال مجاهد: نزلت في أهل اليمن، وقال آخرون: هم الفرس إلخ (التّفسير الكبير: سورة المائدة: الآية: ٥٤، ١٢/١٨ دار الكتب العلمية، بيروت)

ہے، پھر کیوں کر اس سے ثانی مہدی مراد ہوسکتا ہے؟ قَالَ تَعَالَی: اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا. (المومن:۷)۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت: ۸۰ میں سُلْطٰنًا نَصِیْرًا (۱) سے بھی مراد ''میاں سید خوندمیر'' کو لیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ آیت ہجرت کے موقع پر نازل ہوئی ہے؛ جس وقت نبی کریم ﷺ ہجرت کر رہے تھے اس وقت آپ ﷺ نے یہ دعا کی کہ اے اللہ! مجھ کو اچھی جگہ پر پہنچا دے اور ظاہری غلبہ و مدد میرے لیے مقرر فرما، تفسیر کبیر، روح المعانی، کشاف وغیرہ کہیں بھی اس آیت کے ضمن میں فرقہ مہدویہ یا اس کے بانی کا تذکرہ نہیں ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ. (بقرۃ:۱۲۹) وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّأْتِیْ مِنْ بَعْدِیْ اسْمُهٗ اَحْمَدُ (الصّف:۶)، ان آیات میں باتفاق مفسرین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ کی تمنا کرنا، عیسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو نبی کریم ﷺ کی بشارت دینا مراد ہے، مگر اس فرقے نے مذکورہ آیات کے حوالے سے بھی جادۂ مستقیم سے انحراف کرتے ہوئے اپنے پیشوا ''سید محمد جون پوری'' کو دعائے ابراہیمی اور تبشیر عیسیٰ کا مصداق ٹھہرایا ہے۔

مہدی موعود کی شخصیت وحیثیت اور ان کی صفات:

احادیث شریفہ میں امام مہدی کی جو نشانیاں مذکور ہیں ان میں ایک بھی، ذرہ برابر ''سید محمد جون پوری'' پر صادق نہیں آتی؛ اس لیے ان کا مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرنا سراسر خیانت، بد دیانتی اور شیطانی فریب ہے، امام مہدی کے تعلق سے جو احوال احادیث میں مذکور ہیں وہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

امام مہدی حجاز میں پیدا ہوں گے، اہل بیت کے خاندان سے ہوں گے، یہ شکل وصورت میں نبی کریم ﷺ کے مشابہ ہوں گے اور اخلاق وسیرت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرح ہوں گے، ان کی عمر چالیس سال ہوتے ہی، والیٔ حجاز کا انتقال ہوگا، اور نئے خلیفہ کے انتخاب پر مدینہ میں

(۱) وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا (بني إسرائيل :۸۰)

اختلاف اٹھ کھڑا ہوگا، امام مہدی اس دوران ولایت کے مقام پر فائز ہوں گے؛ اس لیے فوراً ''مکہ'' کا رخ کریں گے، مبادا لوگ پہچان کر خلافت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر نہ ڈال دیں، یہاں طواف کرتے ہوئے مقبولین انھیں پہچان لیں گے اور ڈھونڈتے ہوے ان کی قیام گاہ پہنچ کر انھیں بالآخر بیت اللہ شریف میں لے آئیں گے، حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان بیعت ہوگی، ان کی تعداد اس وقت ۳۱۳/ ہوگی، وہ اس وقت کے افضل ترین مسلمان ہوں گے، یہ افراد ہتھیار کی طاقت سے تہی دست ہوں گے، امام مہدی کے ظہور کی خبر حجاز میں پھیل جائے گی، اس وقت قریش کا ایک شخص جس کا نام ''سفیانی'' ہوگا اور اس کی ننھیال قبیلۂ کلب کی ہوگی، ''مکہ'' پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر روانہ کرے گا جو ذوالحلیفہ میں دھنس جائے گا، پھر سفیانی خود لشکر لے کر مکّے پر چڑھائی کرے گا، مگر امام مہدی اس کو شکست دے دیں گے، بے پناہ مال غنیمت حاصل ہوگا، باندیوں کی اتنی کثرت ہوگی کہ وہ دمشق کی طرف جانے والے راستے پر فروخت ہوں گی، آج کے دن اس شخص کو بڑا بد قسمت سمجھا جائے گا جو اس جہاد وغنیمت میں شریک نہ ہو سکا؛ کیوں کہ لڑائی کے بعد امام مہدی خوب داد و دہش کریں گے۔

امام مہدی کی ایسی کھلی کرامت کو دیکھ کر لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑیں گے، سب سے پہلے شام کے ابدال وعلماء اور عراق کی جماعت اور ٹولیاں حاضر خدمت ہوں گی، اس کے بعد امام مہدی مدینہ کا رخ کریں گے اور روضۂ اطہر پر حاضری کے بعد، شام کی طرف ایک لشکر کے ساتھ کوچ کریں گے، وہاں عیسائیوں سے مڈبھیڑ ہوگی، جن کی تعداد آٹھ لاکھ ہوگی، مسلمان ان کے مقابلہ میں بہت کم ہوں گے، تین دن زبردست خوں ریز جنگ ہوگی اور چوتھے دن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کریں گے اور مسلمان ''لبنان''، ''بیروت'' اور ''اٹلی'' کے دار الحکومت ''روم'' کو فتح کرلیں گے، پورے براعظم میں اسلامی فوج پھیل جائے گی، واپسی میں ''قسطنطنیہ'' کے پاس لشکر جمع ہوگا، پہلی تکبیر سے شہر کی فصیل ٹوٹ کر گر جائے گی، دوسری تکبیر سے دوسرے طرف کی فصیل منہدم ہو جائے گی اور شہر قسطنطنیہ فتح ہو جائے گا، اس فتح میں بھی خوب مالِ غنیمت حاصل ہوگا، اس دوران ''دجال'' کے خروج کی افواہ آئے گی اور وہ شام کی طرف کوچ کرے گا، مگر اس سے پہلے امام مہدی شام پہنچ چکے ہوں گے (مسلم)، یہیں دمشق کی مسجد کے مشرقی کنارے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، دجال

اور اس کے لشکر سے خوں ریز جنگ ہوگی، دجال بھاگ کھڑا ہوگا، مقام ''لد'' میں مسلمان اس کو گرفتار کر لیں گے اور ابن مریم علیہ السلام اس کو اپنے نیزے سے قتل کریں گے (مسند احمد)، یہودیوں میں بھگدڑ مچ جائے گی، اسرائیل فتح ہوگا، صہیونیت ہمیشہ کے لیے مٹادی جائے گی، اس دوران امام مہدی کفار و مشرکین کے خلاف عالمی جہاد چھیڑیں گے، جزیہ موقوف ہوگا، خنزیر کا قلع قمع ہوگا، صلیب کے پرخچے اڑیں گے اور پوری دنیا پر عالمی خلافتِ راشدہ قائم ہوگی، یہ دنیا والوں کے لیے انتہائی حسین دور ہوگا، مسلمان خوب مستغنی ہوں گے، زمین اپنے خزانے اگل دے گی، زکوۃ کا کوئی لینے والا نہ ملے گا، بغض وحسد، مکر وفریب، ریاکاری ان سب سے سینہ پاک وصاف رہے گا، اس سال کے آخر میں امام مہدی کی وفات ہوگی اور ابن مریم علیہ السلام ان کی نماز جنازہ پڑھا کر دفن کردیں گے، یہ تمام تفصیلات صحیح احادیث سے ماخوذ ہیں۔ ان صحیح روایات کی روشنی میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ امام مہدی کی کتنی علامتیں موصوف ''محمد جون پوری'' پر منطبق ہوتی ہیں۔ (ماخوذ از: امام مہدی شخصیت وحقیقت)(۱)

امام مہدی کی حیثیت: نبی کریم ﷺ آخری نبی ہیں اور دین مکمل ہو چکا ہے، شریعت کے احکام ابدی ہو چکے ہیں، لیکن انسان تغیر پسند واقع ہوا ہے، چنانچہ ہر دور میں دین کے حوالے سے غلو وتشدد، جہالت وغفلت، بدعات وخرافات اور افراط وتفریط ہوتی رہی ہے، گو کہ اللہ رب العزت نے انبیائے کرام کی بعثت کا دروازہ بند کردیا، مگر ان برائیوں کو ختم کرنے کے لیے مجددین ومصلحین کا دروازہ کھلا ہوا ہے، جو دین سے ان ساری خرافات کو ختم کرتے ہیں جن سے اسلام کی شبیہ بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، یا اس کے رخ زیبا پر بدنما داغ آتے ہیں، اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت کی حامل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد اور دیگر کتب میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: **إن اللّٰہ یبعث لهذه الأمة علی رأس کل مائة سنة من یجدد لها دینها** (۲)، اس امت کے سب سے پہلے مجدد سیدنا حضرت ''عمر بن عبد العزیز'' رحمہ اللہ ہیں، اس کے بعد ہر دور میں مجددین پیدا ہوتے رہے ہیں، جس کی آخری کڑی امام مہدی ہیں جو اس امت کے آخری مجدد ہوں گے اور فتنہ وفساد، کفر والحاد کی گھنگور گھٹا میں نمودار ہو کر ایمان کا چراغ روشن کریں گے؛ اس لیے ان کو خاتم

(۱) مؤلفہ مولانا اسعد قاسم سنبھلی صاحب۔

(۲) أخرجه أبو داؤد، رقم: ۴۲۹۱، باب ما یذکر في قرن المائة.

تجدید، جامع المجد دین، مجدد آخرالزماں اور امام المجد دین کہہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **هو آخر مجدّدی هذه الامة** (الکوکب الدری: ۲/ ۵۷)، وہ انبیائے کرام خصوصاً نبی کریم ﷺ کے برابر ہرگز نہ ہوں گے، ان کی حیثیت ایک امتی کی ہوگی، وہ شریعتِ محمدیہ پر عمل پیرا ہوں گے اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دیں گے، وہ نبی بھی نہ ہوں گے؛ کیوں کہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اس لیے امام مہدی کا مرتبہ انبیائے کرام کے مرتبہ سے بہت کم تر ہوا؛ کیوں کہ نبی اور مجدد میں زمین وآسمان کا فرق ہے، امام مہدی محض ولی ومجدد ہوں گے، جن کا درجہ صحابہ سے بھی کم ہے؛ کیوں کہ ولی کتنے ہی بلند مرتبہ پر کیوں نہ پہونچ جائے وہ کسی صحابی کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ نبی کے برابر، اس لیے مہدوی فرقہ کا عقیدہ رکھنا کہ ''محمد جونپوری'' کا مرتبہ پیغمبر کے برابر ہے، قرآن وحدیث اور اجماعِ امت کے سراسر خلاف ہے، نہ وہ ولی ہے نہ ہی امام مہدی۔ فقط

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/ ۵/ ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ

مفتیان دارالعلوم دیوبند

شیعوں کے ائمہ اہل حق میں سے تھے
اور ان کی تعلیمات صحیح تھیں

محترم! السلام علیکم

سوال: ﴿۲۱﴾ میرا آپ سے سوال شیعہ اماموں کے متعلق ہے۔ (۱) ہمارے مسلک یعنی اہل سنت والجماعت کی نظر میں شیعہ اماموں کی کیا حیثیت ہے؟ اور (۲) کیا ان کے مزارات پر ہم لوگ اہل سنت والجماعت حاضری دے سکتے ہیں؟ اور یہ امام کیا واقعی شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟ کیا ہم اہل سنت والجماعت ان کی تعلیمات کو فالو کر سکتے ہیں؟ برائے مہربانی میرے سوال کا ضرور جواب دیجیے گا۔ والسلام جنید ظہیر اٹک پنجاب، پاکستان (۱۱۲/ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق: حامداومصلیاومسلما!

(۱) شیعہ مذہب جن اکابر کوامام معصوم کہتا ہے، انہوں نے نہ کبھی ''امامت'' کا دعویٰ کیا، نہ مخلوقِ خدا کو اپنی اطاعت کی دعوت دی؛ بلکہ وہ سب کے سب اہلِ سنت والجماعت کے اکابر اور مسلمانوں کی آنکھوں کا نور تھے، ان کا دین و مذہب، ان کا طور وطریقہ اور ان کی عبادت کبھی شیعوں کے اصول وعقائد کے مطابق نہیں ہوئی، بلکہ وہ سب صحابہ اور تابعین کے طریقے پر تھے، مگر شیعہ مذہب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اندر سے ان کے عقائد کچھ اور تھے، از راہ تقیہ وہ مسلمانوں کے مطابق عمل کرتے تھے، گویا شیعوں کے نزدیک خدا نے امام معصوم بنا کر بھیجا بھی تو ایسے لوگوں کو جو دنیا کو کوئی ہدایت نہ دے سکے بلکہ ساری عمر لباسِ تقیہ میں ملبوس رہے، اور بارہویں امام تو ایسے غائب ہوئے کہ آج تک ان کا کہیں سراغ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیعوں کا نظریۂ امامت نہ صرف آنحضرت ﷺ کی رسالت ونبوت پر کاری ضرب لگاتا ہے؛ بل کہ یہ سراسر عقل کے بھی خلاف ہے اور یہ خدا کی تعلیم نہیں، بلکہ کسی یہودی دماغ کی ایجاد ہے(۱) اور چوں کہ شیعوں نے ان اماموں کی طرف بہت سی ایسی باتیں منسوب کر رکھی ہیں کہ واقع میں ان اماموں کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ اس لیے ان کی وہی تعلیمات قابلِ اتباع ہیں جو اہلِ سنت والجماعت کے علماء کی تعلیمات کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں، ہر بات جو ان کی طرف منسوب ہو ہرگز قابلِ اتباع نہیں ہے۔

(۲) جہاں تک ان کے مزارات پر حاضر ہونے کی بات ہے، تو چوں کہ عموماً وہاں پر بدعات وخرافات اور غیر شرعی چیزیں ہوتی رہتی ہیں، اس لیے ان کے مزارارت پر نہ جانا بہتر ہے، خصوصا شیعوں کے تہواروں کے ایام میں تو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ، فخر الاسلام، بلندشہری، وقار علی غفرلہ

(۱) اختلاف امت اور صراط مستقیم: ۲۰-۲۱، مکتبہ رشیدیہ سہارنپور۔

ڈاکٹر ذاکر نائک

اپنی تقریروں اور تحریروں کے آئینے میں

معزز مفتیان، دارالعلوم دیوبند .... زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سوال: ﴿۲۲﴾ میرا سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر ''ذاکر نائک'' صاحب کیسے آدمی ہیں؟ کیا ان کے عقائد اہل السنّت والجماعت کے موافق ہیں؟

حدیث اور تفسیر قرآن کے بارے میں ان کی رائے قابلِ اعتبار ہے یا نہیں؟ نیز فقہ میں ان کا مسلک کیا ہے؟ وہ کس امام کے مقلد ہیں؟

ہم ان کی باتوں کو سن کر ان پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ از راہِ کرم تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: ریاض احمد (الہ آباد) عالیہ پرنٹرس، اترسوئیا (الہ آباد)

(۵۴۸/د ۱۴۳۲ھ)

> ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب سے متعلق اکثر سوالات آتے رہتے ہیں۔ استفتاء ہذا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کے عقائد، ان کا فقہی مسلک اور قرآن وحدیث سے متعلق ان کی تشریحات کے بارے میں تفصیلی جواب کی درخواست کی گئی ہے؛ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی تقریر وتحریر کی روشنی میں ایک مفصل جواب لکھا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: حامداومصلیاومسلما!

ڈاکٹر ''ذاکر نائک'' صاحب کے بیانات میں صحیح عقیدے سے انحراف، قرآنِ کریم کی تفسیر میں تحریف، من مانی تفسیر، سائنسی تحقیقات سے مرعوبیت، اسلام مخالف مغربی افکار سے ہم آہنگی اور فقہی

مسائل میں سلفِ صالحین اور جمہورِ امت کی راہ سے روگردانی جیسی گمراہ کن باتیں پائی جاتی ہیں، نیز وہ امتِ مسلمہ کو ائمہ مجتہدین کی اتباع سے پھیرنے، دینی مدارس سے برگشتہ کرنے اور علمائے حق سے عوام کو بدگمان کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں(۱) ذیل میں ان کی گمراہ کن باتوں میں سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

〈۱〉 **عقیدہ**: (جو ایک انتہائی نازک چیز ہے، جس میں تھوڑی سی بھی لغزش بسا اوقات ایمان

---

(۱) دینی مدارس نیز علمائے حق سے عوام کو برگشتہ کرنے کے تئیں ڈاکٹر ذاکر نائک کی کوشش:

اس سلسلے میں ''مرکز المعارف بمبئی'' سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''اسٹرن کریسنٹ'' کا ایک اقتباس ہی کافی ہے، اسی سے عقلمند آدمی ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کی خطرناک ذہنیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

مضمون نگار رقمطراز ہے: ''حج ہاؤس ممبئی کے ایک پروگرام میں- جہاں میں موجود تھا- اس کے والد ڈاکٹر ''عبدالکریم نائک'' نے اعلان کیا کہ'' میرے بیٹے نے ایک ایسا طریقہ تلاش کیا ہے جس کی مدد سے ہر کوئی جو حافظ قرآن بننا چاہتا ہے، صرف تین/ دو ماہ کے اندر حافظِ قرآن بن سکتا ہے، انھوں نے مدارس پر الزام لگایا کہ مدارس والے سب مل کر بھی سو سال میں اس کام کو اتنا آسان نہ کر سکے، پھر انھوں نے سامعین سے پوچھا کہ بتایئے ان موجودہ مدارس کا کیا فائدہ ہے؟

آئی آر ایف (اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، ڈاکٹر ذاکر نائک کا ادارہ) نے یہی چیز ممبئی کے بڑے اردو اخبارات میں بھی چھپوائی کہ ایک عربی سائنس داں سے اس کو ایک ایسا طریقہ مل گیا ہے، جس کی بدولت طلبہ قرآن کریم کو صرف تین/ دو ماہ میں یاد کر سکتے ہیں، اس غیر معمولی ایجاد کی حقیقت جاننے اور مزید تفصیلات کے لیے ''ایسٹرن کریسنٹ'' میگزین نے اپنے دو ٹرینڈ صحافیوں کو بھیجا، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ سارا دعویٰ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے تھا، پورے قرآن کو ۹۰/۶۰ دنوں میں حفظ کرنے کا جو نیا طریقہ تھا اس کی حقیقت یہ تھی کہ استاذ قرآن کی ایک آیت کی تلاوت کرتا ہے اور طالبِ علم اس کے پیچھے پڑھتا ہے؛ اس طرح وہ پورے قرآن کو ختم کرتے ہیں اور طالب علم صرف تین/ دو ماہ میں قرآن کا حافظ ہو جاتا ہے؛ لیکن وہ طالبِ علم بغیر قرآن دیکھے چند آیات بھی نہیں سنا سکتا، ان تین/ دو مہینوں کی ٹریننگ کے بعد اس طالب علم کو اپنی یادداشت کو پختہ کرنے کے لیے مزید تین سال درکار ہیں۔

کیا آپ کو اس طریقہ میں غیر معمولی بات ملی؟ مدارس میں طلبہ دو/ تین سالوں میں حفظ کر لیتے ہیں، کچھ ذہین طلبہ ایک سال میں اور کچھ بہت ذہین طلبہ ایک سال سے بھی کم میں حفظ کر لیتے ہیں۔ ایسٹرن کریسنٹ کے ۲۰۰۸ء کے ایک شمارے میں اس ''نئی کھوج'' پر ایک مضمون موجود ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ ایسٹرن کریسنٹ، ممبئی، دسمبر ۲۰۱۰ء)

کے لیے خطرہ بن جاتی ہے)**سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی چند باتیں:**

(الف)وشنواور برہما کے ذریعے اللہ کو پکارنا جائز ہے

ڈاکٹر صاحب ایک پروگرام میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو ہندوؤں کے معبودان کے نام سے پکارنا جائز ہے، جیسے ''وشنو'' بمعنی رب اور ''برہما'' بمعنی ''خالق'' اس شرط کے ساتھ کہ ''وشنو'' کے بارے میں یہ عقیدہ نہ رکھے کہ اس کے چار ہاتھ ہیں اور پرندے پر سوار ہیں''۔(اسلام اور عالمی اخوت:۳۳،از ڈاکٹر ذاکر نائک)

حالاں کہ غیر عربی زبان کے اُنہی الفاظ سے اللہ کو پکارنا جائز ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوں، ان کے علاوہ سے جائز نہیں، پس ''وشنو'' اور ''برہما'' جو ہندوؤں کے شعار ہیں، ان سے اللہ کو پکارنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

(ب)اللہ کا کلام کونسا ہے، اسے جانچنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی سے گزارنا ضروری ہے

ڈاکٹر صاحب ایک پروگرام کے دوران کہتے ہیں:

''ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی مقدس کتاب ہی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ معلوم کریں کہ کون سی کتاب واقعی اللہ کا کلام ہے تو اسے آخری امتحان یعنی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے گزاریں، اگر وہ جدید سائنس کے مطابق ہو تو سمجھ لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کلام ہے'' (**الجواب علی ثلاثین جواباً علی أن ذاکر الهندي وأصحاب فکره منحرفون ضلالاً للشیخ یحی الحجوری**)

اس کلام سے ڈاکٹر صاحب کی گمراہ کن جرأت، کتاب اللہ کے تئیں ان کی فکری بے راہ روی، نیز جدید سائنس سے خطرناک حد تک مرعوبیت کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہر آن بدلنے والی سائنسی تحقیقات کو آسمانی کتابوں بالخصوص کلامِ الٰہی قرآنِ کریم کو پرکھنے کا معیار قرار دے دیا، جبکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی سب سے بڑی دلیل، اس کا اعجاز ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ قرآن میں چیلنج کیا ہے۔

(ج)فتویٰ دینے کا حق ہر کس وناکس کو ہے

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں: ''ہر کسی کے لیے فتویٰ دینا جائز ہے؛ اس لیے کہ فتویٰ کا

معنی رائے دینا ہے''۔(حوالۂ بالا)

یہاں ڈاکٹر صاحب فتویٰ دینے جیسے اہم کام-جس میں (علامہ ابن القیمؒ کے مطابق) مفتی احکام الٰہی کے بیان میں ربِّ کائنات کا ترجمان اور اس کی نیابت میں دستخط کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے "لم تصلح مرتبة التّبليغ بالرّواية والفتيا إلّا لمن اتّصف بالعلم والصّدق... وإذا كان منصب التّوقيع عن الملوك بالمحل الّذي لا ينكر فضله ولا يجهل قدره... فكيف بمنصب التّوقيع عن ربّ الأرض والسّماوات، فحقيق بمن أقيم في هذا المنصب أن يعدله عدته ويتأهب له أهبته وأن يعلم قدر المقام الّذي أقيم فيه" (إعلام الموقعين: ۱/۹۱)-کو رائے دینے کے ہلکے پھلکے لفظ سے تعبیر کر کے،صرف اپنے لیے ہی نہیں؛ بلکہ ہر کس و ناکس کے لیے اس کا جواز فراہم کر رہے ہیں، اور انھوں نے قرآنِ کریم کی آیت ﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (سورة النّحل: ۴۳) یعنی اگر تمھیں علم نہیں ہے تو اہل علم سے دریافت کرلو،اور حدیث نبوی "من أفتى بغير علم كان إثمه على من أفتاه" (۱) (یعنی جو آدمی بلا (صحیح) معلومات کے فتویٰ دے دیتا ہے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا) کو بالکل فراموش کر دیا۔

(۲) تفسیر قرآن میں من مانی تشریح یعنی تحریف معنوی:

قرآن کریم کی تفسیر کا معاملہ بڑا نازک ہے؛ اس لیے کہ مفسر آیتِ کریمہ سے، مرادِ خداوندی کی تعیین کرتا ہے کہ اللہ نے یہ معنی مراد لیا ہے؛ لہٰذا نا اہل آدمی کا اس وادی میں قدم رکھنا انتہائی خطرناک ہے، حدیث میں ہے: "من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ" (۲) (یعنی جو آدمی محض اپنی عقل سے تفسیر کرے تو اگرچہ وہ اتفاقاً درست معنی تک پہنچ جائے، پھر بھی اسے غلطی کرنے والا سمجھا جائے گا۔ایک دوسری روایت میں ہے: "من قال في القرآن برأيه فليتبوّأ مقعده من النّار" (۳). ترجمہ: جو آدمی قرآن میں اپنی رائے سے کہے (یعنی قرائن نیز روایات وغیرہ سے قطع

(۱) أخرجه أبو داوٗد، باب تفسير القرآن عن رسول اللّٰه–صلّى اللّٰه عليه وسلّم – رقم: ۳۶۵۷

(۲) أخرجه التّرمذي، باب الّذي يفسر القرآن برأيه، رقم: ۲۹۵۲.

(۳) أخرجه التّرمذي، باب الّذي يفسر القرآن برأيه، رقم: ۲۹۵۰.

نظر کر کے محض اپنی عقل وفہم کی مدد سے تفسیر کرے) وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔(أخرجه الترمذي: ۵/۱۹۹، رقم: ۲۹۵۱) اسی لیے مفسر کے لیے بہت سی شرائط ہیں، مثلاً: قرآن کی تمام آیتوں پر نظر، ذخیرۂ حدیث سے متعلق وسیع معلومات، عربی زبان اور اس کے قواعد: نحو، صرف اور اشتقاق اور فصاحت و بلاغت کا اچھا علم وغیرہ۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے، تو ان کے اندر مذکورہ شرائط میں سے ایک بھی شرط ضروری حد تک نہیں پائی جاتی، نہ وہ عربی زبان اور اس کے قواعد سے کما حقہ واقف ہیں اور نہ ذخیرۂ حدیث پر گہری نظر ہے اور نہ ہی فصاحت و بلاغت سے کوئی زیادہ واقفیت ہے۔(ذیل کی مثالوں سے یہ باتیں واضح ہو جائیں گی) جب کہ تفسیر میں گمراہی میں پڑنے کے جتنے اسباب ہیں مثلاً: حضور ﷺ اور صحابہ وتابعین سے منقول تفسیروں سے روگردانی، زمانے کے افکار سے مرعوبیت اور قرآنِ کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا وغیرہ، ڈاکٹر صاحب کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہیں؛ اسی لیے انھوں نے دسیوں آیتوں کو اپنی ناواقفیت سے مشقِ ستم بنایا، ذیل میں چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

(الف) آیت کریمہ: ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (نساء: ۳۴) کی تفسیر میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ لفظ ''قوّام'' کا معنی ایک درجہ اوپر ہونے کے ہیں؛ لیکن اصل ''قوام''، ''إقامة'' سے نکلا ہے، ''إقامة'' کا مطلب کھڑا ہونا ہے؛ لہٰذا ''إقامة'' کا مطلب ہوا کہ ایک درجہ ذمے داری میں اونچا ہے، نہ کہ فضیلت میں۔(خطبات ذاکر نائک: ۲۹۵، م: فرید بکڈپو دہلی)

ڈاکٹر صاحب نے مغربی نظریۂ مساوات کی تائید میں آیت قرآنی کی من مانی تفسیر کرتے ہوئے مردوں کے ایک درجہ فضیلت میں اونچا ہونے کی نفی کر دی، جب کہ امت کے بڑے بڑے مفسرین نے فضیلت میں اونچا ہونے کا معنی بیان کیا ہے؛ چناں چہ ''ابن کثیر'' نے ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کے تحت لکھا: أي الرّجل قيم على المرأة أي هو رئيسها وكبيرها والحاكم عليها، مؤدّبها إذا اعوجّت (۲/۲۹۲، بیروت) (یعنی مرد کی حیثیت اس کی بیوی کے سامنے حاکم اور سردار کی ہے، ضرورت محسوس ہونے پر شوہر بیوی کی مناسب تادیب بھی کر سکتا ہے۔ نیز آیت کریمہ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ کی تفسیر میں ''ابن کثیر'' نے لکھا ہے: وللرجال عليهن درجة أي

في الفضيلة في الخلق والمنزلة وطاعة الأمر والإنفاق والقيام بالمصالح والفضل في الدنيا والآخرة (۱/۶۱۰) یعنی شوہر بیوی سے فضیلت، رتبہ، اطاعت وغیرہ میں ایک درجہ اونچا ہے، نیز ڈاکٹر صاحب کی تفسیر حدیث نبوی، لو كنت آمر أحدًا أن يسجد لأحد، لأمرت النّساء أن يَّسْجُدْن لأزواجهن (۱) یعنی اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، کے خلاف ہے؛ اس لیے کہ اگر دونوں فضیلت میں برابر ہوتے اور شوہر کو عورت پر کوئی برتری حاصل نہ ہوتی تو حضور ﷺ عورتوں کو اپنے شوہروں کو سجدہ - جو انتہائی تعظیم ہے- کا حکم کیوں دیتے۔

(ب) ڈاکٹر صاحب، ایک سوال ''قرآن کریم میں ہے کہ کسی ماں کے رحم میں موجود بچے کی جنس صرف اللہ کو معلوم ہے؛ مگر اب سائنس کافی ترقی کر چکی ہے اور ہم آسانی سے الٹرا سونوگرافی کے ذریعے ''جنین'' کی تعیین کر سکتے ہیں، کیا یہ قرآنی آیت، میڈیکل سائنس کے خلاف نہیں ہے؟ کے جواب میں فرماتے ہیں:

.....''یہ صحیح ہے کہ قرآن کی اس آیت کے مختلف ترجمے اور تشریحات میں کہا گیا ہے کہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں موجود بچے کی جنس کیا ہے؟؛ مگر اس آیت کا عربی متن ملاحظہ کریں تو دیکھیں گے کہ انگلش کا لفظ (Sex) کا کوئی عربی متبادل استعمال نہیں ہوا، اصل میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ رحموں میں کیا ہے؟ اس کا علم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہے، کافی مفسرین کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اس کے یہ معنی مراد لیا ہے کہ اللہ ہی ماں کے رحم میں بچے کی جنس کو جانتا ہے، یہ درست نہیں، یہ آیت جنین کی جنس کی طرف اشارہ نہیں کرتی؛ بلکہ اس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ماں کے رحم میں موجود بچے کی فطرت کیسی ہوگی؟ وہ کیا اپنی ماں باپ کے لیے باعثِ رحمت ہوگا یا عذاب''؟ الخ (اسلام پر چالیس اعتراضات: ۱۳۰، از ڈاکٹر ذاکر نائک، م: اریب پبلیکیشنز، دہلی)

ڈاکٹر صاحب نے یہاں پر سائنسی تحقیق سے مرعوب ہوکر، اس سے پیدا ہونے والے سرسری اعتراض سے بچنے کے لیے، قرآن کی دوسری آیت اور صحابہ وتابعین سے منقول تفسیر کو پس پشت ڈالتے ہوئے، ایک معروف معنی کا انکار کر دیا اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید اور ان کی تغلیط کر ڈالی۔

(۱) أخرجه أبو داوٗد، باب في حقّ الزّوج على المرأة، رقم: ۲۱۴۰.

ڈاکٹر صاحب نے جو معنی بیان کیا ہے 'ما' موصولہ کے عموم میں آ سکتا ہے اور بہت سے مفسرین نے ایک احتمال کے طور پر، پہلے معنی کے ضمن میں اس کا بھی ذکر کیا ہے؛ لیکن دوسرے معنی کا انکار کر دینا قطعاً صحیح نہیں؛ بلکہ ڈاکٹر صاحب کی قلت تدبر اور تفسیر میں صحابہ اور تابعین کے اقوال سے روگردانی کی واضح دلیل ہے؛ اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس معنی کی نفی کی ہے، اسی کی طرف سورۂ رعد کی آیت: ﴿اللّٰـهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثَى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ﴾ (الرعد:۸) ''یعنی اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے کہ جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے'' اشارہ کر رہی ہے، نیز مشہور تابعی اور تفسیر کے امام حضرت قتادہؒ سے بھی یہی معنی مروی ہے، چنانچہ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ''فلا يعلم ما في الأرحام أذكر أم أنثى ''الخ (تفسیر ابن کثیر:۶/۳۵۵، بیروت) یعنی رحم مادر میں نر ہے یا مادہ اس کا قطعی علم سوائے خدا کے کسی اور کو نہیں، اسی طرح ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر (۶/۳۵۵) میں، علامہ نسفیؒ نے تفسیر مدارک (۳/۱۱۶) میں اور شوکانیؒ نے فتح القدیر (۵/ ۴۹۸) میں، مذکورہ آیت کا یہی معنی بیان فرمایا؛ لیکن ڈاکٹر صاحب ان اکابر مفسرین کے بیان کردہ معنی کو غلط ٹھہرا کر، اپنے بیان کردہ معنی کو قطعی سمجھ کر اسی پر مصر ہیں۔

صحیح جواب: آیتِ کریمہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کے لیے علمِ غیب کو ثابت کرنا ہے اور علم غیب درحقیقت اس یقینی علم کو کہا جاتا ہے جو کسی سبب ظاہری کے بغیر براہِ راست، کسی آلے کے بغیر حاصل ہو، نیز وہ کسی زمانے کے ساتھ مقید نہ ہو، طبی آلات سے ڈاکٹروں کو حاصل ہونے والا علم نہ یقینی ہوتا ہے اور نہ ہی بلا واسطہ؛ بلکہ وہ محض ظنی ہے اور آلات کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے (نطفہ کے رحم مادر میں داخل ہونے کے ایک مقررہ مدت کے بعد؛ یعنی بچہ کی تصویر بننے کے بعد، لڑکا یا لڑکی ہونا معلوم ہوتا ہے)؛ لہٰذا الٹراسونوگرافی کے ذریعے حاصل ہونے والے اس ظنی علم سے قرآنی آیت پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوگا۔

(ج) ڈاکٹر صاحب آیت کریمہ: ﴿يٰـٓاَيُّهَـا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا﴾ (الممتحنة: ۱۲) کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''یہاں لفظ ''بیعت'' استعمال ہوا ہے اور بیعت کے لفظ میں ہمارے آج کل کے الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے؛ کیوں کہ حضور ﷺ اللہ کے رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی تھے اور بیعت

سے مراد اُنھیں سر براہ حکومت تسلیم کرنا تھا، اسلام نے اسی دور میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی تفویض کر دیا تھا'' (اسلام میں خواتین کے حقوق: ۵۰ از ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب)

یہاں بھی ڈاکٹر صاحب آیت کی غلط تشریح کرتے ہوے، اس سے عورت کے ووٹ دینے کا حق ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ عورتوں کا حضور ﷺ کی خدمت میں آکر بیعت کرنا، موجودہ دور کے جمہوریت کے طرزِ انتخاب کی ہی قدیم شکل ہے، جب کہ جمہوریت کی حقیقت سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تشریح بالکل واقع کے خلاف ہے اور تفسیر قرآنی میں اپنی عقل کا بیجا استعمال ہے؛ اس لیے کہ موجودہ جمہوریت کے مطابق سب کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ سر براہ چننے کے لیے اپنی رائے دیں اگر کسی شخص پر کثرت واتفاقِ رائے نہ ہو تو وہ سر براہ نہ بن سکے گا، اگر حضور ﷺ کا بیعت کرنا درحقیقت ووٹ لینا تھا، تو کیا ان صحابیات کو اختیار تھا کہ حضور ﷺ کی سر براہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیں؟

(د) سورۂ مریم کی آیت: ﴿ يٰۤـاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَـغِيًّـا ﴾ (مریم: ۲۸) پر ناسمجھی سے کیا جانے والا معروف اشکال -حضرت مریم رضی اللہ عنہا، حضرت ہارون کی بہن نہیں تھیں اور دونوں کے زمانے میں تقریباً ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے- کے جواب میں فرماتے ہیں:

''عیسائی مشنری یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کو ''یسوع مسیح'' کی والدہ (Mary) مریم اور ہارون کی بہن مریم میں فرق کا پتہ نہیں تھا، حالاں کہ عربی میں ''اخت'' کے معنی اولاد کے بھی ہیں؛ اس لیے لوگوں نے مریم سے کہا کہ اے ہارون کی اولاد اور اصل اس سے مراد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد ہی ہے'' (اسلام پر چالیس اعتراضات، از: ڈاکٹر ذاکر نائک)

ڈاکٹر صاحب کی، احادیث اور لغت سے نادانی اور ناواقفیت پر مبنی، اس تحقیق پر تبصرے کے طور پر مسلم شریف کی حدیث ہی کافی ہے، صحیح مسلم میں ہے: **عن المغيرة بن شعبة قال: لما قدمت نجران سألوني، فقالوا: إنكم تقرأون يا أخت هارون وموسى قبل عيسى بكذا وكذا، فلما قدمت على رسول الله – صلّى الله عليه وسلّم– سألته عن ذلك فقال: إنّهم كان يسمّون بأنبيائهم والصّالحين قبلهم.** (۱)، ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ بیان

(۱) أخرجه مسلم، باب النّهي عن التّكني بأبى القاسم، رقم: ۲۱۳۷.

کرتے ہیں کہ جب میں ''نجران'' آیا تو (وہاں کے عیسائی لوگوں نے) مجھ سے پوچھا کہ: تم لوگ یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ (یعنی اے ہارون کی بہن) پڑھتے ہو، جب کہ حضرت موسیٰ، حضرتِ عیسیٰ سے سینکڑوں سال پہلے گذر گئے (یعنی موسیٰ اور ہارون کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے ہے تو مریم جو حضرت عیسیٰ کی والدہ ہیں وہ ہارون کی بہن کیسے بن سکتی ہیں) حضرت مغیرہ فرماتے ہیں: میں جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو، آپ سے اس سے متعلق دریافت کیا، آپ نے جواب میں فرمایا کہ: وہ لوگ اپنے پیشرو نبیوں اور نیک لوگوں کے نام پر اپنا نام رکھا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کی وضاحت آج سے چودہ سو سال پہلے ہی کردی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم، حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون کی بہن نہ تھیں؛ بلکہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا، اور یہ لوگ اپنے انبیاء اور گزشتہ برگزیدہ شخصیات کے ناموں پر اپنا نام رکھا کرتے تھے، اس سے پتہ چلا کہ نہ یہ کوئی نیا اعتراض ہے اور نہ ہی اپنی جانب سے جواب گھڑنے کی کوئی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تفسیر سے متعلق احادیث سے بے خبری کس قدر ہے کہ ذخیرۂ احادیث وتفسیر سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کے بجائے، خود ساختہ تاویل کررہے ہیں۔

(ھ) ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب آیت کریمہ: ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾ (النازعات: ۳۰) کے متعلق کہتے ہیں:

''یہاں انڈے کے لیے استعمال کیا جانے والا عربی لفظ ''دحٰهَا'' ہے، جس کا مطلب شتر مرغ کا انڈا، شتر مرغ کا انڈا زمین کی شکل سے مماثلت رکھتا ہے؛ لہٰذا قرآنِ کریم مکمل درستگی سے زمین کی شکل کی وضاحت کرتا ہے، حالاں کہ اس وقت جب قرآن اتارا گیا یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین چپٹی (Flat) ہے''۔ (خطبات ذاکر نائک، قرآن اور جدید سائنس: ۴۷-۴۳)

یہاں پر ڈاکٹر صاحب سائنسی نظریہ سے مرعوب ہونے، نیز قرآنِ کریم کے موضوع (جو کہ توحید اور رسالت ہے اور باقی طبیعیات وغیرہ کی باتیں ضمناً ہیں) کو نہ سمجھنے کی وجہ سے، زمین کی ہیئت کی تحقیق کرنے میں، آیت کریمہ سے غلط استدلال کرتے ہوئے آیت کی من مانی تشریح کررہے ہیں؛ اس لیے کہ 'دحو' کا لفظ و مادہ عربی زبان میں پھیلانے اور پھیلاؤ کا مفہوم رکھتا ہے،

اسی کے مطابق 'دحٰھا' کی تفسیر وترجمہ زمین کو پھیلانے سے، اور اس میں موجود اشیاء کے پیدا کرنے سے کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر) یہ لفظ و مادّہ انڈے کے معنی میں نہیں آتا۔

(۳) احادیث نبویہ سے ناواقفیت:

ذخیرۂ حدیث سے ناواقفیت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے بہت سی جگہوں پر صحیح احادیث کے خلاف مسائل بتلائے، نیز کتنے ہی مقامات پر کسی مسئلے پر متعدد احادیث ہونے کے باوجود یہ کہہ ڈالا کہ اس باب میں کوئی دلیل نہیں، ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی احادیث سے تنگ دامنی یا دانستہ چشم پوشی کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

(الف) عورتوں کے لیے حالتِ حیض میں قرآن پڑھنے کا جواز

ایک پروگرام ''گفتگو'' میں عورت کے خاص ایام کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''قرآن وحدیث میں نماز کی رخصت ہے؛ لیکن کسی حدیث میں نہیں کہ وہ قرآن نہیں پڑھ سکتی''۔

حالاں کہ ترمذی شریف میں صریح حدیث ہے: **''لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئًا من القرآن''**(۱) یعنی جنبی اور حائضہ قرآن نہ پڑھیں۔

آپ غور کیجیے کہ ڈاکٹر صاحب نے صحیح وصریح حدیث کے موجود ہونے کے باوجود، دعویٰ ہمہ دانی کرتے ہوے اس کا انکار کر دیا۔

(ب) خون سے وضو ٹوٹنے پر، احناف کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے

ڈاکٹر صاحب ایک تقریر میں خون سے وضو ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کے موضوع پر بات کرتے ہوے کہتے ہیں:

''بعض علمائے کرام، خصوصًا فقہِ حنفی سے متعلق علمائے کرام کے خیال میں خون بہنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، نماز کے دوران خون بہہ جانے کی صورت میں کس کو کیا کرنا چاہیے، اس سوال کے جواب میں ان کا فتویٰ (احناف کا فتویٰ) بہت طویل ہے تاہم ان کے اس نقطۂ نظر کی تائید میں بہ ظاہر کوئی ثبوت نہیں ہے''۔ (حقیقت ذاکر نائک: ۲۱۴م: مکتبہ مدنیہ دیوبند)

یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے فقہِ حنفی سے متعلق علماء پر الزام لگا ڈالا کہ وہ بلا ثبوت وضو ٹوٹنے کی

(۱) أخرجه الترمذي، باب الجنب والحائض أنّهما لا يقرآن القرآن، رقم: ۱۳۱.

بات کہتے ہیں، حالاں کہ خون سے وضوٹوٹنے کے سلسلے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں، نیز صحابۂ کرام کا تعامل بھی اسی پر رہا۔ ذیل میں چند روایتیں ملاحظہ فرمائیں:

(ا) أخرج البخاري عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: جاء ت فاطمة بنت أبي حبيش إلى النّبي – صلّى الله عليه وسلّم– فقالت: يا رسول الله! إنّي امرأة أستحاض فلا أطهر، أفأدع الصّلاة؟ قال: لا، إنّما ذلك عرق وليس بحيض، فإذا أقبلت حيضتك فدعي الصَّلاةَ وإذا أدبَرتْ فاغسلِي عنك الدَّم قال هشام: قال أبي ثمّ توضئي لكل صلاة حتىّ يجيئ ذلك الوقت(۱).

(۲) إذا رعف أحدكم في صلاته فلينصرف فليغسل عنه الدّم ثمّ ليعدوضوءه ويستقبل صلاته. أخرجه الدّارقطني (۲)یعنی دورانِ نماز اگر کسی کی نکسیر پھوٹ جائے تو اسے چاہیے کہ خون کو دھولے اور وضو دہرائے۔

(۳) عن زيد بن ثابت –رضي الله عنه–: الوضوء من كل دم سائل. أخرجه ابن عدي في الكامل(۳)۔یعنی خون بہنے سے وضولازم ہوجاتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ بہت سی روایات کے باوجود، ڈاکٹر صاحب نے، اپنی ناواقفیت کا اظہار نہ کرکے مجتہدانہ دعویٰ کردیا کہ بہ ظاہر خون سے وضوٹوٹنے پر کوئی ثبوت نہیں ہے۔

(ج)مرد وعورت کی نماز میں فرق کرنا جائز نہیں

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب مرد اور عورت کی نماز میں فرق کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

’’کہیں بھی ایک صحیح ومستند حدیث نہیں ملتی، جس میں عورت کے لیے مرد سے علاحدہ طریقے کے مطابق نماز ادا کرنے کا حکم ہو، اس کے بجائے صحیح بخاری کی روایت ہے، حضرت ’’ام درداء‘‘ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ التحیات میں عورتوں کو مردوں کی طرح بیٹھنے کا حکم ہے‘‘

یہاں ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں سراسر غلط کہی ہیں:

(الف) نماز میں مرد وعورت کے درمیان فرق کے سلسلے میں کوئی حدیث نہیں۔

(ا) أخرجه البخاري، باب غسل الدّم، رقم: ۲۲۸.

(۲) أخرجه الدّار قطني، باب في الوضوء من الخارج من البدن، رقم: ۵۵۲.

(۳) نصب الرأيه، ا/۶۷، ناشر: دارالحديث، مصر.

(ب) عورتوں کو مردوں کی طرح بیٹھنے کا حکم ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پہلی بات کہہ کر ان تمام احادیث کا انکار کر دیا، جن میں مردوں اور عورتوں کی نماز کے درمیان فرق کا بیان موجود ہے۔ ذیل میں چند روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) أخرج البخاري عن النّبي – صلى اللّٰه عليه وسلّم– أنه قال: يا أيّها النّاس! مالكم حين نابكم شيء في الصّلاة، أخذتم في التصفيق، إنّما التّصفيق للنّساء (۱)

ترجمہ: بخاری کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے (ایک مرتبہ) ارشاد فرمایا: لوگو! نماز میں اگر تمہیں کوئی چیز پیش آتی ہے تو تم ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر کیوں مارنے لگتے ہو؟ ایک ہاتھ کو دوسرے پر مارنے کا حکم تو عورتوں کے لیے ہے۔

(۲) عن وائل بن حجر قال لي رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: يا وائل بن حجر! إذا صلّيت فاجْعل يَديك حذاء أذنيك والمرأة تجعل يديها حذاء ثدييها. (۲)

ترجمہ: طبرانی کی معجم کبیر میں ہے: حضرت وائل بن حجر روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں کانوں کی لو تک اٹھاؤ اور عورت اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے تک اٹھائے۔

(۳) عن يزيد بن أبي حبيب أن رسول اللّٰه – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – مرّ على امرأتين تُصلّيان فقال: إذا سجدتما فضُمَّا بعض اللّحم إلى الأرض؛ فإنّ المرأة ليست في ذلك كالرجل. (۳)

ابوداؤد میں یزید بن حبیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر دو ایسی عورتوں کے پاس سے ہوا، جو نماز پڑھ رہی تھیں، تو حضور ﷺ نے (ان عورتوں سے فرمایا) جب تم سجدے میں جاؤ، تو کچھ گوشت یعنی سرینیں زمین سے ملا لو؛ اس لیے کہ عورت اس بارے میں مرد کی طرح نہیں ہے۔

(۱) البخاري، رقم: ۱۲۳۴.

(۲) المعجم الكبير للطّبراني، رقم: ۲۸.

(۳) السّنن الكبرىٰ للبيهقي، رقم: ۳۲۲۳، باب ما يستحب للمرأة من ترك التّجافي في الرّكوع والسّجود.

(۴) سُئل ابن عمر كيف كن النساء يصلين على عهد رسول الله –صلى الله عليه وسلّم– قال: كُنّ يتربّعن ثُم أُمِرْن أن يَحْتَفِزْن. (۱)

ان روایات میں مردوں اور عورتوں کی نماز میں مختلف طرح سے فرق کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ فقہاء نے اور بھی فرق بیان کیے ہیں، اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ اور جہاں تک دوسری بات ہے یعنی بخاری شریف میں عورتوں کو مردوں کی طرح بیٹھنے کا حکم ہے، تو یہ ایک غلط انتساب ہے، حضرت ام الدرداء کی جس روایت کا ڈاکٹر ذاکر صاحب نے حوالہ دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''و كانت أمّ الدّرداء تجلس في صلاتها جلسة الرّجل و كانت فقيهةً'' (بخاری شریف) (۲)

ترجمہ: ام درداء رضی اللہ عنہا اپنی نماز میں مرد کی طرح بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہہ تھیں۔

اس میں کہیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ ایک صحابیہ کا عمل ہے، جس کا ذکر کر کے امام بخاری نے اشارہ بھی کر دیا کہ وہ خود فقیہہ تھیں، وہ اپنے اجتہاد سے ایسا کرتی تھیں، نیز امام بخاریؒ نے اسے تعلیقاً ذکر کیا ہے، سند ذکر نہیں کی۔

(۴) ائمہ مجتہدین کی اتباع سے فرار اور مسائلِ فقہیہ میں سوادِ اعظم کی راہ سے نمایاں انحراف:

ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب اپنی تحریرات اور تقریرات کی روشنی میں کسی امام کے متبع معلوم نہیں ہوتے؛ بلکہ اباحیت، جدت پسندی نیز غیر مقلدیت اور فکری آزادی کے شکار ہیں، صرف یہی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کسی متعین امام کی تقلید نہیں کرتے؛ بلکہ ائمہ کی تقلید کرنے والے مخلص عوام کو عدمِ تقلید کی روش اپنانے کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے بیان کردہ مسائل میں کہیں کسی امام کا، کہیں کسی امام کا قول واستنباط کردہ حکم اپنی طرف منسوب کر کے نقل کرتے ہیں، اور کہیں خود مجتہدانہ انداز پر مسئلے بیان کرنے لگتے ہیں، جب کہ ان کو مسائل نقل کرنے میں اس متعین امام کا نام لینا چاہیے، جنھوں نے اس مسئلے کا استنباط کیا ہے؛ تاکہ سننے والے کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ قرآن وسنت سے صرف یہی ثابت ہے،

(۱) مسند أبي حنيفة، رقم: ۳۷، ط: الآداب، مصر.
(۲) البخاري، باب سنّة الجلوس في التّشهد، رقم: ۷۸۸.

اس کے علاوہ جو دوسری باتیں لوگوں کے عمل میں ہیں، چاہے وہ قرآن وحدیث سے ثابت اور ائمہ مجتہدین کا قول کیوں نہ ہو: غلط ہے۔ ذیل کی مثالوں سے مذکورہ باتوں کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا۔

(الف) بلا وضو قرآن چھونا جائز ہے

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:

''بلا وضو قرآنِ کریم چھونے کی اجازت ہونی چاہیے'' الخ

حالاں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول آیتِ کریمہ ﴿لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ (واقعہ:۷۹) نیز تمام ائمہ مجتہدین کے خلاف ہے۔ یہ تو غیر مقلدین کا مذہب ہے۔

(ب) خطبۂ جمعہ عربی زبان کے بجائے مقامی زبان میں ہونا چاہیے

ایک موقعہ پر خطبۂ جمعہ سے متعلق ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں جمعہ کا خطبہ مقامی علاقائی اور مادری زبانوں میں دیے جانے کا اہتمام کیا جائے تا کہ..'' الخ

حالاں کہ حضور ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک خطبۂ جمعہ عربی زبان میں دینے پر توارث چلا آرہا ہے، آج ڈاکٹر صاحب یہ دعوت دے رہے ہیں کہ خطبہ مقامی زبان میں ہونا چاہیے؛ تا کہ لوگ سمجھ سکیں، جب کہ یہ مصلحت (غیر عربی جاننے والوں کا سمجھنا) حضور ﷺ کے زمانے میں بھی موجود تھی؛ اس لیے کہ حضور ﷺ کے خطبے میں عرب کے علاوہ عجم کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے؛ لیکن حضور ﷺ نے ہمیشہ عربی زبان میں خطبہ دیا، کسی دوسری زبان میں خطبہ نہیں دیا، اور نہ ہی بعد میں اس کا ترجمہ کروایا، اسی طرح صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ان کے متبعین عرب سے نکل کر عجم میں گئے، مشرق ومغرب میں اسلام پھیلایا؛ لیکن ہر جگہ ہمیشہ خطبۂ جمعہ عربی ہی میں دیا، حالاں کہ ان حضرات کو تبلیغ دین کی ضرورت آج سے زیادہ تھی، جب کہ بعض صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم عجمیوں کی زبان خوب جانتے تھے؛ لیکن پھر بھی خطبۂ جمعہ عربی ہی میں دیا کرتے تھے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ خلفائے راشدین، صحابۂ کرام اور تابعین عظام کا تعامل ومواظبت اور ساری امت کا توارث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خطبہ عربی زبان ہی میں ضروری ہے، یہاں تک کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی صحت کے لیے خطبہ کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے، اگر چہ پورا

مجمع عجمیوں کا ہو،عربی کوئی نہ جانتا ہواور اگر عربی میں خطبہ پڑھنے والا مجمع میں کوئی نہ ہوتو لوگوں پر ظہر کی ادائیگی لازم ہوگی، جمعہ ساقط ہوجائے گا "**ولو كان الجماعة عجمًا لا يعرفون العربيّة، فلو كان ليس فيهم من يُحسن الإتيان بالخطبة عربية لم يلزمهم جمعة**" (حاشية الدسوقي على الشرح الكبير: ۱/۳۷۸،ناشر دار الفكر، بيروت) نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: خطبہ کا خاص عربی زبان ہی میں ہونا ضروری ہے کہ تمام مسلمانوں کا مشرق ومغرب میں ہمیشہ اسی پرعمل رہا ہے۔(مصفی شرح موطا:۱۵۲،م:مطبع فاروق دہلی)

(ج) تین طلاق سے ایک ہی طلاق ہونی چاہیے

ڈاکٹر ذاکر صاحب فرماتے ہیں:

"تین طلاق کے لیے اتنی شرائط ہیں،جن کا پورا ہونا ناممکن ہے،سعودیہ کے تین سوفتوے موجود ہیں؛اس لیے طلاق ایک ہے،آج کے حالات کے مطابق ایک ہونی چاہیے" (خطبات ذاکر نائک بحوالہ حقیقت ذاکر نائک:۳۳۱)

حالاں کہ صحابۂ کرام، تابعین عظام ائمہ اربعہ اور جمہور امت، نیز موجودہ دور کے سعودیہ عربیہ کے تمام معتبر علما کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاق سے تین ہی طلاق واقع ہوتی ہیں ایک نہیں۔اس مسئلے میں پوری تاریخ میں کسی معتبر عالم کا اختلاف نہیں،سوائے علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم کے؛لیکن پوری امت (جن میں بڑے بڑے تابعین، چاروں ائمہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، اور امام احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے مقابلے میں اِن دوحضرات کی رائے قطعاً قابلِ اتباع نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایسے اجماعی حکم کے خلاف مسئلہ بیان کر کے امت کو گمراہ کررہے ہیں۔ یہ حکم یعنی تین طلاقوں سے تین ہی طلاق کا واقع ہونا قرآن کریم، بے شمار احادیث اور صحابۂ کرام کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہے،چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) **وقال الليث عن نافع كان ابن عمر إذا سئل عَمَّنْ طَلَّقَ ثَلاَثًا قال لو طَلَّقْتَ مَرَّةً أو مَرَّتين (لكان لك الرجعة) فإن النبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم أَمَرَني بهٰذا (أي بالمراجعة) فإن طلّقها ثلاثاً حرمت حتى تنكح زوجًا غيره** (بخاری شریف)(۱)

(۱) البخاري، باب بلا عنوان، رقم: ۵۳۳۱.

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب اس شخص کے متعلق فتویٰ دریافت کیا جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوں، تو فرماتے اگر تو نے ایک یا دو طلاق دی ہوتی (تو رجوع کرسکتا تھا) اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ نے مجھ کو اس کا (یعنی رجعت کا) حکم دیا تھا، اور اگر تین طلاق دیدے تو عورت حرام ہوجائے گی یہاں تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

(۲) عن مجاهد قال كنت عند ابن عباس فجاءه رجل فقال: إنه طلّق امرأته ثلاثًا، قال: فسكت حتى ظننتُ أنه رادُّها إليه، ثم قال: ينطلق أحدكم فيركب الحموقة ثمّ يقول يا ابن عباس يا ابن عباس فإن الله عزّ وجل قال ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا﴾ عصيتَ ربّك وبانتْ منك امرأتُك. (أخرجه أبوداؤد)(۱)

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس تھا کہ ایک شخص آیا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی، فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس خاموش رہے، میں سمجھا کہ وہ اس کی بیوی کو لوٹا دیں گے (رجعت کا حکم دیں گے) مگر فرمایا: تم میں سے کوئی شخص حماقت کر بیٹھتا ہے (تین طلاق دے دیتا ہے) پھر چلاتا ہے ابن عباس! ابن عباس!۔ تو (سنو!) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے راہ نکالتے ہیں۔ تم نے تو اپنے رب کی نافرمانی کی (تین طلاق دے دی) اس لیے تمہاری بیوی تم سے جدا ہوگئی۔

(۳) وعن مالك بلغه: أن رجلاً قال لعبد اللّٰه بن عباس: إنّي طَلّقتُ امرأتي مائة تطليقة، فماذا ترى عليَّ ؟ فقال ابن عباس: طُلِّقَتْ منك بثلاث، وسَبْعٌ وتسعون اتَّخَذْتَ بها آياتِ اللّٰه هُزُوا. (۲)

حضرت امام مالکؒ کو یہ روایت پہنچی کہ ایک آدمی نے عبداللہ ابن عباسؓ سے دریافت کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدیں، آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ تو ابن عباسؓ نے جواب دیا: (ان میں سے) تین طلاقیں تیری بیوی پر پڑ گئیں، اور ستانوے طلاقوں سے تو نے اللہ کی آیتوں کا کھلواڑ کیا۔

(۱) ابوداؤد، باب في الطّلاق على الهزل، رقم: ۱۸۸۲.

(۲) موطأ الإمام مالك، باب ما جاء في البقة، رقم: ۱۱۲۸.

(۴) عن مالك بلغه: أن رجلاً جاء إلى عبدالله بن مسعود فقال: إنّي طلقتُ امرأتي ثمانيَ تطليقات، قال ابن مسعود، فماذا قيل لك؟ قال: قيل لي: إنها قد بَانَتْ مني، فقال ابن مسعودٍ صدقوا. (الحديث)(۱)

حضرت امام مالکؒ کو یہ روایت پہنچی کہ ایک آدمی عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس آیا، اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے پوچھا کہ لوگوں نے تمہیں کیا کہا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھ سے کہا گیا کہ بیوی بائنہ ہوگئی۔ تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: سچ کہا۔ (یعنی تین طلاقیں پڑ گئیں)

(۵) حدثنا علی بن محمد بن عبید الحافظ نا محمد بن شاذان الجوهری نا معلّی بن منصور نا شعیب بن رزیق أن عطاء الخراسانی حدّثهم عن الحسن قال نا عبدالله بن عمر أنّه طلّق امرأتَه تطليقةً وهی حائض ثمّ أراد أن يتبعها بتطليقتين أخريين عند القرأين فبلغ ذلك رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فقال يا ابن عمر ما هكذا أمرك الله إنك قد أخطأتَ السنَّةَ. والسنَّة أن تستقبل الطهر فيطلق لكل قرء قال فأمرنی رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فراجعتها ثم قال إذا هی طهرت فطلِّق عند ذلك أو أمسِك فقلتُ يا رسول الله أرأيتَ لو أنّي طلقتها ثلثاً أكان يحلّ لي أن أراجعها قال لا، كانت تبين منك وتكون معصية. (۲)

حضرت حسن کا بیان ہے کہ ہم سے حضرت ابن عمرؓ نے بیان فرمایا کہ انھوں نے اپنی اہلیہ کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دے دی، پھر ارادہ کیا کہ دو طہروں میں بقیہ دو طلاقیں دیدیں گے، حضور اقدس ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا اے ابن عمر! اس طرح اللہ نے تم کو حکم نہیں دیا ہے، تم نے سنت طریقہ کے خلاف کیا (کہ حالت حیض میں طلاق دیدی) سنت طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کیا جائے اور ہر طہر میں ایک طلاق دی جائے، اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے مجھے رجوع کرنے کا حکم فرمایا چنانچہ میں نے رجوع کرلیا پھر فرمایا: جب وہ پاک ہوجاوے تو تم کو اختیار ہے

(۱) موطأ الامام مالك، باب ما جاء في البقة، رقم: ۱۱۲۹.
(۲) السّنن للدّارقطني، كتاب الطّلاق والخلع والإيلاء وغيره، رقم: ۳۹۲۹.

چاہو تو طلاق دے دینا یا اس کو روکے رکھنا، حضرت ابن عمر فرماتے ہیں پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں نے تین طلاقیں دی ہوتیں تو کیا میرے لیے رجوع کرنا جائز ہوتا؟ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں، اس صورت میں بیوی تم سے جدا ہو جاتی اور تمہارا یہ فعل (تین طلاقیں ایک ساتھ دینا) گناہ ہوتا۔

آپ نے دیکھا کہ مذکورہ بالا حدیثوں میں تین طلاق سے تین ہی طلاق کے واقع ہونے کا حکم ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی روایتیں صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہیں کہ تین طلاقوں سے تین ہی طلاق واقع ہوں گی، ایک نہیں۔

نوٹ: ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب نے اپنی تقریر میں سعودیہ کے تین سو علما کے فتوؤں کا حوالہ دیا، پھر اپنی رائے بھی پیش کی؛ لیکن یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ کون سے علماء ہیں، جب کہ سعودی عرب کی تحقیقاتِ علمیہ کے موقر مفتیان نے تین طلاق سے تین ہی طلاق کا فتویٰ دیا ہے۔ قرارداد اس طرح ہے:

"بعد الاطلاع على البحث المقدم من الأمانة العامة لهيئة كبار العلماء والمعد من قبل لجنة الدّائمة للبحوث والإفتاء في موضوع "الطّلاق الثّلاث بلفظ واحد" وبعد دراسة المسألة وتداول الرّأي واستعراض الأقوال الّتي قيلت فيها ومناقشة ما على كلّ قول من إيراد توصل المجلس بأكثريته إلى اختيار القول بوقوع الطّلاق الثّلاث بلفظ واحد ثلاثاً.... إلخ (مجلة البحوث الإسلامية، المجلد الأوّل، العدد الثّالث سنة ١٣٩٧هـ)

"ایک ہی لفظ کے ذریعے تین طلاق کے وقوع سے متعلق، لجنة الدّائمة للبحوث والإفتاء (مستقل کمیٹی برائے تحقیقات وافتاء) کی طرف سے تیار کردہ اور ہیئۃ کبار العلماء (اکابر علماء کا بورڈ) کی نظامت عمومی کے جانب سے پیش کردہ مقالہ پر مطلع ہونے اور مسئلۂ زیر بحث پر غور وفکر کر کے اور اس سلسلے میں پیش کی گئی رایوں اور نقاط نظر کا جائزہ لینے نیز ہر قول پر وارد ہونے والے اعتراض پر مناقشہ کے بعد مجلس نے اپنی اکثریت سے - لفظ واحد سے تین طلاق دینے پر تین ہی طلاق واقع ہونے کے قول کو اختیار کیا"

(د) ڈاکٹر صاحب ایک پروگرام "گفتگو" میں تقریر کرتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں کہ:

''مسلمانوں کو ایسا طریقہ اپنانا چاہیے کہ پوری دنیا میں ایک دن عید ہو سکے''۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے ارشادِ نبوی ''صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته'' (۱) ''یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو'' کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقلِ سلیم کے بھی خلاف ہے؛ اس لیے کہ وحدتِ عید کا مسئلہ اصل میں اس بنیاد سے پیدا ہوتا ہے کہ عید کو ایک تہوار یا ملکی تقریب یا قومی ڈے قرار دیا جائے؛ مگر یہ انتہائی غلط سوچ ہے؛ اس لیے کہ ہماری عیدین، رمضان اور محرم کوئی تہوار نہیں؛ بلکہ سب کی سب عبادات ہیں، نیز اوقات کا ہر ملک ہر خطہ میں وہاں کے افق کے اعتبار سے مختلف ہونا لازمی ہے، ہم ''ہندوستان'' میں جس وقت عصر کی نماز پڑھتے ہیں، اس وقت ''واشنگٹن'' میں صبح ہوتی ہے، جس وقت ہم ''ہندوستان'' میں ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں، اس وقت بعض ممالک میں مغرب کی نماز ہو چکی ہوتی ہے، نیز ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ملک میں جمعہ کا دن ہوتا ہے تو دوسرے میں ابھی جمعرات ہے اور تیسرے میں سنیچر کا دن شروع ہو چکا ہے، ان حالات میں کسی ایک دن میں پوری دنیا والوں کے عید منانے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔

الغرض ان تنقیدات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب بہت سے مسائل میں اہل سنت والجماعت کے عقائد سے ہٹے ہوئے ہیں، قرآن وحدیث کی تشریح میں لغتِ عرب اور سلف سے منقول تفاسیر کو نظر انداز کر کے عقل خام کی مدد سے تفسیر کر کے، تحریف معنوی کے شکار ہیں، نیز وہ (ڈاکٹر صاحب) علوم شرعیہ اور مقاصد شریعت سے گہری واقفیت نہ ہونے کے باوجود، کسی امام کی تقلید نہیں کرتے؛ بلکہ اُلٹے وہ ائمہ مجتہدین پر تنقید کرتے ہیں؛ اس لیے ان (ڈاکٹر صاحب) کی باتیں ہرگز قابل اعتبار نہیں، ان کے پروگرام کو دیکھنا، ان کے بیانات سننا اور بلا تحقیق ان پر عمل کرنا سخت مضر ہے۔ اور چونکہ واقعی تحقیق کرنا ہر کس وناکس کی بات نہیں؛ اس لیے ان کے پروگرام سے عامۃ المسلمین کو احتراز کرنا ضروری ہے۔ نیز ہر مؤمن کو یہ بات ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ دین کا معاملہ، جو ایک حساس معاملہ ہے، انسان دین کی باتیں سنتا اور ان پر عمل کرتا ہے، صرف آخرت میں نجات پانے کے لیے، اس میں صرف نئی نئی تحقیق، برجستہ جوابات، حوالوں کی کثرت اور لوگوں میں بہ ظاہر مقبولیت دیکھ کر، بلا تحقیق کسی کی بات پر ہرگز عمل نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ انسان پر ضروری ہے کہ وہ غور کر لے کہ وہ آدمی دینی علوم میں کیا اہلیت رکھتا

(۱) أخرجه الترمذي، باب لا تقدموا الشهر بصوم، رقم: ۶۸۴.

ہے؟ کن اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے؟ کس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی، اس کی وضع قطع، لباس، ہیئت دیگر علما وصلحا سے میل کھاتی ہے یا نہیں؟ نیز معاصر قابل اعتماد علما اور مشائخ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اسی طرح یہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس سے متأثر ہونے والوں اور اس کے گرد جمع ہونے والوں میں صحیح دینی شعور رکھنے والے کتنے ہیں اور دینی خدمات سے وابستہ معتبر لوگ کس حد تک؟ اگر کچھ معتبر لوگ قریب ہیں تو ان سے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ کیوں قریب ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ کسی غلط فہمی، معلومات کی کمی یا کسی مصلحتِ مزعومہ کے تحت وہ قریب دکھائی دے رہے ہوں؟

حاصل یہ ہے کہ ان تمام باتوں کی تحقیق کے بعد اگر اطمینان ہو جائے، تبھی دینی معاملے میں اس کی باتیں قابلِ اعتبار اور لائق عمل ٹھہریں گی، ورنہ اس سے دور رہنے ہی میں ایمان کی سلامتی ہے، مشہور تابعی ''محمد بن سیرین'' کا مقولہ ہے: ''إنّ هذا العلم دين فانظروا عمّن تأخذون دينكم''، یعنی دین کی باتوں کو سننے اور سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ خوب غور کرلو کہ کیسے لوگوں سے علم حاصل کر رہے ہو اور دین سیکھ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی
نائب مفتی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند
۱۴۳۲/۳/۲۰ھ = ۲۰۱۱/۲/۲۴ء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

طہارت اور نماز سے متعلق بعض مسائل

چہرہ، سر اور دیگر اعضاءِ وضو میں شدید زخم ہونے کی صورت میں وضو کا حکم (از مفتی ابراہیم ڈیسائی)

انگریزی ای میل کا اردو ترجمہ

سوال: ﴿۲۳﴾ اگر آپ حضرات (مفتیان کرام) درج ذیل جواب سے اتفاق کرتے ہوں جو کہ مفتی ابراہیم ڈیسائی صاحب نے دیا ہے، تو کیا آپ حضرات (مفتیان کرام) اس کی تصدیق کر سکتے ہیں؟ کیا بہشتی زیور کے باب تیمّم کے مسئلہ نمبر:۵/ص:۶۲ کے مطابق ذیل میں مذکور مریض کے لیے تیمّم کی اجازت ہوگی؟

سوال: (۱) ڈاکٹر نے ایک مریض کو کہا ہے: ''جس نے برین ٹیومر کا آپریشن کرایا ہے کہ وہ اپنا سر کسی چیز سے نہ ڈھانکے، چونکہ اس کی بیماری پیشانی تک ہے اس لیے وہ اپنا پورا چہرہ دھونے اور اپنے سر کا مسح کرنے کے قابل نہیں ہے''۔ کیا اس کو تیمّم کرنے کی اجازت ہوگی؟

(۲) بڑے آپریشن کی وجہ سے وہ چہرہ دھونے میں بہت تکلیف محسوس کرتا ہے، کیوں کہ ایسا کرنے سے ہمیشہ سر میں پانی پہنچنے کا بہت بڑا خطرہ موجود ہے، کیا اس کو تیمّم کرنے کی اجازت ہوگی؟

جواب: (۱-۲) اصل میں اگر بدن کے چاروں اعضاء میں سے تین یا تمام چاروں عضو جن کا وضو میں دھونا فرض ہے یعنی (چہرہ، کہنیوں سمیت ہاتھ، سر اور پاؤں) کے اوپر کوئی انفیکشن یا زخم وغیرہ ہو جس کی وجہ سے وہ دھوئے نہ جا سکیں (یا تر ہاتھوں سے سر کا مسح نہ کیا جا سکے) تو تیمّم کیا جائے گا،

اور اگر چاروں اعضاء میں سے صرف ایک یا دو عضو نہ دھوئے جا سکیں تو صحت مند حصہ کو دھونا ہوگا اور بیماری سے متاثرہ یا زخمی حصوں کو تر ہاتھوں سے پونچھا جائے گا (یعنی مسح کیا جائے گا)، اس صورت میں تیمّم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر اس جگہ پر مسح کرنا نقصان دہ ہے تو متعلقہ شخص اس جگہ پر ایک پٹی باندھے گا اور اس پٹی پر مسح کرے گا (اس کو اس کے اکثر حصے کا مسح کرنا پڑے گا) حتی کہ اگر وہ بھی نقصان دہ ہے تو اس تمام جگہ کو چھوڑ دے گا، اس کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ فتوے ضرورت کے مطابق دے جاتے ہیں، اس خاص صورت میں جو کہ سوال میں مذکور ہے چاروں اعضاء میں سے صرف ایک یا دو عضو کو پانی سے بچانا ضروری ہے، اس لیے دوسرے تمام اعضاء کو دھونا ضروری ہوگا اور اس صورت میں تیمّم کی اجازت نہیں ہوگی، اس اصول کی اقتداء کرتے ہوئے جو کہ اوپر پیراگراف میں مذکور ہے یہ وہی ہے جو کہ سر کے مسح کے بارے میں کیا جائے گا: اگر سر کے ایک چوتھائی حصہ کا مسح کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تو مسح کیا جائے گا؛ کیوں کہ اتنا حصہ مسح میں فرض ہے، اور اگر اس میں کسی بات کا اندیشہ ہو تو وہ اس کے اردگرد ایک پٹی لپیٹ لے گا اور پٹی کے اکثر حصہ پر مسح کرے گا اور اگر ایسا کرنا بھی ممکن نہ ہو یا خطرناک ہو تو اس کو سر کا مسح بالکل نہیں کرنا ہوگا۔

چہرہ دھونے کے سلسلہ میں آپ نے ذکر کیا ہے کہ اس میں خطرہ پیدا ہوسکتا ہے؛ جیسا کہ پانی سر میں پہنچ سکتا ہے۔ متعلقہ شخص سر کو بچانے کے لیے شاور کیپ یا اسی سے مماثل کوئی اور چیز پہن سکتا ہے۔ اگر کسی طرح ایسا نہیں ہوسکتا یا اس صورت میں چہرہ دھونے سے خطرے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں وہ شخص صرف چہرہ کا اتنا حصہ ہی دھوئے گا جس میں کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہے یا اگر ضرورت پڑی تو وہ مکمل طور پر چہرہ دھونے سے احتیاط کرسکتا ہے۔

تيمم: لو (كان) أكثره (أي أكثر أعضاء الوضوء عددًا وفي الغسل مساحة) مجروحا (أوبه جدري اعتبارًا للأكثر) وبعكسه يغسل (الصّحيح ويمسح الجريح) و (كذا) إن استويا غسل الصّحيح (من أعضاء الوضوء، ولارواية في الغسل) و مسح الباقي (منها) وهو (الأصحّ لأنّه) أحوط (فكان أولٰى، وصحّح في الفيض وغيره التّيمّم كما يتيمّم لوالجرح بيديه وإن وجد من يوضيه خلافاً لهما (الدّرّالمختار: ۱/۲۸۱، دار المعرفة)، **قوله ويمسح الجريح (أي إن لم يضره وإلا**

عصبهابخرقة ومسح فوقها،خانية وغيرها ومفاده كما قال ط، أنه يلزمه شد الخرقة إن لم تكن موضوعة (ردالمحتار:۱/۲۸۱،دار المعرفة).

وإن كان به جدري أو جراحات يعتبر الأكثر محدثاًكان أو جنبا ففي الجنابة يعتبر أكثر البدن، وفي الحدث يعتبر أكثر أعضاء الوضوء فإن كان الأكثر صحيحاً والأقل جريحًا يغسل الصحيح ويمسح على الجريح إن أمكنه وإن لم يمكنه المسح يمسح على الجبائر أو فوق الخرقة ولا يجمع بين الغسل والتيمم (الفتاوی الهندية:۱/۳۲،دار الكتب العلمية)، ويكتفي بالمسح على أكثر الجبيرة هكذا في الهداية وبه يفتى، كذا في المضمرات، ولا يجوز على النصف فما دونه إجماعاً كذا في السراج الوهاج، وإن مسح المفتصد على العصابة دون الخرقة أجزأه أيضاً وعليه الاعتماد هكذا فى فتاوى قاضى خان، وفي المضمرات: إن الفتوى اليوم على هذا كذا في شرح النقاية للشيخ أبي المكارم (الفتاوی الهندية: ۱/۳۹دارالكتب العلمية)، من به وجع رأس لا يستطيع معه مسحه (محدثا ولا غسله جنباً ففى الفيض عن غريب الرواية يتيمم و افتى قارئ الهداية أنّه يسقط (عنه)فرض مسحه ولوعلى جبيرة ففي مسحها قولان، وكذا يسقط غسله، فيمسحه ولو على جبيرة إن لم يضره وإلا سقط أصلاً وجعل عاد ما لذالك العضوحكماً كما في المعدوم حقيقة. (الدرالمختار:۱/۲۸۶،دار المعرفة)، قوله: وأفتى قارئ الهداية الخ (هو العلامة سرا ج الدين شيخ المحقق ابن الهمام وما أفتىٰ به نقله في البحر عن الجلابي ونظمه العلامة ابن الشحنة في شرحه على الوهبانية، وقال: إنها مهمة نظمتها لغرابتها وعدم وجودها في غالب الكتب)، قوله قولان: (ذكر في النهر عن البدائع ما يفيد ترجيح الوجوب وقال: وهو الذي ينبغي التعويل عليه اه، بل قال في البحر: والصّواب الوجوب ويأتي تمامه في آخر الباب الآتي)، قوله وكذا يسقط غسله (أي غسل الرّأس من الجنابة)، قوله ولو على جبيرة (ويجب شدها إن لم تكن مشدودة ط أي إن أمكنه)، قوله وإلا (أي بأن ضره المسح عليها، واللّٰه سبحانه وتعالىٰ اعلم. (ردّالمحتار:۱/۲۸۶، دار

المعرفة)والله اعلم والسّلام

مفتي ابراهيم ديسائي (ايم ۲)دار الإفتاء مدرسه إنعاميه

(۱۳۷۸/د ۱۴۲۹ھ)

باسمہ تعالیٰ: تصدیق کی جاتی ہے کہ محترم مفتی ابراہیم دیسائی صاحب مدظلہ مفتی مدرسہ انعامیہ کا تحریر کردہ فتویٰ مذکور الصدر درست وصحیح ہے، البتہ اخیر حکم میں ''اگر کل چہرہ، یا بعض چہرہ دھونے میں خطرے کا اندیشہ ہو تو مکمل طور پر چہرہ دھونے سے احتیاط کر سکتا ہے'' کے بعد یہ اضافہ ہونا چاہیے'' اور مسح کرنا کافی ہے''۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

المصدق: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۸/۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

سوتی موزے پر جوازِ مسح کے شرائط

سوال: ﴿۲۴﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ذیل کے مسئلہ میں:

ایک موزہ بھیج رہے ہیں سیل اسکینز میڈیم ایل اے ایس اے یہ موزہ دھاگے نائلون لاسٹک سے بنایا گیا ہے اور کافی دبیز ہے، اس میں پانی پڑنے سے پیر تک نہیں پہونچتا، اسے پہن کر بہت دور تک چلا جا سکتا ہے، اس موزہ کے بارے میں دریافت یہ کرنا ہے کہ اس پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ کچھ لوگ اس پر مسح کر کے نماز پڑھتے ہیں، ان کی نماز وں کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔ والسلام

محمد اکبر، شکاگو، امریکہ (۱۶۲۰/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

کپڑے کے اعتبار سے جرابوں کی دو قسمیں ہیں: ثخین اور رقیق، ثخین اصطلاح فقہاء میں وہ جراب ہے جس کا کپڑا اس قدر دبیز، موٹا اور مضبوط ہو کہ اس میں تین میل بغیر جوتے کے سفر کر سکیں اور ساق (پنڈلی) پر بغیر (گیٹس وغیرہ سے) باندھے ہوئے قائم رہ سکیں، بہ شرطیکہ یہ قائم رہنا کپڑے کی تنگی اور چستی کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ اس کی ضخامت اور جرم کی وجہ سے ہو، نیز یہ کہ وہ پانی کو جلدی سے جذب نہ کرے اور پانی اس میں نہ چھنے، الغرض ثخین کے لیے تین شرطیں ہیں؛(۱) یہ کہ اس میں

تین میل بغیر جوتے کے سفر کریں تو پھٹے نہیں، (۲) یہ کہ ساق پر بغیر باندھے ہوئے قائم رہ جائے، (۳) یہ کہ اس میں پانی چھنے نہیں اور جلدی سے جذب نہ ہو، اور جس جراب میں ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے وہ رقیق ہے، قال في المنية :وحد الجوربين الثخينين أن يستمسك أي يثبت ولا ينسدل على الساق من غير أن يشده بشيء هكذا فسروه كلّهم .... والحد بعدم جذب الماء كما في الأديم على مافهم من كلام قاضي خان اقرب وبما تضمنه وجه الدليل وهو ما يمكن فيه متابعة المشى أصوب (کبیری)(۱)، قال في امداد الأحكام: والمراد استمساكه بصلابته وغلظته دون جدته وضيقه (امدادالأحكام)(۲)

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں عرض ہے کہ جو موزہ آں محترم نے دارالافتاء میں بھیجا ہے اس پر ثخین کی تعریف صادق نہیں آتی؛ اس لیے اس پر مسح کرنا جائز نہیں، دارالافتاء کے دوسرے مفتیان کرام کو بھی دکھلایا ان کی بھی یہی رائے ہے؛ کیوں کہ اس موزہ میں (۱) پانی جذب ہوجاتا ہے (۲) پیر پر اس کی گرفت لاسٹک کی وجہ سے ہے دبازت اور ضخامت کی وجہ سے نہیں، اس موزہ میں پانی اگر چہ نیچے (پیر تک) نہیں پہنچتا مگر اس میں جذب ہوتا ہے، فتاوی قاضی خاں میں ایک معنی پانی جذب نہ ہونے کے اور دوسرے معنی پانی پیر تک نہ پہونچنے کے لکھے ہیں حیث قال: والثخين أن يقوم على الساق من غير شد ولا يسقط ولا ينشف وقال بعضهم: لاينشفان معنى قوله لاينشفان أى لايجاوز الماء إلى القدم،وقيل: معنى قوله لا ينشفان أي لا ينشف الجورب الماء الى نفسه كالأديم والصرم(خانيه على الهندية)(۳)

''امداد الفتاویٰ'' میں تحریر ہے کہ دبازت کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس کو بدون باندھے ہوئے اور بدون جوتے کے پہن کر تین میل چل سکیں اور وہ نہ گرے نہ پھٹے(۴)، مذکورہ موزہ میں

(۱) غنية المستملى المعروف بـ ''كبيري'': ۱۰۵-۱۰۶، كتاب الطّهارة،فصل في المسح على الخفين، ط: دار الكتاب ديوبند.

(۲) إمداد الأحكام:۱/ ۳۸۸، كتاب الطّهارة، فصل في المسح على الخفين .

(۳) خانية على الهندية :۱/۵۲، كتاب الطّهارة، فصل في المسح على الخفين.

(۴) إمداد الفتاوٰی:۱/۴۳، كتاب الطّهارة، فصل في الوضوء ونواقضه.

لاسٹک کی وجہ سے پیر پر پکڑ رہتی ہے اور چپکا رہتا ہے ضخامت کی وجہ سے نہیں۔

رہا یہ سوال کہ کسی نے ان موزوں پر مسح کر کے نمازیں پڑھ لی ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ پس جاننا چاہیے کہ اگر کسی معتمد مفتی کے فتوی پر اعتماد کر کے نمازیں پڑھی ہیں تو قضا واجب نہیں اور اگر یونہی کسی کے کہنے پر یا اپنی رائے سے مسح کر کے نمازیں پڑھی ہیں تو ان کی قضا واجب ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/۱۰/۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام

نماز میں ستر عورت سے کیا مطلوب ہے؟
صرف جلد کا چھپنا یا حجم بدن بھی؟

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں!

سوال: ﴿۲۵﴾ آج کل مردوں میں چست لباس یعنی پینٹ، پتلون پہننے کا عام رواج ہو گیا ہے، مرد کے لیے گھٹنوں سے ناف تک کا حصہ ستر ہے، کیا ستر کے صرف یہ معنی ہیں کہ بدن کا رنگ نظر نہ آئے یا اس کے ساتھ بدن کی ساخت کا نظر نہ آنا یہ بھی مطلوب شرعی ہے؟ کیا اس طرح کے کپڑوں کو پہن کر ایک مسلمان گھر سے باہر جا سکتا ہے؟ رانیں اور کولہے اور اگلا حصہ بسا اوقات اس کا عضو مخفی کا حجم بھی نظر بچانے کے باوجود نظر آ جاتا ہے، اگر چہ کپڑے کے اوپر سے ہی صحیح، ایسے پتلون کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ ان کو پہن کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ ان کی رانوں کو دیکھنا اور ان کو دکھانے کا کیا حکم ہے؟ اس کی نماز واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟ جواب شافی کافی مدلل عنایت فرمائیں۔ اس سلسلہ میں ''احسن الفتاوی'' میں ایک فتوی لکھا ہوا ہے، اس کو بعینہ نقل کیا جاتا ہے:

الجواب باسم ملہم الصواب:

ایسا چست لباس پہننا جس سے اعضاء مخفیہ کی شکل نظر آئے حرام ہے، اس طور پر اعضاء مخفیہ دکھانا بھی حرام اور دیکھنا بھی حرام، اگر چہ بلا شہوت ہو، ایسا لباس اگر اتنا موٹا ہو کہ اس میں سے بدن کا رنگ نظر نہ آتا ہو تو اس میں اگر چہ نماز کا فرض ادا ہو جائے گا، مگر حرام لباس میں نماز مکروہ اور واجب

الاعادہ ہوگی،عورتوں کے لباس کی بہ نسبت، مردوں کے چست پتلون زیادہ خطرناک ہیں؛ اس لیے کہ عورت نے چست کرتے کو چادر یا ڈوپٹہ سے چھپا کر نماز پڑھی تو اس میں کراہت نہیں۔

قال ابن عابدين رحمه الله: ولايضرّ التصاقه أي بالإلية مثلاً وقوله: ''وتشكله'' من عطف المسبب على السبب، وعبارة شرح المنية :امالو كان غليظا لا يرى منه لون البشرة، إلا أنّه التصق بالعضو، وتشكل بشكله فصار شكل العضو مرئيًا، فينبغي أن لا يمنع جواز الصلاة لحصول السترالخ. قال ط: وانظر هل يحرم النظر إلى ذلك المتشكل مطلقًا أو حيث وجدت الشهوة الخ .قلت: سنتكلم على ذالك في كتاب الحظر والذي يظهر من كلامهم هناك هو الأول (رد المحتار:۱/۳۸۱).

فقط واللہ تعالیٰ اعلم احسن الفتاوی: جلد:۳،ص:۴۰۳، فقط والسلام۔

ابوالکلام مدرسہ مظاہر العلوم،سیلم، ۹/ ربیع الاول/۱۴۳۲ھ (۸۶۶/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق: حامدا ومصلیا ومسلما:

لباس کے بارے میں مطلوبِ شرعی کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ وہ (لباس) ساتر ہو؛ یعنی جس حصے کا چھپانا واجب ہے وہ کھلا نہ رہے، نہ ایسا مہین وباریک ہو کہ جسم نظر آنے لگے، اور نہ اتنا چست ہو کہ بدن کے واجب الستر اعضاء میں سے کسی کی بناوٹ اور حجم نظر آجائے۔''في تكملة فتح الملهم:فكل لباس ينكشف معه جزء من عورة الرّجل والمرأة لا تقره الشريعة الإسلامية بهما كان جميلا أو موافقالدور الأزياء، وكذلك اللباس الرقيق أو اللاصق بالجسم الذي يحكي للناظر شكل حصة من الجسم الذي يجب ستره، فهو في حكم ما سبق في الحرمة وعدم الجواز (كتاب اللباس والزينة: ۴/۸۸)، لہٰذا اگر لباس اتنا چست اور تنگ ہو کہ اس سے واجب الستر اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر آتا ہو؛ جیسا کہ آج کل اس طرح کے لباس کا رواج عام ہو چکا ہے تو اس کو پہننا، اسے پہن کر نماز پڑھنا، باہر نکلنا، لوگوں کو دکھانا اور دوسروں کا اسے دیکھنا سب ممنوع ومکروہ ہے۔قال العلّامة الشّامي:مفاده أن رؤية الثّوب بحيث يصف حجم العضو ممنوعة ولوكثيفا لا ترى البشرة منه وعلى هذا لا يحلّ النّظر إلى عورة غيره فوق ثوب ملتزق بها يصف حجمها (۱)، لیکن یہ بات بھی

(۱) الدّر مع الرّد، فصل في النّظر والمسّ، ۹/۵۳۶.

قابلِ ذکر ہے کہ اس طرح کا چست وتنگ لباس جس سے حجم نظر آتا ہو، پہن کر نماز پڑھنا اگر چہ مکروہ ہے، لیکن اگر کسی نے پڑھ لی تو نماز واجب الاعادہ نہ ہوگی؛ یعنی وجوباً اسے دہرانے کا حکم نہیں دیا جائے گا، ہاں اگر تطوعاً اعادہ کر لے تو بہت اچھا ہے، اس لیے کہ صحتِ صلاۃ کے لیے اس قدر ستر چھپانا بھی کافی ہے جس سے بدن کا رنگ نظر نہ آئے اگر چہ حجم تھوڑا بہت نظر آتا ہو" **قال العلاّمة الرّافعي في تقريراته: رأيت في شرح المنتهى الحنبلي مانصه: ويجب ستر عورة بمالايصف البشرة أي لو نها؛ لأن الستر إنّما يحصل بذلك لاأن لايصف حجم العضو؛ لأنّه لايمكن التّحرزعنه(۳۰۷/۹) وفي ردّالمحتار وعبارة شرح المنية: أما لو كان غليظًا لا يرى منه لون البشرة إلاأنه التصق بالعضو وتشكل بشكله، فصار شكل العضو مرئيًا، فينبغي أن لا يمنع جوازالصّلاة لحصول السّتر** (۱)۔ فقط واللہ اعلم

املاہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/۵/۳۲ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

کیا نماز سے پہلے ٹخنے سے نیچے لٹکے ہوے پائنچے کوموڑ لینا مکروہ تحریمی ہے؟

سوال: ﴿۲۶﴾ کیا پائنچے ٹخنوں سے نیچے اگر ہو رہے ہوں تو انہیں اگر موڑ کر نماز پڑھ لی جائے تو پائنچے موڑنے کا عمل مکروہ تحریمی کہلائے گا اور نماز واجب الاعادہ ہوگی؟ نیز اگر کپڑے یا ٹوپی کا کوئی حصہ مڑ جائے تب بھی یہی حکم ہے؟ اس کے حوالے میں بریلوی حضرات مختلف فقہا کے اقوال نقل کرتے ہیں، علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں۔ **أي كما لودخل في الصّلاة وهو مشمر كمه أو ذيله وأشار بذلك إلى أن الكراهة بالكف وهو في الصّلاة**(۱/۵۹۸)

(ب) **وكره كفه أي رفعه ولولتراب كمشمر كم أو ذيل**(درمختار).

(ج) جوہرہ نیرہ میں ہے: **ولا يكف ثوبه وهو أن يرفعه من بين يديه أو من خلفه إذا أراد السّجود قال عليه السّلام: أمرت أن أسجد على سبعة أعظم لا أكف ثوبًا ولا**

---

(۱) الدّرّ مع الرّد: ۸۴/۲.

أعقص شعراً (۸۱/۱)۔

(د) حضرت امام بصری سے روایت ہے: کفِ ثوب کرنے والے کی نماز مکروہ تحریمی ہے (۹۱/۲)

آپ سے درخواست ہے کہ ان حوالوں کا مدلل جواب دیں اور میں سوال کی مزید وضاحت کردوں کہ اکثر لوگوں نے پینٹیں اور شلواریں ٹخنوں سے نیچی سلوائی ہوتی ہیں، کیا نماز کی حالت میں پینٹوں کو نیچے سے موڑ سکتے ہیں اور شلوار کو باندھنے کی جگہ سے اڑس کر ٹخنوں سے اوپر کر سکتے ہیں؟ مزید یہ کہ ایک شخص کی اکثر شلواریں نیچی سلی ہوئی ہیں مگر وہ نماز کی حالت کے علاوہ بھی اور نماز میں بھی یعنی ہر حالت میں اس کو باندھنے کی جگہ سے اڑس کر ٹخنوں سے اوپر رکھتا ہے کیا اب بھی اس کی نماز میں کراہت آئے گی؟ جزاکم اللہ خیراً

الجواب وباللہ التوفیق، حامداومصلیا ومسلما!

ٹخنوں سے نیچے پاجامہ یا لنگی لٹکانا ان سخت گناہوں میں سے ایک ہے جن پر جہنم کی وعید آئی ہے، بخاری شریف میں ہے: "**ما اسفل من الكعبين من الإزار في النار** (رقم:۵۷۸۷)؛ اس لیے جائز نہیں کہ کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی کر کے ٹخنے سے نیچے پاجامہ، پینٹ وغیرہ لٹکائے، عام حالات میں بھی جائز نہیں اور نماز میں تو اور زیادہ قبیح ہے۔ ''اسبال'' (ٹخنے سے نیچے پاجامہ پینٹ وغیرہ لٹکانا) مطلقاً ناجائز ہے، اگر چہ ''مسبل'' (لٹکانے والا) یہ ظاہر کرے کہ میں تکبر کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں، ہاں اگر غیر اختیاری طور پر ایسا ہو جائے یا کسی یقینی قرینہ سے معلوم ہو کہ اس میں کبر نہیں تو پھر یہ حکم نہیں لگے گا؛ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کے واقعے میں ہے (۱)؛ لہٰذا عام حالات میں تکبر اور غیر تکبر کے درمیان فرق کرنا، ایک کو ناجائز اور دوسرے کو جائز کہنا یا ایک کو مکروہ تحریمی اور دوسرے کو تنزیہی شمار کرنا شراحِ حدیث کی تصریح کے مطابق صحیح نہیں؛ کیوں کہ حدیث کے اندر ٹخنے سے نیچے ازار وغیرہ لٹکانے اور اس کے کھینچنے کو تکبر کی علامت قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ایک مرفوع حدیث میں ہے: "**إياك وجر الإزار، فإن جر الإزار من المخيلة** (۲) اور جن احادیث کے

(۱) أخرجه النّسائي في سننه، باب إسبال الإزار ،رقم :۵۳۳۵۔

(۲) إيّاك وجر الإزار فإنّها من المخيلة ، شعب الإيمان للبيهقي:رقم :۵۷۳۰۔

اندر ''خیلاء'' کی قید مذکور ہے یہ قید احترازی نہیں؛ بلکہ قید اتفاقی یا واقعی ہے کہ ''ازار لٹکانے والا'' متکبر ہی ہوتا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور پینٹ پہننے میں عار آتی ہے، یا ایسے پہننے والوں کو نظرِ حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں، اس بابت ان سے مضحکہ بھی کرتے ہیں، ذیل کی حدیثوں سے مذکورہ باتوں کی تائید ہوتی ہے:

(۱) **عن عمرو بن زرارة: ضرب رسول اللّٰه ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ بأربع أصابع تحت ركبة عمرو، فقال: ياعمرو! هذا موضع الإزار، ثم ضرب بأربع تحت الأربع فقال: ياعمرو! هذا موضع الإزار،** الحدیث(۱)، یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت ''عمرو بن زرارة'' ازار لٹکانے کے ذریعے تکبر کا ارادہ نہیں کرتے تھے، اس کے باوجود حضور ﷺ نے منع فرمایا۔

(۲)**عن عبيد بن خالد قال: : كنت أمشي وعلى برد أجرّه، فقال لي رجل: ارفع ثوبك؛فإنه أتقى وأبقى، فنظرت فإذا هو النّبي ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ فقلت: إنما هي بردة ملحاء، فقال: أما لك في أسوة، فنظرت فإذا هوإزاره إلى أنصاف ساقيه (۲) و في رواية عن عمرو بن زرارة: إن اللّٰه لا يحب المسبل.** چناں چہ مشہور شارحِ بخاری علامہ ابن حجر طویل بحث کے بعد لکھتے ہیں: **وحاصله أن الإسبال يستلزم جر الثوب، وجر الثوب يستلزم الخيلاء ولو لم يقصد اللابس الخيلاء (۳)؛** یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسبال (مطلقا) جرثوب یعنی کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہے اور جرثوب تکبر کو مستلزم ہے؛ اگر چہ پہننے والا تکبر کا ارادہ نہ کرے، اور ابن العربی لکھتے ہیں: **لا يجوز للرجل أن يجاوز بثوبه كعبيه، ويقول: لا أجرّه خيلاء؛ لأن الحديث قد تناوله لفظاً ولايجوز لمن تناوله اللفظ حكماً أن يقول: لا أمتثله؛ لأن تلك العلة ليست في ؛ فانها دعوى غير مسلمة بل اطالته ذيله دالة على تكبره (۴)** یعنی ٹخنے سے نیچے پاجامہ، پینٹ وغیرہ لٹکانا کسی کے لیے جائز نہیں؛ اگر چہ وہ

---

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل، رقم: ۳۲۸.

(۲) أخرجه أبوداؤد الطيالسي في مسنده: ۲/۵۱۴،م دار هجر، مصر، رقم: ۱۲۸۶۔

(۳) فتح الباری: ۱۰/۲۶۴، ناشر دار المعرفة بيروت، باب من جر ثوبه.

(۴) عارضة الأحوذي لابن العربي: ۷/۳۳۸، باب كراهية جرالإزار، م دارالبازللطّباعة والنّشر

کہے کہ میں تکبراً ایسا نہیں کرتا۔اس لیے کہ یہ ایک نا قابل قبول دعویٰ ہے؛ بلکہ ازار کا لٹکانا بذات خود تکبر کی دلیل ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسبال مطلقاً ناجائز ہے الا یہ کہ کسی یقینی ذریعے سے تکبر کا نہ ہونا معلوم ہوجائے ،تو یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ پائنچے ٹخنوں سے نیچے لٹکے ہونے کی حالت میں نماز مکروہ تنزیہی ہے؛ بلکہ نماز میں لٹکانا بھی مکروہ تحریمی ہے اور حدیث کے اندر آیا ہے کہ جوآدمی ازار لٹکا کرنماز پڑھے،اس کی نماز قبول نہیں ہوتی ،**عن أبي هريرة: بينما رجل يصلي مسبلاً إزاره إذ قال له رسول الله صلّى الله عليه وسلّم: اذهب فتوضأ فذهب فتوضأ، ثم جاء، ثم قال :اذهب فتوضأ، ثم جاء، فقال له رجل: يا رسول الله ـ صلّى الله عليه وسلّم ـ مالك أمرته أن يتوضا؟ قال:أنه كان يصلي وهو مسبل إزاره وإن الله جل ذكره لا يقبل صلاة مسبل إزاره** (۱). یعنی ایک شخص نے ازار لٹکا کرنماز پڑھی تو حضور ﷺ نے اس (مسبل) سے کہا کہ جاؤ وضوکر کے آؤ؛ چنانچہ وہ شخص گیا اور وضوکر کے آیا، پھر حضور ﷺ نے دوبارہ فرمایا: جاؤ وضوکر کے آؤ، چنانچہ وہ پھر وضوکر کے آیا تو ایک دوسرے شخص نے دریافت کیا کہ : اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے ایسا کیوں حکم دیا تو حضور ﷺ نے ارشادفرمایا: یہ شخص ازار لٹکا کرنماز پڑھ رہا تھا اور اللہ جل شانہٗ ازار لٹکا کرنماز پڑھنے والے کی نماز قبول نہیں کرتا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی آدمی اس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے؛ یعنی لنگی پینٹ وغیرہ ٹخنے سے نیچے لٹکا کر پہنتا ہے ؛لیکن بہ وقت نماز پائنچے کواوپر چڑھالیتا ہے تاکہ نماز کے وقت کم ازکم گناہ سے بچا رہے اوراس حدیث کا مصداق نہ بنے اوراس کی نماز اللہ کے یہاں مقبول ہوجائے تو یہ فعل مستحسن ہوگا نہ کہ مکروہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بہ وقت نماز پائنچے اوپر چڑھا کرنماز پڑھنے کومکروہِ تحریمی کہنا نہ تو شرعاً صحیح اور نہ عقلاً ،سوال میں فقہاء کی جن عبارتوں اور ترمذی شریف کی جس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے ان سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی ، ذیل میں وہ عبارتیں ذکر کی جاتی ہیں :

(الف)كمشمر كم أوذيل أي كما لودخل في الصّلاة وهو مشمر كمه أوذيله

---

(۱) أبوداؤد عن أبي هريرة في حديث طويل رقم: ۶۳۸، باب الإسبال في الصّلاة.

وأشار بذلك إلى أنّ الكراهة لاتختصّ بالكف وهو في الصّلاة (الدّرّمع الرّد: ۲/۴۰۶).

(ب) ولا يكف ثوبه وهو أن يرفع من بين يديه أو من خلفه إذا أراد السجود.

(ج) قال صلّى اللّٰه عليه وسلّم: أمرت أن أسجد على سبعة أعظم ولا أكف ثوباً ولا شعرًا(۱).

مذکورہ حدیث شریف اور فقہی عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کے لیے مکروہ ہے کہ وہ آستین چڑھا کر نماز میں داخل ہو یا دوران نماز اپنے کپڑے کو آگے پیچھے سے سمیٹے تا کہ مٹی وغیرہ نہ لگے یا پہلے سے کپڑے کو اٹھائے رکھے، مٹی سے بچانے یا اظہار تکبر کے مقصد سے، چناں چہ کنز کی مشہور شرح تبیین الحقائق: ۱/۱۶۴ میں مکروہ ہونے کی علت لکھی ہے: لأنّـه نوع تجبر یعنی کراہت اظہار تکبر کی وجہ سے ہے اور اس کے حاشیہ میں ''کف الثّوب '' کے تحت لکھا ہے: وهو أن يضم اطرافه اتقاء التّراب: ۱/۱۶۴۔ اسی طرح ''ہدایہ'' میں بھی اس کی علت ''لأنّه نوع تجبر'' لکھی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کفِ ثوب کا یا تو یہ مطلب ہے کہ دورانِ نماز کپڑا سمیٹے، صاحب ''غنية المستملي '' نے یہی معنی بیان کیے ہیں، اس صورت میں کراہت کی وجہ نماز میں دوسرے کام میں مشغول ہونا ہے یا یہ مطلب ہے کہ مطلقا کفِ ثوب مکروہ ہے خواہ دورانِ نماز ہو، یا کپڑا سمیٹ کر نماز میں کھڑا ہو، تو اس کی وجہ ایک تو اظہار بڑکپن ہے یا نماز میں عبث کے اندر مشغول ہونا ہے۔ نیز شامی کی عبارت ''کمشمر کم'' (یعنی آستین چڑھا کر نماز پڑھنا) سے پائنچے وغیرہ کو چڑھا کر نماز پڑھنے کی کراہت پر استدلال صحیح نہیں؛ اس لیے کہ آستین چڑھا کر نماز پڑھنے کا کوئی شرعی مقصد نہیں ہے بلکہ اس سے تکبر اور بے ادبی ٹپکتی ہے برخلاف نماز کے لیے پائنچے چڑھانا، یہ ایک نیک مقصد یعنی کم از کم دورانِ نماز گناہ سے بچنے کے لیے ہے اور اس میں نہ تو تکبر ہے اور نہ ہی بے ادبی ہے۔ الغرض ان عبارات سے اس پر استدلال کرنا کہ نماز پڑھنے کے وقت پائنچے کو اوپر چڑھانا مکروہِ تحریمی ہے صحیح نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/محرم/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلندشہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

(۱) أخرجه مسلم: رقم: ۴۹۰، باب أعضاء السّجود والنّهي عن كفّ الشّعر.

رکوع اور سجدے سے عاجز شخص کے لیے کرسی پر نماز ادا کرنے کا حکم

سوال: ﴿۲۷﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

(۱) اگر کسی شخص کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہے پھر بھی بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے، تو کیا اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

(۲) کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ کیا اس کے لیے کسی حدیث میں صراحۃً کوئی تفصیل ملتی ہے؟ اگر نہیں ملتی ہے تو پھر یہ بنگلور والوں نے کب سے مسجد کو شادی محل بنا لیے ہیں جو بنگلور کی ہر مسجد میں دیکھنے کو ملتا ہے اور اس میں بھی کچھ لوگ کیا کرتے ہیں کہ صف میں کرسی رکھ کر کرسی کے آگے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر رکوع کے بعد سجدہ میں جانے کے بجائے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ امید ہے کہ اطمینان بخش جواب سے نوازیں گے۔　　عارف حسین بنگلور (۱۵۳/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) جو شخص قیام اور سجدہ پر قادر ہو تو اس کے لیے قیام فرض ہے(۱)، اگر قیام کے کچھ حصے پر قادر ہے پورے قیام پر قدرت نہیں تو جتنی دیر قیام کرسکتا ہے اتنی دیر قیام کرنا فرض ہے(۲)، اگر سجدے پر قدرت نہیں تو ایسے شخص سے قیام ساقط ہے، قیام پر قادر نہ ہونے کی صورت میں اگر زمین پر کسی بھی ہیئت خواہ تشہد، تورک (تشہد میں عورتوں کے بیٹھنے کا طریقہ) آلتی پالتی بیٹھ کر رکوع وسجدہ کی قدرت ہو تو زمین پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا ضروری ہے، کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا جائز نہیں (۳)۔

(۲) اگر قیام پر قدرت ہے لیکن گھٹنے، کمر میں شدید تکلیف کی وجہ سے سجدہ کرنا طاقت سے باہر ہو جائے یا وہ شخص جو زمین پر بیٹھنے پر قادر ہے مگر رکوع وسجدہ پر قدرت نہیں رکھتا تو ایسے حضرات کو زمین ہی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرنا چاہیے (۴)، کرسیوں کا استعمال کراہت سے خالی

---

(۱) الدّرّ مع الرّدّ: ۲/۱۳۱ کتاب الصّلاۃ، باب صفة الصّلاۃ بحث القیام.

(۲) الدّر مع الرّد: ۲/۲٦۷، کتاب الصّلاۃ باب صلاۃ المریض.

(۳) فتاوی تاتارخانیه جدید: ۲/٦٦۷، کتاب الصّلاۃ، الفصل الحادي والثّلاثون في صلاۃ المریض.

(۴) الدّر مع الرّد: ۲/۲٦۴-۲٦۵، کتاب الصّلاۃ باب صلاۃ المریض.

نہیں؛ کیوں کہ اس میں بلا ضرورت صفوف میں خلل ،اغیار کی عبادت گاہوں سے مشابہت اور مسنون طریقہ کی خلاف ورزی پائی جاتی ہے،اگر زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھنا دشوار ہوتب کرسی پر نماز ادا کی جاسکتی ہے۔کرسی پر نماز ادا کرنے کی صورت میں (جب کہ وہ اس درجہ کا معذور ہو) چوں کہ رکوع اور سجدہ اس سے ساقط ہے اس لیے قیام بھی اس سے ساقط ہے؛ پس کرسی سے آگے کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ پوری نماز کرسی پر بیٹھ کر ادا کریں۔

کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرتے وقت بعض لوگ رکوع میں ہاتھ کو ران پر رکھتے ہیں اور سجدہ کی حالت میں فضا میں معلق رکھ کر اشارہ سے سجدہ کرتے ہیں ایسا کرنا ثابت نہیں،رکوع وسجدہ دونوں میں ہاتھ ران پر رہنا چاہیے؛ کیوں کہ اشارہ سے نماز ادا کرنے کی صورت میں شریعت نے رکوع وسجدہ میں صرف ایک ہی فرق ملحوظ رکھا ہے وہ یہ کہ رکوع کے مقابلے میں سجدہ میں زیادہ جھکے۔(۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

از: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۵/۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ،محمود حسن بلند شہری غفرلہ،فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

کرسی پر جوازِ نماز کی شرطیں اور اس سے متعلق اہم تفصیلات

سوال: ﴿۲۸﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ:

ہمارے شہر کی مساجد میں معذور افراد کے لیے (جیسے پیر میں تکلیف،گھٹنوں میں درد،کمر درد یا کھڑے نہ ہو پانا،یا سجدہ زمین پر نہ کر پانا یا کوئی اور عذر ہو،جس سے نماز کھڑے ہو کر ادا نہیں کر سکتے) مسجد کی صف میں دونوں کنارے پر کرسیاں رکھی جاتی ہیں؛ تا کہ معذور افراد اس پر نماز ادا کرسکیں ،ایسے ہی ہماری مسجد میں بھی معذور افراد کے لیے کرسی کا انتظام ہے؛مگر وہ کرسیاں ایک خاص ڈیزائن کے ساتھ بنی ہوئی ہیں ،بعض افراد نے اعتراض کیا ہے کہ ایسی کرسی پر نماز کا پڑھنا درست نہیں ہے۔

(۱) مستفاد از امداد الاحکام: ۱/۶۰۹

جواب طلب امر یہ ہے کہ اس خاص ڈیزائن والی کرسی پر، مذکورہ معذور افراد کی نماز درست ہو سکتی ہے یا نہیں یا پلاسٹک والی کرسی پر نماز ادا کی جائے؟ یاد رہے کہ خاص ڈیزائن والی کرسی اسٹیل کی بنی ہوئی ہے۔

آپ حضرات سے درخواست ہے کہ تصویر میں خاص شکل والی کرسی پر نماز کا ادا کرنا درست ہے یا نہیں، جو کہ اسٹیل کی ہے اور پلاسٹک والی کرسی پر نماز ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟ نماز ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ قرآن واحادیث کی روشنی میں اور فقہائے کرام کے ارشادات کے مطابق جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ومشکور ہوں۔

آفاق احمد خان کوپر، کھیرنہ، نوی ممبئی (۹۳۲۰۰۳۳۸۳۷) (۲۳/۷/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

قیام اور سجدہ پر قادر شخص کے لیے نماز میں قیام فرض اور نماز کا رکن ہے۔ اگر قیام اور سجدہ پر قدرت ہوتے ہوئے، فرض نماز بیٹھ کر ادا کی جائے، تو رکن کے فوت ہونے کی وجہ سے نماز نہیں ہوگی، نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہوگا، **من فرائضها القيام في فرض لقادر عليه وعلى السجود** (الدر مع الرد: ۱۳۲/۲).

یہاں تک کہ اگر نماز میں قیام کے کچھ حصے پر قدرت ہے، مکمل طور پر قیام پر قادر نہیں تو جتنی دیر قیام کر سکتا ہے۔ خواہ کسی عصا یا دیوار پر ٹیک لگا کر ہی کیوں نہ ہو۔ اتنی دیر قیام کرنا فرض ہوگا، اگر اتنی دیر قیام نہ کیا یا ٹیک لگا کر کھڑا نہ ہوا اور بیٹھ کر نماز مکمل کی تو نماز نہیں ہوگی **وإن قدر على بعض القيام ولو متكئا على عصا أو حائط قام لزوما بقدر ما يقدر ولو قدر آية أو تكبيرة على المذهب لأن البعض معتبر بالكل** (الدر مع الرد: ۵۶۷/۲).

اگر کوئی شخص قیام پر قادر ہے؛ مگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں رکوع، سجدہ یا صرف سجدہ پر قادر نہیں تو اس کے لیے بیٹھ کر نماز ادا کرنا جائز ہے، وہ اشارہ سے رکوع وسجدہ ادا کرے، اس صورت میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کے مقابلے میں، بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرنا افضل بہتر ہے: **وإن تعذرا ليس تعذرهما شرطًا بل تعذر السّجود كاف لا القيام، أو مأ قاعدًا لأن ركنية القيام للتوصل إلى السجود، فلايجب دونه.** (الدّر مع الرّد: ۵۶۷/۲)

جو اعذار قیام کو ساقط کرنے والے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں:

(۱) حقیقی: یعنی اس طرح معذور ہو کہ قیام اس کے لیے ممکن نہ ہو۔

(۲) حکمی: یعنی اس درجہ معذور نہ ہو کہ قیام پر قدرت ہی نہ ہو؛ بلکہ قدرت تو ہو مگر گر جانے کا اندیشہ ہو یا ایسی کمزور حالت ہو جو عندالشرع عذر میں شامل ہے مثلاً بیمار ہے اور ماہر مسلم تجربہ کار ڈاکٹر نے کہا ہو کہ کھڑے ہونے میں بیماری میں اضافہ ہوگا یا بیماری دیر سے صحیح ہوگی، یا کھڑے ہونے میں ناقابلِ برداشت درد ہوتا ہو، ان صورتوں میں بیٹھ کر نماز ادا کرنا جائز ہے: **من تعذر عليه القيام لمرض حقيقي وحدُّه أن يلحقه بالقيام ضرر، (قال في البحر: أراد بالتّعذر، التّعذّر الحقيقي بحيث لو قام سقط) أو حكمي بأن خاف (أي غلب على ظنه بتجربة سابقة أو إخبار طبيب مسلم حاذق) زيادته أو بطء برئه بقيامه أو دوران رأسه أو وجد لقيامه ألمًا شديدًا صلّى قاعدًا** (الدر مع الرد: ۲/۵۶۵).

اگر غیر معمولی درد نہ ہو؛ بلکہ ہلکی اور قابل برداشت تکلیف کا سامنا ہو تو یہ عندالشرع عذر نہیں، اس صورت میں بیٹھ کر نماز ادا کرنا جائز نہیں: **وإن لم يكن كذلك (أي ما ذكر) ولكن يلحقه نوع مشقة لا يجوز ترك القيام** (تاتارخانية: ۲/۶۶۷)

جو شخص قیام پر قادر نہیں، لیکن زمین پر بیٹھ کر سجدہ کے ساتھ نماز ادا کرسکتا ہے تو اس کو زمین پر بیٹھ کر سجدہ کے ساتھ نماز ادا کرنا ضروری ہے، زمین پر سجدہ نہ کرتے ہوئے کرسی پر یا زمین پر اشارہ سے سجدہ کرنا جائز نہیں۔ **وإن عجز عن القيام وقدر على القعود، فإنه يصلي المكتوبة قاعداً بركوع وسجود ولا يجزيه غير ذلك.** (تاتار خانية: ۲/۶۶۷)

اگر رکوع وسجدہ پر قدرت نہیں اور زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کرسکتا ہے، تو تشہد ہی کی حالت میں بیٹھنا ضروری نہیں؛ بلکہ جس ہیئت پر بھی، خواہ تورک (عورت کے تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ) کی حالت پر یا آلتی پالتی مار کر، بیٹھنا سہل وممکن ہو، اس ہیئت کو اختیار کرکے زمین ہی پر بیٹھ کر اشارہ سے نماز ادا کی جائے، کرسیوں کو اختیار نہ کیا جائے؛ کیوں کہ شریعت نے ایسے معذورین کو زمین پر بیٹھنے کے سلسلے میں مکمل رعایت دی ہے کہ جس ہیئت میں بھی ممکن ہو، بیٹھ کر نماز ادا کریں۔ **من تعذر عليه القيام لمرض............ أو خاف زيادته............أو وجد لقيامه ألماً**

شديداً............صلى قاعداً .... كيف شاء. (الدر مع الرد: ۲/۵٦٦)

اس صورت میں بلاضرورت کرسیوں پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا چند وجوہ کراہت سے خالی نہیں:

(۱) زمین پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا مسنون طریقہ ہے، اسی پر صحابۂ کرام اور بعد کے لوگوں کا عمل رہا ہے، نوے کی دہائی سے قبل تک، کرسیوں پر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کا رواج نہیں تھا، نہ ہی خیر القرون سے اس طرح کی نظیر ملتی ہے۔

(۲) کرسیوں کے بلا ضرورت استعمال سے صفوں میں بہت خلل ہوتا ہے، حالانکہ اتصالِ صفوف کی حدیث میں بہت تاکید آئی ہے (۱)

(۳) بلاضرورت کرسیوں کو مساجد میں لانے سے اغیار کی عبادت گاہوں سے مشابہت ہوتی ہے اور دینی امور میں ہم کو غیروں کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے (۲)

(۴) نماز، تواضع وانکساری سے عبارت ہے اور بلاضرورت کرسی پر بیٹھ کر ادا کرنے کے مقابلے میں، زمین پر ادا کرنے میں یہ انکساری بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

(۵) نماز میں زمین سے قرب ایک مطلوب شئ ہے، جو کرسیوں پر ادا کرنے میں مفقود ہے (۳)

البتہ اگر زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھ کر نماز ادا کرنا دشوار ہو جائے تو پھر کرسیوں پر ضرورت کی وجہ سے نماز ادا کی جاسکتی ہے؛ لیکن زمین پر بیٹھ کر رکوع وسجدہ کی قدرت ہونے کی صورت میں کرسی پر اشارے سے نماز ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) قال النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم: راصوا صفوفكم وقاربوا بينها وحاذوا بالأعناق فو الذي نفس محمد بيده إني لأرى الشياطين تدخل من خلل الصف كأنها الخذف (نسائی: ۱/۱۳۱)، كتاب الصلاة، حث الإمام على رص الصفوف والمقاربة بينها: رقم: ۸۱۵۔

ترجمہ: صفوں میں ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو اور قریب قریب کھڑے رہو، اور گردنوں کو ایک دوسرے کے برابر کرلو، اس ذات کی قسم، جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے! میں شیطان کو بکری کے بچے کی طرح صفوں کے خلا میں گھستے ہوئے دیکھتا ہوں۔

(۲) عن أبي عمر قال: قال رسول اللّٰه صلّى الله عليه وسلّم: من تشبه بقوم فهو منهم. (أبو داؤد: كتاب اللّباس، باب في لبس الشهرة، رقم الحديث: ۴۰۳۱)

(۳) وإن تعذرا لا القيام أومأ قاعداً وهو أفضل من الإيماء قائماً لقربه من الأرض (الدر مع الرد: ۲/۵٦۷-۵٦۸).

بہر حال جس صورت میں ضرورۃً کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس میں بھی مصلی کو چاہیے کہ سجدے کے وقت اشارہ پر اکتفا کرے، جہاں تک کرسی کے کسی حصے (مثلاً: اس پر لگی لکڑی) پر سجدہ کرنے کی بات ہے تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ بحالت معذوری کسی اونچی چیز پر سجدہ کرنے کے سلسلے میں روایات مختلف آئی ہیں، چناں چہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ایک صحابی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، وہ صحابی معذوری کی وجہ سے نماز میں ایک تکیہ پر سجدہ کرتے تھے، آپ ﷺ نے ان کو اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر زمین پر سجدہ کرنا تمہارے بس میں نہ ہو تو اشارے سے نماز ادا کرو اور سجدہ میں رکوع کے مقابلے میں زیادہ جھکو۔ (رواہ البزار، و رجاله رجال الصّحيح، نقلاً عن اعلاء السنن: ۱۷۸/۷)

دوسری روایت ہے کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب بیمار ہوئیں تو ان کے سامنے تکیہ رکھا گیا تھا اس پر وہ سجدہ کرتی تھیں، آپ ﷺ نے دیکھا تو اس پر نکیر نہیں فرمائی (۱)، اور آں حضور ﷺ کا کسی عمل کو دیکھ کر سکوت اختیار کرنا، اس کے اذن کی دلیل ہے۔

علامہ شامیؒ نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے کہ کراہت اس صورت میں ہے جب آدمی دورانِ نماز کوئی چیز اٹھا کر اس پر سجدہ کرے، اگر زمین میں پہلے سے کوئی چیز نصب کر دی گئی ہو جس پر مصلی سجدہ کرے تو یہ بلا کراہت جائز ہے۔

أقول: هذا محمول على ما إذا كان يحمل إلىٰ وجهه شيئاً يسجد عليه بخلاف ما إذا كان موضوعاً على الأرض وقال بعد أسطر: فإن مفاد هذه المقابلة والاستدلال عدم الكراهة في الموضوع على الأرض المرتفع (الدّر مع الرد: ۵۶۸/۲).

علامہ شلبیؒ نے بھی کراہت کو شکل اول پر محمول کیا ہے (حاشيه الشلبي على التبيين: ۲۰۰/۱ ط: پاکستان)، فتاویٰ عالمگیری میں بھی یہی تطبیق منقول ہے۔ (الفتاوى الهندية: ۱۳۶/۱)

مذکورہ بالا عبارت کا حاصل یہی ہے کہ کسی نصب شدہ اونچی چیز پر سجدہ کرنا، یا بغیر کچھ رکھے ہوئے سجدہ کے لیے صرف اشارہ کرنا دونوں جائز ہے، مگر اونچی رکھی ہوئی چیز جیسے ٹیبل والی کرسی پر

---

(۱) فقد صح أن أم سلمة كانت تسجد على مرفقة موضوعة بين يديها لعلة كانت بها ولم يمنعها رسول الله صلّى الله عليه وسلّم من ذلك. (الدّر مع الرّد : ۵٦۸/۲ كتاب الصلاة باب صلاة المريض).

سجدہ، حقیقی سجدہ نہیں ہوگا؛ بلکہ وہ بھی اشارہ ہی ہوگا، لہٰذا مذکورہ کرسی پر بیٹھ کر اگر کوئی شخص نماز پڑھے گا اور ٹیبل پر سجدہ کرے گا تو اس کے پیچھے رکوع وسجدہ کرنے والوں کی نماز نہیں ہوگی، علامہ شامی لکھتے ہیں:" **إن كان الموضوع مما يصح السجود عليه كحجر مثلاً ولم يزد ارتفاعه على قدر لبنة أو لبنتين فهو سجود حقيقي، فيكون راكعاً وساجداً..........وإن لم يكن الموضوع كذلك يكون مومئا فلا يصح اقتداء القائم به**"(الدر مع الرد:۲/۵۶۹).

لیکن نبی کریم ﷺ اور دیگر صحابۂ کرام کے منع کرنے کی وجہ سے اس کا (یعنی موضوع مرتفع پر سجدہ کرنا) غیر اولیٰ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے بھی اس کو غیر اولیٰ کہا ہے:

"سجدہ کرنے کے لیے تکیہ وغیرہ کوئی اونچی چیز رکھنا اور اس پر سجدہ کرنا بہتر نہیں، جب سجدہ کی قدرت نہ ہو تو بس اشارہ کرلیا جائے تکیہ کے اوپر سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں"۔ (بہشتی زیور:۲/۴۵ بیمار کی نماز کا بیان)۔ نیز ایک خرابی یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کو جو عام کرسی پر نماز ادا کر رہے ہوں، اپنی نماز میں کمی کا شبہ ہوگا کہ ہم نے کسی چیز پر سجدہ نہیں کیا۔

اخیر میں اختصار کے ساتھ جواب کا ماحصل، ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) اگر قیام پر قادر نہ ہو، لیکن کسی بھی ہیئت پر زمین پر بیٹھ کر، رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز ادا کرسکتا ہے تو اس کو زمین ہی پر بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز ادا کرنا ضروری ہے، کرسی پر بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے اشارے سے نماز ادا کرنا جائز نہیں، نماز نہیں ہوگی۔

(۲) اگر قیام پر قدرت ہے؛ لیکن گھٹنے یا کمر میں شدید تکلیف کی وجہ سے سجدہ کرنا طاقت سے باہر ہو یا وہ شخص جو زمین پر بیٹھنے میں قادر ہے مگر رکوع وسجدہ پر قدرت نہیں رکھتا تو یہ شخص زمین پر بیٹھ کر نماز ادا کرے، کرسیوں کو استعمال کرنا کراہت سے خالی نہیں، البتہ اگر زمین پر کسی بھی ہیئت میں بیٹھنا دشوار ہو، تب کرسی پر نماز ادا کی جاسکتی ہے، کرسی استعمال کرنے کی صورت میں بھی عام سادہ کرسی پر نماز ادا کی جائے، ٹیبل والی کرسی پر نماز ادا کرنے سے احتراز کیا جائے۔

زمین یا کرسی پر نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں تین باتیں قابل لحاظ ہیں:

(۱) کرسی پر اشارہ کرنے کی صورت میں بعض لوگ رکوع میں ہاتھ کو ران پر رکھتے ہیں اور سجدہ کی

حالت میں فضا میں معلق رکھ کر اشارہ سے سجدہ کرتے ہیں، ایسا کرنا ثابت نہیں ، رکوع وسجدہ دونوں میں ہاتھ ران پر رکھنا چاہیے۔

(۲) کرسی پر نماز ادا کرنے کی صورت میں چوں کہ رکوع اور سجدہ ساقط ہے؛ اس لیے قیام بھی اس سے ساقط ہے، پس کرسی کے آگے کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ؛ بلکہ پوری نماز کرسی پر بیٹھ کر ادا کریں اور کرسی کا پچھلا پایا، مصلین کی صف کے برابر رہے۔

(۳) معذوری کی حالت میں زمین پر بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز ادا کرنے کی صورت میں رکوع میں سرین کا زمین سے اٹھنا ضروری نہیں ؛ بلکہ پیشانی کا گھٹنے کے مقابل ہونا ضروری ہے، جیسا کہ امداد الاحکام میں ہے:

''بحالت جلوس، رکوع کرتے ہوئے صرف اتنا ضروری ہے کہ پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کر دیا جائے ،اس سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں، نہ سرین اٹھانے کی ضرورت ہے'' (امدادالاحکام:۱/۶۰۹)

اب کرسیوں پر نماز ادا کرنے والے حضرات اپنے احوال پر غور فرمائیں کہ کیا واقعتاً وہ اس درجہ معذور ہیں کہ شرعاً ان کے لیے کرسی پر نماز ادا کرنا جائز ہو، اگر وہ اس درجہ میں معذور نہیں تو پھر کرسیوں پر نماز پڑھنے سے احتراز کریں؛ تا کہ ان کی نمازیں شریعت کے مطابق ہوں اور مساجد میں بے ضرورت کرسیوں کی کثرت نہ ہو اور وہ شادی محل یا کوئی فنکشن ہال معلوم نہ ہو، بوقتِ ضرورت کرسی استعمال کرنے کی صورت میں ٹیبل والی کرسی اختیار نہ کی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۲/۵/۲۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دار الافتاء دارالعلوم دیوبند

اذان واقامت کے چند اہم مسائل

محترم جناب مفتی صاحبان! السلام علیکم

برائے کرم مندرجہ ذیل مسائل کا حل تحریر فرمائیں۔

سوال: ﴿۲۹﴾......(۱) کچھ روز قبل آپ نے فتویٰ میں بغیر داڑھی والے شخص کی نماز کو مکروہ

لیکن روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کو آپ نے درست فرمایا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ داڑھی نہ رکھنا اپنے آپ میں ایک الگ مستقل گناہ ہے، یہ گناہ نماز میں کس طرح سرایت کرتا ہے جب کہ روزہ، زکوٰۃ اور حج کے معاملہ میں اس کا کوئی دخل کیوں نہیں ہے؟

(۲) تمام مساجد میں (کچھ مساجد جہاں موذن ہیں) اکثر و بیشتر بغیر داڑھی والے اشخاص اذان دے رہے ہیں اور اذان دہرائی بھی نہیں جاتی ہے، ایسی اذانوں کے نتیجے میں پڑھی گئی نمازیں آیا درست ہیں یا ان کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے؟ کیوں کہ جب اذان ہی مکروہ تحریمی ہے تو نماز میں قباحت ہونا لازمی ہے۔

(۳) میں نے خود کتنی ہی مرتبہ اذان دی ہے، کیا ایسی اذان کے نتیجہ میں پڑھی گئی تمام نمازوں کا وبال مجھ پر ہوگا، اس کا کفارہ کیا ہے یا پھر توبہ کرنا ضروری ہے؟

(۴) کیا نابالغ اور ایسے داڑھی والے شخص کے مقابلہ (جس کا تلفظ اور مخارج صحیح نہ ہوں "اشھد کو اسّد اور حی علی الصّلوٰۃ کو حی الصّلوۃ پڑھے اور معنی ہی فاسد ہو رہے ہوں) بغیر داڑھی والے شخص کی اذان زیادہ معتبر اور قابل قبول نہیں ہوگی، ایسی اذان کے نتیجے میں پڑھی جانے والی نمازوں میں کیا شرعاً کوئی قباحت ہوگی؟

(۵) میں داڑھی نہیں رکھتا ایک بار فجر میں تیز بارش اور آندھی کے سبب میں اور میرا بڑا لڑکا مسجد نہ جا سکے اور بجائے انفرادی نماز پڑھنے کے میں نے امامت کی، کیا نماز ہوگئی یا اس کا لوٹانا واجب ہے؟ ایک اور مرتبہ عام دنوں میں میں نے ایک شخص جن کی داڑھی ایک مشت سے کم تھی (معلوم نہیں وہ کٹواتے ہیں یا داڑھی ہی چھوٹی ہے) کے ساتھ امامت کی نماز ہوگئی یا دوبارہ پڑھنا واجب ہے؟

(۶) مردہ کو رات کے کس حصہ تک دفنایا جا سکتا ہے؟

(۷) مردہ کو غسل دینے اور کفن پہنانے کے بعد اگر اس کے بدن کے کسی حصہ سے خون بہہ کر کفن خراب ہو جائے یا ریح کے ساتھ کچھ نجاست باہر آجائے، تو کیا دوبارہ غسل دینا ہوگا اور کیا دوسرا کفن پہنانا ہوگا؟

(۸) غسل دینے والوں اور کفن پہنانے والوں کے آداب کیا ہیں؟

(۹) کیا امام کے لیے پورا سر ڈھکنا ضروری ہے یا عام طور پر صرف ٹوپی ہی کافی ہے؟

(۱۰) میں نے سنا ہے کہ نماز کے دوران امام کو لقمہ دینے والے کے بھی کچھ آداب ہیں اور عام آدمی کو لقمہ کی اجازت نہیں ہے: لیکن ہر مسجد میں اور ہر ایک نماز میں امام کے پیچھے کوئی عالم یا حافظ موجود نہیں ہوتا، ایسی حالت میں اگر امام صاحب قرأت میں کوئی غلطی کریں تو عام نمازی کے لیے کیا حکم ہے؟

(۱۱) ابوداؤد کی ایک مشہور حدیث کے مطابق، ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو ٹخنے سے نیچے لنگی پہن کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس شخص کی نماز قبول نہیں ہوئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج کے دور میں زیادہ تر حضرات ٹخنے سے نیچے تک پاجامہ یا پینٹ پہنتے ہیں اور دورانِ نماز اس کو فولڈ کر لیتے ہیں یا اڑس لیتے ہیں، لیکن ایک دوسری حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے الٹا کپڑا پہننے یا اڑسنے سے منع فرمایا ہے۔ ایسی حالت میں کیا حکم ہے؟

یہ درخواست بھی ہے مسئلہ نمبر (۱) اور (۴) کے بارے میں ضروری حوالے بھی تحریر فرمائیں عنایت ہوگی۔ احقر محمود احمد (۱۰۸۹/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ادائیگی زکوۃ وروزہ کے واسطے مکلّف کو کسی ہیئت مخصوصہ کے اختیار کرنے کا پابند نہیں کیا گیا ہے، جب کہ نماز میں مخصوص احکام مثل طہارت، ستر وغیرہ کا نمازی کو پابند کیا گیا ہے اور وضع قطع میں بھی ہیئت مسنونہ پر ہونا محمود ومطلوب عند الشرع ہے؛ اس لیے ہیئت مستحسنہ کا نقص اذان، اقامت، نماز میں کراہت کا موجب ہوگا، اسی طرح حج میں ہیئت مسنونہ محمودہ کے نقص سے کراہت پیدا ہوگی روزہ اور زکوۃ میں نہیں۔

(۲) ایک ہے اذان، نماز، امامت کی صحت؛ جو ان چیزوں کی اہلیت کی موجودگی میں ادائیگی ارکان سے حاصل ہو جائے گی، اگر ان چیزوں کے شرائط وارکان میں کمی نہ رہی تو نماز، اذان، امامت کی صحت کا حکم کر دیا جائے گا۔ دوسری چیز ہے کراہت جو امور محمودہ ومطلوبہ میں نقص کی وجہ سے بطور سبب خارجی کے پائی جاتی ہے، جو اصل عبادت کی صحت اور ادائیگی کا حکم کیے جانے کے باوجود بسا اوقات گناہ اور بسا اوقات قلت ثواب کا باعث بنتی ہے؛ لہٰذا شرعی داڑھی کے ساتھ ادا کی گئی نماز، مستحسن ومسنون ہیئت پر ادا کیے جانے کی وجہ سے زیادتیٔ ثواب کا موجب ہوگی، اور غیر

شرعی داڑھی والے شخص کی نماز، اذان، امامت مکروہ ہوگی یعنی ان چیزوں کا ثواب کم ملے گا اور اہل با شرع شخص کی موجودگی میں باعث گناہ بھی ہوگا، قال في الدر: انما يستحق ثواب المؤذنين إذاكان عالما بالسّنة والأوقات ولو غير محتسب (۱)، وقال ايضا: ويكره أذان جنب .... وفاسق ولو عالما لكنه أولٰى بامامة وأذان من جاهل تقي أي حيث لم يوجد عالم تقي................. .... ويعاد اذان جنب ندبا (۲)، اس سے معلوم ہوا کہ ایسی نماز واذان کے اعادہ کا حکم نہیں ہے۔

(۳) آئندہ کے لیے اس گناہ سے توبہ کرلیں اور شرعی داڑھی رکھ لیں؛ تاکہ اذان کا پورا پورا ثواب ملے۔

(۴) اگر باشرع اہل شخص موجود نہیں ہے تو مذکور فی السوال دولوگوں میں سے صحیح تلفظ کرنے والے کی اذان بہتر ہے لٰکنّه (الفاسق العالم) أولى بامامة و أذان من جاهل تقي (حوالہ بالا) اگر چہ ثواب میں کمی رہے گی اور اہل کی موجودگی میں نااہل کی اذان وامامت کرنا مکروہ ہے، یعنی باعث گناہ ہے۔

(۵) لوٹانا نہ واجب ہے نہ مستحب، انفرادی نماز سے جماعت کی نماز بہتر ہے نیز جماعت کا ثواب بھی مل گیا۔ قال في البحر: لو صلّى خلف فاسق او مبتدع ينال فضل الجماعة لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع؛ لقوله صلى الله عيه وسلم: من صلى خلف عالم تقى فكأنّما صلّى خلف نبي واخرج الحاكم فى مستدركه مرفوعا (۳)..................ان سركم ان يقبل الله صلاتكم فليؤمكم خياركم فإنّهم وفدكم فيما بينكم وبين ربكم (۴) معلوم ہوا کہ غیر متقی اور غیر متشرع کے پیچھے نماز

(۱) الدر مع الرد، باب الأذان، ۲/۵۹-۶۰.

(۲) الدر مع الرد، باب الأذان، ۲/۵۹-۶۰.

(۳) المستدرك للحاكم عن مرثدبن أبي مرثد الغنوي، رقم: ۴۹۸۱، باب ذكر مناقب مرثد بن أبي مرثد. (دار الكتب العلميّة)

(۴) البحر الرائق، باب إمامة العبد والأعرابي والفاسق، ۱/۶۱۰.

پڑھنے سے، جب کہ اس سے بہتر امام موجود نہ ہو، نماز ہو جائے گی، جماعت کا ثواب بھی ملے گا، اگر چہ کم ملے گا۔ **قال فی الشّامی: ویکره تنزیھا إمامة .... فاسق الخ لقوله فی الاصل امامة غیرھم أحب إلیّ .... ویکره الاقتداء بھم تنزیھا فان أمکن الصلوة خلف غیرھم فھو أفضل وإلا فالاقتداء أولی من الانفراد .**

(الدر مع الرد: ۲/۲۹۸)

(۶) رات میں کسی بھی وقت دفن کرنے میں کراہت نہیں ہے: **ولا یکره الدّفن لیلا** (الدر مع الرد: ۳/۱۵۵)، البتہ بلا وجہ تاخیر کرنا گناہ ہے۔

(۷) نہ دوبارہ غسل دینے کی ضرورت ہے نہ کفن تبدیل کرنے کی؛ بلکہ اسی طرح دفن کر دیا جائے(۱)

(۸) بہشتی زیور مولفہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور ''احکام میت'' مولفہ ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی قدس سرہما میں تفصیل سے آداب واحکام لکھے ہیں، مطالعہ فرمالیں۔

(۹) ٹوپی پہننا کافی ہے۔

(۱۰) مقتدی کو امام کی غلطی کا یقین ہو جائے اور اپنے علم پر پورا اطمینان ہو، تو اسے لقمہ دے دینا چاہیے، البتہ محض شک وشبہ میں لقمہ دے کر نماز خراب نہ کرے۔ جی ہاں! لقمہ دینے کے بھی آداب واحکام ہیں جن کا سیکھنا مقتدیوں کے لیے بھی ضروری ہے اور امام کے قریب ایسے شخص کو کھڑا کیا جائے جو ان مسائل سے زیادہ واقف ہو (۲)

(۱۱) الٹا کپڑا پہننے میں یہ داخل نہیں ہے، اولاً تو واجب یہی ہے کہ ٹخنہ ڈھکنے والے کپڑے کے پہننے سے احتراز کرے، خواہ نماز کے باہر ہو یا نماز میں پھر بھی اگر بوقت نماز خیال آ گیا اور کپڑا موڑ لیا

(۱) إذا تنجس الکفن بنجاسة المیت لا یضر دفعا للحرج بخلاف الکفن المتنجس ابتداء، وکذا لو تنجس بدنه بما خرج منه ان کان قبل أن یکفن غسل وبعده لا،الخ (الدر مع الرد: ۳/۱۰۳، باب صلاة الجنازة.)

(۲) عن أبي مسعود قال النّبي ـ صلّی اللّٰه علیه وسلّم ـ لیلني منکم أولوا الأحلام والنھی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم، أخرجه مسلم، باب تسویة الصفوف،رقم: ۴۳۴.

تو یہ بھی جائز ہے بلکہ ضروری ہے(۱)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۷/ ۲۹ھ

الجواب صحیح: ظفیر الدین، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ

اذان وامامت کی شرائط

سوال: ﴿۳۰﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام وعلماء عظام: امام کو نماز پڑھانے کے لیے اور مؤذن کو اذان دینے کے لیے شریعت نے کیا شرائط رکھی ہیں؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمادیں، اور قرآن وحدیث کا حوالہ بھی تحریر فرمادیں تو کرم ہوگا۔ والسلام

جاوید اقبال ایڈوکیٹ غازی آباد، معرفت جناب محمد راشد صاحب شعبۂ تعمیرات دارالعلوم دیوبند (۱۴۴۴/ د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

امامت کے صحت کی فقہاء نے چھ شرطیں لکھی ہیں: (۱) مسلمان ہونا، (۲) بالغ ہونا، (۳) عاقل ہونا، (۴) مرد ہونا، (۵) قرآن پڑھنا جانتا ہو، (۶) معذور شرعی نہ ہو۔ یہ شرطیں تو ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی تو امام بننا درست نہ ہوگا، چنانچہ کافر کا امام بننا، نابالغ کا، پاگل کا، یا عورت کا امام بننا، یا بالکل ناخواندہ (امی) کا امام بننا، اور صحت مند لوگوں کے لیے ایسے شخص کا امام بننا جو معذور شرعی ہو (مثلاً اسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہوں) درست نہیں۔(۲)

ان کے علاوہ بعض باتیں ایسی ہیں، جو پنجوقتہ نماز کے لیے مقرر، امام کے اندر ہونی چاہئیں،

---

(۱) إنّ اللّٰہ تعالٰی: لا یقبل صلاۃ رجل مسبل إزارہ . أخرجہ أبو داؤد عن أبي هريرة ضمن حديث طويل، رقم: ٦٣٨، باب الإسبال في الصلاة. اس مسئلہ کی مزید وضاحت دوسرے فتوے میں، ص: ۱۱۸ پر کی گئی ہے۔

(۲) وشروط صحة الإمامة للرجال الأصحاء ستة :(الاول) الإسلام، (والثانی) البلوغ؛ فلا يصح اقتداء بالغ بصبي، (والثالث) العقل لعدم صحة صلاته بعدمه كالسكران، (والرابع) الذكورة خرج به المرأة للأمربتاخيرهنّ، (والخامس) القراءة؛ فلا يصح اقتداء القاري بأمي، (والسادس)السلامة من الأعذار؛ فلا يصح اقتداء غيره به (طحطاوي على المراقي: /٢٨٨ كتاب الصلاة، باب الامامة ط: دار الكتاب ديوبند)، ومثله في الدر مع الرد: كتاب الصّلاة، باب الإمامة.

مثلاً قرآن اچھا پڑھنا، نماز اور طہارت کے مسائل سے واقف ہونا، نیک صالح ہونا، لوگوں کو دین واخلاق کی باتیں بتلا کر ان میں الفت ومحبت اور دین کی رغبت قائم رکھنا، فواحش اور افعال فسقیہ سے اجتناب کرنے والا ہونا، **قال في الدر المختار: والأحق بالإمامة تقديما بل نصبا أي للإمام الراتب ، الأعلم بأحكام الصلوة .... بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... ثم الأحسن تلاوة الخ** (۱)، **أخرج الحاكم في مستدركه مرفوعاً :إن سركم أن يقبل الله صلاتكم فليؤمكم خياركم، فإنهم وفدكم فيما بينكم وبين ربكم** (۲)، **وقال في الدر: ومن حكمها نظام الألفة وتعلم الجاهل من العالم** (۳)۔ چنانچہ مرتکب کبیرہ کو امام بنانا یا ضروری مسائل سے نابلد یا قرآن غلط پڑھنے والے کو امام بنانا، مکروہ تحریمی ہے؛ بلکہ کبھی امامت بالکلیہ درست نہیں ہوتی۔ **وفي الدر مع الرد:ويكره تنزيها إمامة .... فاسق الخ، قال الشامي: بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا** (۴)، اور جب امام مقرر نہ ہو، بلکہ بروقت امامت کے لیے کھڑا ہونا ہے تو بقدر ضرورت صحت کے ساتھ قرآن پڑھنے اور ضروری مسائل سے واقفیت رکھنے کے ساتھ جو کبائر سے مجتنب ہونے میں اور نیکی وصلاح میں بڑھا ہوا ہو، اسے امام بنانا چاہیے، اوصاف امامت میں کم درجہ والے شخص کو امام بنانے سے یا مجبوراً فاسق کے پیچھے پڑھنے سے ثواب میں کمی رہے گی، **قال في البحر: لو صلّى خلف فاسق أو مبتدع ينال فضل الجماعة، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع لقوله صلى الله عليه وسلم: من صلى خلف عالم تقي، فكأنما صلى خلف نبي الخ** (۵)۔

اوصاف امامت سے متصف باشرع لوگوں کی موجودگی میں مرتکب کبیرہ یا فاسق (مثلا سودخور یا

---

(۱) الدر مع الرد:۲/۲۹۴، كتاب الصّلوة، باب الإمامة.

(۲) مستدرك حاكم، ذكر مناقب مرثد بن أبي مرثد، رقم :۴۹۸۱.

(۳) الدر مع الرد:۲/۲۸۷، كتاب الصّلوة، باب الإمامة.

(۴) ۲۹۹، أيضاً

(۵) الف: البحر الرائق :۱/۶۱۰، كتاب الصلاة، باب الامامة.

ب: نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية، باب الأمامة.

ریش تراشیدہ) کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، قال في الدر: ولو أم قوما وهم له كارهون، إن الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالإمامة منه كره له ذلك تحريماً.(۱)

اگر سب ریش تراشیدہ ہوں تو قرآن اچھا پڑھنے اور مسائل سے واقفیت رکھنے اور دینداری میں جو بہتر ہو اس کا مجبوری میں امامت کرنا جائز ہے اور سب کا جماعت سے نماز پڑھنا تنہا، تنہا پڑھنے سے بہتر ہے، قال في الشامية: ويكره الاقتداء بهم تنزيها، فإن أمكن الصلوة خلف غيرهم، فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد.(۲)

یہی حکم اس وقت بھی ہے جب نیک صالح لوگ قرآن صحیح پڑھنا نہ جانتے ہوں، مسائل سے نا واقف ہوں تو مجبوراً ریش تراشیدہ -جس میں اہلیت ہو- کا امامت کرنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، قال في الدر: لكنه (أي الفاسق العالم) أولى بإمامة وأذان من جاهل تقي، قال الشامي: أي حيث لم يوجد عالم تقي.(۳)

مؤذن کی شرائط: اذان دینے والے کا مسلمان، عاقل اور مذکر ہونا ضروری ہے، چنانچہ کافر یا پاگل کی اذان درست نہیں (۴)، اور عورت کی اذان مکروہ ہے، بالغ ہونا مؤذن کے لیے ضروری نہیں، چنانچہ سمجھ دار بچہ کی اذان درست ہے (۵)۔

مؤذن کی صفات: جسے مؤذن بنایا جائے وہ کلمات اذان کو صحیح طور پر ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہو، اوقاتِ نماز سے واقف ہو، نیز نیک وصالح ہو، چنانچہ فاسق کی اذان مکروہ ہے اور ایسے شخص کی موجودگی میں جو نیک وصالح ہو، اذان کی اہلیت رکھتا ہو، فاسق کا اذان کے لیے اقدام کرنا گناہ ہے اور شخص مذکور کی عدم موجودگی میں فاسق (غیر متشرع) شخص اذان کہہ سکتا ہے؛ مگر اسے ثواب کم ملے

---

(۱) الدر مع الرد: ۲/ ۲۹۷، كتاب الصلوة، باب الإمامة.

(۲) أيضاً.

(۳) الدر مع الرد: ۲/۶۰، كتاب الصلوة، باب الأذان.

(۴) أيضاً: ۲/۶۱.

(۵) وكره أذان المرأة فيعاد ندبا، كذا في الكافي، أذان الصبي العاقل صحيح من غير كراهة في ظاهر الرواية (الفتاوى الهنديّه: ۱/۵۴، باب الأذان، الفصل الأول في صفته وأحوال المؤذن.

گا۔ قال في الدر: إنما يستحق ثواب المؤذنين إذا كان عالما بالسنة والأوقات ولو غير محتسب(۱)، وقال أيضا: ويكره أذان جنب .... وفاسق ولو عالما لكنه أولى بإمامة وأذان من جاهل تقي،قال الشامي:أي حيث لم يوجد عالم تقي (۲)
ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اہل کی موجودگی میں نا اہل کا اذان وامامت کرنا مکروہ، باعث گناہ ہے، اور اگر متشرع اہل شخص موجود نہ ہو تو صحیح تلفظ والے کی اذان بہتر ہے اگر چہ اسے ثواب کم ملے گا، اقامت (تکبیر) کہنے کا بھی یہی حکم ہے جو اذان کا لکھا گیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/ ۹/ ۳۱ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلندشہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

حنفیہ کے نزدیک جمع بین الصلاتین کا حکم

احادیث وآثار کی روشنی میں

معظم ومحترم جناب مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۳۱﴾ گذارش ہے کہ میں شہر الہ آباد (یوپی) ہندوستان کا باشندہ ہوں، کچھ عرصہ سے بسلسلہ ملازمت، ریاض سعودی عرب میں مقیم ہوں، یہاں پر میرے ہم مسلک (حنفی) بہت سے ہندوستانی و پاکستانی احباب بہ سلسلہ ملازمت رہتے ہیں، سب انگریزی داں ہیں، دینی رجحان تو رکھتے ہیں، لیکن اپنے حنفی مسلک کے مسائل میں پختگی نہ ہونے کی وجہ سے اور یہاں سعودی عرب میں عملی طور سے جو کچھ یہاں کے لوگوں کو کرتے دیکھتے ہیں، ویسے ہی خود بھی عمل کرنے لگتے ہیں، کچھ باتیں تو فروعی ہیں، لیکن کچھ اہمیت کی حامل بنیادی ہیں، فی الحال آپ کی توجہ ایک اہم ضروری مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، سفر میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء ملا کر ایک ساتھ پڑھتے ہیں ،یعنی ظہر کے وقت ظہر وعصر کی یا عصر کے وقت ظہر کی اور ایسے ہی مغرب اور عشاء میں یہاں کے لوگ پڑھتے ہیں اور اس سلسلہ میں بخاری شریف کا حوالہ دیتے ہیں، بخاری شریف کی جن حدیثوں کا

(۱) الدر مع الرد: ۲/ ۵۹، كتاب الصّلاة، باب الأذان.
(۲) أيضاً: ۲/ ۶۰.

حوالہ دیتے ہیں ان کی عکسی نقل منسلک ہے۔ دریافت طلب مسائل درج ذیل ہیں:

(ا) منسلکہ عکسی مضمون (ا) کے صفحہ: ۲۲۸ پر جو حدیث نمبر: ۱۱۰۶/ لغائت ۱۱۰۸/ درج ہیں، ان

(ا) منسلکہ عکسی مضمون

سفر میں نمازوں کو ملا کر پڑھنا

(ترجمہ بخاری شریف جلد دوم: مولانا محمد داؤد راز)

ترجمہ: (۱۱۰۶) ہم سے علی بن عبد اللہ مدینی نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان بن عیینہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ میں نے زہری سے سنا، انہوں نے سالم سے اور انہوں نے اپنے باپ عبد اللہ بن عمر سے کہ نبی اکرم ﷺ کو اگر سفر میں جلد چلنا منظور ہوتا تو مغرب اور عشاء ایک ساتھ ملا کر پڑھتے۔

ترجمہ: (۱۱۰۷) اور ابراہیم بن طہمان نے کہا کہ ان سے حسین معلم نے بیان کیا، ان سے یحییٰ بن ابی کثیر نے بیان کیا، ان سے عکرمہ نے بیان کیا اور ان سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ ملا کر پڑھتے، اسی طرح مغرب اور عشاء کی بھی ایک ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔

ترجمہ: (۱۱۰۸) اور ابن طہمان ہی نے بیان کیا کہ ان سے حسین نے، ان سے یحییٰ بن ابی کثیر نے، ان سے حفص بن عبید اللہ بن انس نے اور ان سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ سفر میں مغرب اور عشاء ایک ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔ اس روایت کی متابعت، علی بن مبارک اور حرب نے یحییٰ سے کی ہے، یحییٰ حفص سے اور حفص انس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (مغرب اور عشاء) ایک ساتھ ملا کر پڑھی تھیں۔

تشریح: امام بخاریؒ جمع کا مسئلہ، قصر کے ابواب میں اس لیے لائے کہ جمع بھی گویا ایک طرح کا قصر ہی ہے، سفر میں ظہر، عصر اور مغرب وعشاء کا جمع کرنا اہلِ حدیث اور امام احمد اور امام شافعی اور ثوری اور اسحاق سب کے نزدیک جائز ہے، خواہ جمع تقدیم کرے: یعنی ظہر کے وقت عصر اور مغرب کے وقت عشاء پڑھ لے، خواہ جمع تاخیر کرے: یعنی عصر کے وقت ظہر اور عشاء کے وقت مغرب بھی پڑھ لے، اس بارے میں مزید تفصیل مندرجہ ذیل احادیث سے معلوم ہوسکتی ہے۔

عن معاذ بن جبل رضی اللّٰه عنه قا ل: كان النبي – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – في غزوة تبوك، إذا زاغت الشمس قبل أن يرتحل جمع بين الظهر والعصر وإن ارتحل قبل أن تزيغ الشمس أخّر الظهر حتى ينزل للعصر، وفي المغرب مثل ذٰلك إذا غابت الشمس قبل أن يرتحل جمع بين المغرب والعشاء وإن ارتحل قبل أن تغيب الشمس أخّر المغرب حتى ينزل للعشاء ثم جمع بينهما. رواه أبو داؤد والترمذي وقال: هذا حديث حسن غريب . یعنی معاذ بن جبل کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک میں آں حضرت ﷺ اگر کسی دن کوچ کرنے سے پہلے سورج ڈھل جاتا تو آپ ظہر اور =

کی اصلیت وحقیقت کیا ہے؟ یعنی صحیح ہیں یا ضعیف ہیں؟

= عصر ملا کر پڑھتے (جسے جمع تقدیم کہا جاتا ہے)، اور اگر کبھی آپ کا سفر سورج ڈھلنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا تو ظہر اور عصر ملا کر پڑھتے (جسے جمع تاخیر کہا جاتا ہے)، مغرب میں بھی آپ کا یہی عمل تھا، اگر کوچ کرتے وقت سورج غروب ہو چکا ہوتا تو آپ مغرب اور عشاء ملا کر پڑھ لیتے اور اگر سورج غروب ہونے سے قبل ہی سفر شروع ہو جاتا تو پھر مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے ساتھ ملا کر ادا کرتے۔ مسلم شریف میں بھی یہ روایت مختصر مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ غزوۂ تبوک میں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء ملا کر پڑھ لیا کرتے تھے۔

ایک اور حدیث حضرت انس سے مروی ہے، جس میں مطلق سفر کا ذکر ہے اور ساتھ ہی حضرت انس یہ بھی بیان فرماتے ہیں ''**كان رسول الله – صلّى الله عليه و سلّم – إذا ارتحل قبل أن تزيغ الشمس أخّر الظهر إلى وقت العصر. الحديث**'' یعنی سفر میں آنحضرت ﷺ کا یہی معمول تھا کہ اگر سفر سورج ڈھلنے سے قبل شروع ہوتا، تو آپ ظہر کو عصر میں ملا لیا کرتے تھے اور اگر سورج ڈھلنے کے بعد آپ سفر کرتے تو ظہر کے ساتھ عصر ملا کر سفر شروع کرتے تھے۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایسا ہی مروی ہے، اس میں مزید یہ ہے کہ "**قال سعيد فقلت لابن عباس: ما حمله على ذلك، قال: أراد أن لا يحرج أمته** (رواہ مسلم: ۶:۲۴۶) یعنی سعید نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: آپ ﷺ نے یہ اس لیے کیا تا کہ امت تنگی میں نہ پڑ جائے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس بارے میں حضرت علی اور انس اور عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ اور ابن عباس اور اسامہ بن زید اور جابر رضی اللہ عنہم سے بھی مرویات ہیں اور امام شافعی اور امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سفر میں دو نمازوں کا جمع کرنا۔ خواہ جمع تقدیم ہو یا تاخیر۔ بلا خوف وخطر جائز ہے۔

علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں امام شافعیؒ سے اور اکثر لوگوں کا قول نقل کیا ہے کہ سفر طویل میں جو ۴۸/ میل ہاشمی پر بولا جاتا ہے، جمع تقدیم وجمع تاخیر ہر دونوں طور پر جمع کرنا جائز ہے اور چھوٹے سفر کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں اور ان میں بہت صحیح قول یہ ہے کہ جس سفر میں نماز کا قصر کرنا جائز نہیں، اس میں جمع بھی جائز نہیں ہے۔ علامہ شوکانی **درر البهيه** میں فرماتے ہیں کہ مسافر کے لیے جمع تقدیم اور تاخیر ہر دو طور پر جمع کرنا جائز ہے؛ خواہ اذان اور اقامت سے ظہر میں عصر کو ملائے یا عصر کے ساتھ ظہر ملائے، اس طرح مغرب کے ساتھ عشاء پڑھے یا عشاء کے ساتھ مغرب ملائے، حنفیہ کے ہاں سفر میں جمع کر کے پڑھنا جائز نہیں ہے، ان کی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت ہے جسے بخاری اور مسلم اور ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ میں نے مزدلفہ کے سوا کہیں نہیں دیکھا کہ آں حضرت ﷺ نے دو نمازیں ملا کر ادا کی ہوں۔

اس کا جواب صاحب ''**مسك الختام**'' نے یوں دیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ بیان ہمارے مقصود کے لیے ہرگز مضر نہیں ہے کہ یہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے اس بیان کے خلاف بیان دے رہے ہیں جیسا کہ محدث سلام اللہ نے محلّی شرح مؤطا امام مالکؒ میں مسند ابی سے نقل کیا ہے کہ ابوقیس ازدی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آں حضرت ﷺ سفر میں دو نمازوں کو جمع فرمایا کرتے تھے، =

(۲) کیا منسلکہ عکسی مضمون کے صفحہ:۲۲۹/ کے آخر میں جو قرآن مجید کی سورہ نساء کی آیت نمبر: ۱۰۳ر یعنی نماز مومنوں پر وقت مقررہ میں فرض ہے، اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث درج ہے ان سے مندرجہ بالا حدیث نمبر/۱۱۰۶ الغائت ۱۱۰۸/ مطابقت کرتی ہیں؟

(۳) کیا حدیث نمبر:۱۱۰۶/ لغائت ۱۱۰۸/ مذکور سورہ نساء کی آیت نمبر:۱۰۳ر کے نازل ہونے کے پہلے کی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان کا کیا اثر؟

براہ کرم مسائل مندرجہ بالا کا مفصل جواب مع حوالہ جات مرحمت فرمائیں، تاکہ میں اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر سکوں اور ان لوگوں کو تسلی و تشفی ہو جائے، عین نوازش ہوگی۔

دعاؤں کا طالب: محمد عبد الباری (۱۰۴۹/ د ۱۴۲۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

سوالنامہ کے ہمراہ بخاری شریف مترجم کے چند صفحات موصول ہوئے، بطور جواب مختصراً عرض ہے کہ: کسی حکم شرعی کے ثابت ہونے کی چار دلیلیں ہیں، جن سے علی الترتیب مرتبے کے فرق سے حکم شرعی ثابت ہوتا ہے: کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاس (۱) نماز کے اوقات کے سلسلے میں قرآن پاک میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَوْقُوْتًا. (سورہ نساء:۱۰۳)، اس سے معلوم ہوا کہ نماز وقت مقررہ میں فرض کی گئی ہے، اور اس بات کی اہمیت درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتی ہے:

(۱) عن عثمان بن عبد اللّٰه بن موهب قال: سئل أبو هريرة: ما التفريط في الصلاة؟

= اب ان کے پہلے بیان میں نفی ہے اور اس میں اثبات ہے، اور قاعدہ مقررہ کی رو سے نفی پر اثبات مقدم ہوتا ہے؛ لہٰذا ثابت ہوا کہ ان کا پہلا بیان محض نسیان کی وجہ سے ہے، دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اللہ پاک نے قرآن مجید میں فرمایا: "اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَوْقُوْتًا" (سورۃ النساء، آیت:۱۰۳) یعنی نماز مومنوں پر وقت مقررہ میں فرض ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے مفسر اول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے نماز میں جمع ثابت ہے۔ انتہی

(۱) اعلم أن أصول الشرع ثلاثة، والمراد بها أي بالأصول: الأدلة: الكتاب والسنة وإجماع الأمة، والأصل الرابع القياس (نور الانوار: ۷، بحث أدلة الشرع وأصوله، ط: ياسر نديم).

قال: أن تؤخر حتی یجیئ وقت الأخری. رواه الطحاوي واسناده صحیح(۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ نماز میں تفریط (کوتاہی) کیا ہے؟ تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ (کوتاہی) یہ ہے کہ (نماز کو) اتنی تاخیر سے ادا کرے کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(۲) وعن أبي قتادہ: أن رسول اللّٰہ ـ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ـ قال: أما إنہ لیس في النوم تفریط، إنما التفریط علی من لم یصل حتی یجیئ وقت الصلوٰۃ الأخری. رواہ مسلم(۲).

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سنو! سونے میں تفریط نہیں؛ لیکن تفریط تو اس شخص کی جانب سے ہے، جو نماز نہ پڑھے یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(۳) وعن طاؤس عن ابن عباسؓ قال: لا یفوت صلوۃ حتی یجیئی وقت الأخری. رواہ الطحاوي واسنادہ صحیح(۳).

ابن عباسؓ سے مروی ہے: وہ فرماتے ہیں کہ نماز فوت نہیں ہوتی؛ مگر اس وقت جب دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(۴) وعن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ قال: ما رأیت رسول اللّٰہ ـ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ـ صلّی صلوۃً إلا لوقتہا إلا أنہ جمع بین الظہر والعصر بعرفۃ والمغرب والعشاء بجمع(۴).

حضرت ابن مسعودؓ نے بیان کیا کہ میں نے حضور ﷺ کو کبھی بھی بے وقت نماز ادا کرتے نہیں دیکھا، سوائے اس کے کہ آپ ﷺ نے ظہر اور عصر کو عرفہ میں اور مغرب اور عشاء کو جمع (مزدلفہ) میں جمع کیا۔

(۵) أخرج الترمذي عن ابن عباسؓ عن النبی ـ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ـ قال: من جمع بین الصلوٰتین من غیر عذر فقد أتی بابا من أبواب الکبائر، أخرجہ

(۱) آثار السنن للنیموي: ۲/۷۵، کتاب الصلاۃ، باب النهي عن الجمع في الحضر: أصح المطابع لکنئو.

(۲) أخرجہ مسلم في صحیحہ: رقم: ۶۸۱، باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ.

(۳) مصنف عبدالرّزّاق، باب من نسي صلاۃ الحضر و الجمع، رقم: ۴۴۲۰.

(۴) أخرجہ أبوداؤد بمعناہ، باب الصلاۃ بجمع، رقم: ۱۹۳۴.

الترمذی، باب ما جاء فی الجمع بین الصلاتین فی الحضر، رقم: ۱۸۸.

ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے بلا عذر دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کیا، اس نے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

(۶) **وقد صح عن عمر بن الخطابؓ أنّه كتب إلى أبي موسیٰؓ، واعلم ! أن جمعا بين الصلوتين من غيرعذر من الكبائر (۱)، وفي حديث: ثلاث من الكبائر : منها الجمع بين الصلوٰتين إلا من عذر (۲).**

حضرت عمر نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھ بھیجا کہ جان لو کہ بلا عذر دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنا گناہِ کبیرہ ہے۔

آیت قرآنی اور احادیث نمبر ۱، ۲، ۳، سے معلوم ہوا کہ نماز وقت مقررہ پر پڑھنا فرض ہے اور بے وقت کر کے پڑھنا گناہ ہے، اس کو حدیث میں تفریط کہا گیا ہے، اور حدیث نمبر: ۴ر میں سوائے عرفہ ومزدلفہ کے، آپ ﷺ کے جمع کرنے کی صراحۃً نفی کی جارہی ہے، حدیث نمبر: ۵-۶ میں بغیر عذر کے جمع کرنے کو گناہ کبیرہ کہا جارہا ہے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ قرآن کے شارح اور مفسر ہیں؛ لیکن بخاری شریف کی مذکور فی السوال تینوں حدیثوں میں یا ان کے علاوہ کسی اور حدیث میں، اس بات کا صراحۃً ذکر نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے وقت آنے سے پہلے نماز پڑھ لی ہو، صرف جمع کرنے کا لفظ ہے، اگر اس لفظ سے مراد، وقت سے پہلے نماز پڑھنا لیا جائے تو یہ روایتیں دوسری صحیح روایتوں اور آیتِ قرآنی کے معارض ہوجائیں گی، اور اگر جمع صوری پر محمول کیا جائے، جیسا کہ آگے آنے والی روایتوں میں اس کی صراحت ہے، یعنی آپ ﷺ اس طرح جمع کرتے تھے کہ ظہر کے آخری وقت میں ظہر کی نماز پڑھتے اور عصر کے ابتدائی وقت میں عصر کی نماز اس شکل میں جمع پر عمل ہونے کے ساتھ ہر نماز اپنے اپنے وقت میں ادا ہوجائے گی، جب کہ متعدد روایات سے اس جمع صوری کی تائید بھی ہوتی ہے، جیسا کہ ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ کے مؤذن نے (دورانِ سفر) یاد دہانی کرائی کہ نماز! تو

(۱) مصنف عبد الرزاق، باب المواقيت، رقم: ۲۰۳۵.

(۲) السنن الكبرى للبيهقي، رقم: ۵۵۶۰.

انہوں نے کہا کہ چلتے رہو، چلتے رہو، یہاں تک کہ جب شفق کے غائب ہونے سے تھوڑا پہلے کا وقت ہوا، تو مغرب کی نماز پڑھی، پھر انتظار کیا یہاں تک کہ شفق غائب ہوگئی تو عشاء کی نماز پڑھی، پھر انہوں نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ سفر میں ایسا ہی کرتے تھے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

(۷) إن مؤذن ابن عمرؓ قال: الصّلاة، قال: سرْ سرْ حتى إذا كان قبل غيوب الشفق، نزل فصلى المغرب، ثم انتظر حتى غاب الشفق، فصلى العشاء، ثم قال: إن رسول اللّه ـ صلى اللّه عليه وسلّم ـ كان إذا عجل به أمر صنع مثل الّذي صنعت.

(رواہ ابوداوٗد، رقم:۱۲۱۲، باب الجمع بين الصلاتين)

رہی حضرت انسؓ کی روایت جو سوال نامے کے عکسی مضمون میں شرح کے طور پر مذکور ہے تو حضرت انس کی ہی دوسری روایت میں یہ بات اور واضح طور پر مذکور ہے:

(۸) أنّه كان إذا أراد أن يجمع بين الصلوتين في السفر أخّر الظهر إلى آخر وقتها وصلى العصر فى أوّل وقتها ويصلى المغرب إلٰى آخر وقتها ويصلى العشاء فى أوّل وقتها ويقول هكذا كان رسول اللّٰه صلّى اللّه عليه وسلّم يجمع بين الصلوتين فى السفر. (مجمع الزوائد، رقم:۲۹۷۴، دار الفکر، بیروت)

صحابۂ کرام، رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل کے ترجمان اور شارح ہیں، وہ حضرات جمع کرنے کی جو وضاحت اور طریقہ بیان کررہے ہیں، دوسری روایتوں میں آئے ہوئے جمع کے لفظ سے وہی مراد ہوگی، مذکورہ حدیث نمبر ۷، ۸ سے سوال میں پیش کردہ بخاری کی احادیث کی تشریح بھی ہوجاتی ہے کہ بخاری کی روایتوں میں جمع کرنے سے اسی طرح کی جمع مراد ہے، ان کے علاوہ اور بھی روایات ہیں، مثلاً نسائی کی روایت میں بتلایا کہ سفر میں اس طرح جمع کیا جاتا ہے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا، رہی معاذ بن جبل کی روایت جو شارح نے پیش کی ہے اولاً تو وہ مذکورہ احادیث اور قرآنی آیت کے خلاف ہے؛ کیوں کہ اس میں وقت سے پہلے پڑھنے کا ذکر ہے، دوسرے یہ کہ حاکم شہید نے کہا کہ: یہ حدیث موضوع ہے، معاذ بن جبلؓ کے نیچے کے راوی ابو الطفیل ہیں، ان سے اس حدیث کو سوائے یزید بن حبیب کے اور کوئی راوی بیان نہیں کررہے ہیں، اور معاذ بن جبل کے شاگردوں میں بھی، ابوالطفیل کے علاوہ کسی نے بھی اس روایت کو نقل نہیں کیا۔

قال الحاكم في علوم الحديث :هذا شاذ الإسناد والمتن ، وأئمة الحديث إنما سمعوه تعجبامن إسناده ومتنه ،قال: فنظرنا فإذا الحديث موضوع (۱)، وقد بسط الكلام في حديث معاذ هذا، ابن امير الحاج في غنية المستملي قبيل فصل فى صلوٰة الجمعة(۵۰۸).

وقال أبو داؤد :''ليس في تقديم الوقت حديث قائم''كذا في عمدة القاري شرح البخاري: ۵۶۹/۳۔ نیز حدیثِ معاذ کا مفہوم مذکورہ بالا احادیث اور آیت قرآنی کے مفہوم اور دلالت کے خلاف ہونے کے ساتھ اُس مشہور شرعی اصول کے بھی خلاف ہے کہ نماز کا وقت نماز کے لیے شرط یا سبب ہے،اس کے آنے سے پہلے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے (۲)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ (۱) جن روایتوں میں جمع کا لفظ آیا ہے اس سے مراد جمع صوری ہے،(۲) جمع تقدیم صراحۃً کسی بھی صریح صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

رہی حدیث نمبر ۵،۶ تو اس میں بلا عذر جمع کرنے کو گناہ قرار دیا جارہا ہے، کیوں کہ بلا عذر جمع صوری بھی کراہت سے خالی نہیں، حنفیہ کے یہاں اس سے مراد جمع تاخیر ہے، جو عذر کی صورت میں جائز ہے،جیسا کہ صاحب ردالمحتار نے لکھا ہے: المسافر إذا خاف اللصوص أو قطاع الطريق ولا ينتظره الرفقة جاز له تاخير الصلوة؛ لأنه بعذر (۳)، قال صاحب إعلاء السنن: فجمع التاخير بين الصلوٰتين بعذر يجوز عند الحنفية أيضا(۴)۔

جب کہ امام مالک، احمد، شافعی رحمہم اللہ جمع تقدیم کو بھی عذر میں جائز قرار دیتے ہیں؛ لیکن عذر کی تعیین میں ان کے درمیان بڑا اختلاف ہے کہ جمع کے سلسلے میں کون سا عذر معتبر ہے، کسی نے سفر کا اعتبار کیا، کسی نے بارش کو عذر قرار دیا، کسی نے یہ کہا کہ نماز ادا کرنے میں مشقت وضعف ہو تو اس عذر سے جمع تقدیم کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ امام بخاریؒ کی مذکورہ تینوں روایتوں کی تشریح ہم خود کرنے کے بجائے مذکورہ

(۱)معرفة علوم الحديث، ذكر النوع الثامن والعشرين.
(۲) وسببها ترادف النعم، ثم الخطاب، ثم الوقت (الدر مع الرد: ۱۰/۲، كتاب الصلوٰة)
(۳) الدر مع الرد: ۴۶/۲،كتاب الصلوة، قبيل باب الأذان.
(۴) إعلاء السنن :۸۲/۲أبواب الصلاة، ط:إدارة العلوم پاكستان.

بالا حدیث نمبر: ۷،۸ میں اس کی جو شرح موجود ہے، اس کو اختیار کریں، جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں حدیثوں کی روشنی میں جمع صوری کو اختیار فرمایا ہے، جس سے قرآن شریف کی آیت پر بھی عمل ہوجاتا ہے اور احادیث بھی معمول بہا ہوجاتی ہیں، اس کے برخلاف دیگر ائمہ کرام کے طرز عمل سے ایک حدیث معمول بہا بنتی ہے، دوسری تمام حدیثیں اور آیت کریمہ متروک ہوجاتی ہیں۔

سوال نامے میں ''مسک الختام'' کے حوالے سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی جو روایت، محلی شرح موطاً سے نقل کی گئی ہے، وہ ان کی پہلے ذکر کردہ روایت ر۴ سے متعارض نہیں ہے؛ کیوں کہ اس روایت میں مراد جمع حقیقی ہے، جیسا کہ مزدلفہ اور عرفہ میں ہوتا ہے اور محلی میں ذکر کردہ روایت سے مراد جمع صوری ہے، شارح نے اپنی ابلہی ونادانی سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر اتنا بڑا الزام واتہام عائد کردیا کہ ''پہلا بیان نسیان کی وجہ سے ہوا ہے'' فـإلـى الـلّـه المشتكى، اور حاکم شہید نے علوم الحدیث میں حضرت معاذ بن جبل کی روایت کے سلسلے میں جو بات کہی ہے، اس کو مکرر پیش نظر کرلیں ''**هـذا شـاذ الاسناد والمتن وأئمّة الحديث إنما سمعوه تعجبا من إسناده ومتنه قال فنظرنا فإذالحديث موضوع**''.

آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں:

(۱) حدیث صحیح ہے، لیکن حدیث کا مصداق جمع تقدیم نہیں، بلکہ اس سے مراد جمع صوری ہے۔

(۲) جواب تفصیل سے گزر گیا۔

(۳) پہلے یا بعد میں نازل ہونے کا کوئی اثر اس مسئلے پر نہیں پڑتا، آیت قرآنی اپنے معنی میں حجت قطعیہ ہے اور احادیثِ نبویہ اس کی تفسیر ہیں اور آثارِ صحابہ ان کی تشریح وتوضیح۔ **وبـعـض التـفصيل في إعلاء السنن: ۸۲/۲، وقـد أطـال شراح الحديث والفقهاء الكلام على هـذا الـمبـحـث وأحـاطوا البحث بجميع جهاته، وقد ذكرت نبذةً منها بتوفيق اللّٰه وعونه، عليه توكلت وإليه أنيب.** فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/ ذی الحجہ/ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ

جواب مفصل ومدلل ہے، اور ایک خاص نکتہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ امام بخاری رحمہ اللہ جمع حقیقی

کے قائل نہیں، نہ جمع تقدیم کے اور نہ جمع تاخیر کے، ان کے نزدیک جمع کی تمام روایات جمع صوری پر محمول ہیں، یہی رائے حنفیہ کی ہے، اور امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنی ہی رائے کے موافق روایات لاتے ہیں، دوسری رائے کے دلائل سے اغماض کرتے ہیں یا غیر محل میں لاتے ہیں۔

اور اس کی دلیل کہ امام بخاری رحمہ اللہ جمع حقیقی کے قائل نہیں: یہ ہے کہ انھوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو کنڈم کیا ہے جو جمع تقدیم وتاخیر میں صریح ہے، اور وہی قائلین جواز کی واحد دلیل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے قتیبہؒ سے پوچھا: جب آپ نے یہ حدیث لیث بن سعد سے لکھی تھی تو آپ کے پاس کون بیٹھا تھا، انہوں نے بتایا کہ خالد مدائنی بیٹھا تھا، امام بخاری نے فرمایا: چوری پکڑی گئی، خالد مدائنی اساتذہ کی حدیثوں میں اضافہ کیا کرتا تھا یعنی مفصل حدیث میں جو تفصیل ہے وہ قتیبہ کی نظر بچا کر ان کی کاپی میں خالد مدائنی نے لکھ دی ہے، ورنہ یہ حدیث درحقیقت مجمل ہے اور وہ مسلم شریف میں ہے۔

پس سائل نے جو امام بخاری رحمہ اللہ کی باب کی حدیثوں سے جو جمع حقیقی پر استدلال کیا وہ توجیه القول بما لا یرضی به قائله کے قبیل سے ہے۔ واللہ اعلم

حررہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

مقتدی دورانِ نماز ہاتھ کہاں باندھے؟

احادیث وآثار کی روشنی میں

سوال: ﴿۳۲﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ذیل کے مسئلے میں:

دورانِ نماز ہاتھ ناف کے نیچے باندھا جائے گا یا سینے پر؟ ابوحنیفہؒ اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں؟ ان کا مسلک احادیث وقرآن سے واضح کریں؟ بعض لوگ سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ حدیث پیش کرتے ہیں، اس کا کیا جواب ہوگا؟ براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

محمد تفصیل سیتامڑھی (۱۳۵۷/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

حنفیہ کے نزدیک نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا مسنون ہے (۱) ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) **عن علقمه بن وائل بن حجر عن أبيه قال: رأيت النّبي – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – يضع يمينه على شماله في الصّلاة تحت السّرّة** (آثار السنن: ۱/۶۹)

ترجمہ: علقمہ بن وائل بن حجر اپنے والد، وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھتے ہیں، ترمذی کی شرح ابی الطیب میں اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں: یہ حدیث سند ومتن کے اعتبار سے صحیح ہے اور لائقِ استدلال ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس دلیل نہیں، ان کا یہ قول بلادلیل ہے۔ **فهذا حديث صحيح سندا ومتناً**،(۲)

(۱) **وسننها رفع اليدين للتحريمة.......... وضع يمينه على يساره تحت السرّة. الدر مع الرّد: ۲/۱۷۲.**

ہاتھ باندھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھے اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور چھوٹی انگلی کا حلقہ بنا کر بائیں ہاتھ کے پہنچے کو پکڑے اور باقی تین انگلیاں کلائی پر پھیلی ہوئی رکھے۔ **ووضع يمينه على يساره تحت سرته آخذاً رسغها بخنصره وابهامه............ أي يحلق الخنصر والإبهام على الرسغ ويبسط الأصابع الثلاث. الدر مع الرّد: ۲/۱۸۷**۔ شوافع کے نزدیک سینے کے نیچے ناف کے اوپر ہاتھ باندھنا مستحب ہے۔ **ويجعلهما تحت صدره وفوق سرته هذا هو الصحيح المنصوص. المجموع: ۳/۳۱۰**۔ اور امام احمد بن حنبلؒ سے اس سلسلے میں تین روایتیں منقول ہیں؛ البتہ متون میں ان کا مسلک احناف کے مطابق بیان کیا گیا ہے.........

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ کے جس نسخے کی تحقیق وتصحیح علامہ عبدالخالق افغانی نے کی ہے، اس میں یہ روایت موجود ہے؛ مگر اس میں "تحت السرة" کا لفظ نہیں ہے؛ اسی وجہ سے بعض متاخرین نے "تحت السرة" کے اضافے کا انکار کیا ہے، چنانچہ علامہ حیات سندھی نے فرمایا کہ میں نے مصنف ابن ابی شیبہ کے صحیح نسخے کو دیکھا؛ لیکن مجھے اس میں یہ زیادتی نہیں مل سکی، اس کا جواب علامہ قائم سندھی نے اپنے رسالے "فوز الكرام" میں یہ دیا ہے کہ میں نے خود مصنف ابن ابی شیبہ کے تصحیح شدہ نسخے میں یہ روایت "تحت السرة" کے اضافے کے =

(۲) عن الحجاج بن حسان قال: سمعت أبا مجلز أو سألته قال: قلت: كيف يضع؟ قال: يضع باطن كف يمينه على ظاهر كف شماله ويجعلهما أسفل عن السرة. رواه أبو بكر بن أبي شيبة . (۱)

ترجمہ: حضرت ابومجلز کہتے ہیں کہ: (مصلی) اپنے دائیں ہتھیلی کے باطن سے بائیں ہتھیلی کے ظاہر کو پکڑ کر ان دونوں کو ناف کے نیچے رکھے گا۔

(۳) عن أبي جحيفة أنّ عليًا رضي الله عنه قال: من السنة وضع الكف على الكف في الصلوة تحت السرة (أبو داؤد: رقم الحديث: ٤، ط: دار الفكر).

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ دورانِ نماز ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھا جائے۔ اور صحابی کا قول "من السنة كذا" مرفوع حدیث کے درجہ میں ہے، "أو من السنة كذا" كقول علي: من السنة ......وما أشبه كله مرفوع على الصحيح الذي قاله الجمهور (۲).

(۴) عن أبي وائل، قال أبو هريرة: أخذ الكف على الكف في الصلاةتحت السرة(۳). ترجمہ: نماز میں ہتھیلی کو ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا ہے۔

= ساتھ دیکھی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: بذل المجهود: ۲/ ۲۵۔

نیز علامہ محمد عوامہ نے "مصنف ابن ابی شیبہ" میں حضرت وائل بن حجر کی روایت "رأيت النّبي صلى الله عليه وسلم وضع يمينه على شماله في الصلاة تحت السرة" کے تحت حاشیے میں لکھا ہے کہ "شیخ محمد مرتضی زبیدی" اور "شیخ محمد عابد سندی" کے نسخے میں "تحت السرة" کی زیادتی موجود ہے؛ اسی وجہ سے علامہ "قاسم بن قطلو بغا" نے اپنی کتاب "التعريف والإخبار بتخريج أحاديث الاختيار" میں یہ حدیث "تحت السرة" کے اضافے کے ساتھ نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے: "هذا إسناد جيد".

هامش المصنف لابن أبي شيبه: ۳/ ۳۲۰-۳۲۱، ادارة القرآن والعلوم الإسلامية، باكستان.

(۱) ابن ابي شيبه: رقم: ۳۹۴۲، باب وضع اليمين على الشّمال.

(۲) اعلاء السّنن: ۲/ ۱۹۲.

(۳) أبوداؤد: رقم: ٦٤٦، دار الفكر، یہ روایت بھی مرفوع کے درجے میں ہے، محمد ابن سیرینؒ فرماتے ہیں: "كل حديث أبي هريرةؓ مرفوع" حضرت ابو ہریرہؓ کی ساری احادیث مرفوع کے درجے میں ہیں۔

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا مسلک، حدیث وآثار صحابہ سے ثابت ومؤید ہے، اس کے علاوہ جس حدیث سے سینہ پر ہاتھ باندھنے کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً: ابن خزیمہ کی روایت وائل بن حجر سے؛ **عن وائل بن حجر قال: صلیت مع رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فوضع یده الیمنیٰ علی یده الیسریٰ علی صدره.** ترجمہ: وائل بن حجر کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، چنانچہ آپ نے اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر سینے پر رکھا، اس سے سینہ پر ہاتھ باندھنے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ روایت مسند احمد، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں آئی ہے؛ مگر ان میں "**علی صدره**" کا اضافہ نہیں، اس کا اضافہ صرف مؤمل بن اسماعیل نے کیا ہے، ان کے بارے میں امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ یہ "منکر الحدیث" ہیں، محمد بن نصر مروزی کہتے ہیں کہ مؤمل جب کسی حدیث میں منفرد ہوں تو اس میں توقف کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ وہ سیئ الحفظ اور کثیر الغلط ہیں، چونکہ تنہا مؤمل نے "**علی صدره**" کا اضافہ کیا ہے اور ثقات نے اس کا تذکرہ نہیں کیا؛ اس لیے ان کی زیادتی قابلِ قبول نہیں (۱) **فلا یقبل تفرد مؤمل من بین الثقات بزیادة "علی صدره"۔**

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں احناف کا مسلک، احادیث وآثار سے نہ صرف ثابت؛ بلکہ راجح اور قوی ہے، نیز موجودہ دور کے غیر مقلدین جو

---

(۱) قال العلامة الشیخ النیموي في آثار السنن.................... وزیادة "علی صدره" غیر محفوظة: قلت: رواه أحمد في مسنده من طریق عبد اللّٰه بن الولید عن سفیان عن عاصم بن کلیب عن أبیه عن وائل بن حجر، والنسائي من طریق زائدة عن عاصم عن أبیه عن وائل، وأبوداؤد من طریق بشر بن المفضل عن عاصم عن أبیه عن وائل، وابن ماجة من طریق عبداللّٰه بن إدریس وبشر بن المفضل عن عاصم عن أبیه عن وائل کلهم بغیر هذه الزیادة، وقد نص ابن القیم في اعلام الموقعین: لم یقل "علی صدره" غیر مؤمل بن اسماعیل فثبت أنه منفرد في ذٰلك. بذل المجهود: ۲/۲۶. اشرفیه، دیوبند.

واضح رہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں مذکورہ حدیث سے عمدہ کوئی حدیث نہیں، اس کے علاوہ دو حدیثیں اور بھی ہیں؛ (۱) حضرت طاؤس کی حدیث جو ابوداؤد میں ہے، (۲) حضرت ہلب کی حدیث جو "مسند احمد" میں ہے؛ مگر جب اس باب میں سب سے عمدہ حدیث سے استدلال تام نہیں ہوتا تو دیگر احادیث جن کا ضعف متفق علیہ ہے، اس سے استدلال کیسے تام ہوسکتا ہے۔ (بذل المجہود: ۲/۲۴-۲۵)

احناف پر اس سلسلے میں لعن وطعن کرتے ہیں اور نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کو صحیح حدیث سے ثابت اور راجح قرار دیتے ہیں، اس کی حقیقت بھی واضح ہوگئی؛ لہٰذا اُن کا احناف پر الزام لگانا سراسر غلط ہے اور یہ خود ان کی دلائل سے جہالت و ناواقفیت کی دلیل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۰/۷/۳۲ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

حنفی مقتدی کے لیے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا کیسا ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد ہو جائے گی؟

سوال: ﴿۳۳﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

کیا امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھی جائے گی؟ امام ابوحنیفہؒ کا اس سلسلے میں کیا مذہب ہے؟ براہِ کرم قرآن وحدیث سے حوالہ دیں۔ ہمارے یہاں ایک عالم ہیں، وہ لوگوں میں اس بات کی تشہیر کر رہے ہیں کہ جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھے گا اس کی نماز نہیں ہوگی، ہم ان کو کیا جواب دیں، آپ ہماری رہنمائی فرمائیں۔ المستفتی: صفوان احمد (۱۳۵۶/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سری جہری کسی بھی نماز میں قرأت کرنا مکروہ تحریمی ہے، درمختار میں ہے: **والمؤتم لا یقرأ مطلقا ولا الفاتحة في السرية اتفاقا، فإن قرأ كره تحريما** (الدر مع الرد: ۲/۲٦٦، کتاب الصّلاة، باب صفة الصلاة) حنفیہ کا یہ مسلک قرآن وحدیث وآثار صحابہ سے مؤید اور ثابت ہے، جن کی روشنی میں ہی حنفیہ امام کے پیچھے قراءت کے قائل نہیں، وہ دلائل درج ذیل ہیں:

ارشاد باری ہے: **وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ** (اعراف: ۲۰۴)، ترجمہ: جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو؛ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ مفسرین کے نزدیک یہ آیت نماز کے متعلق آئی ہے (یعنی جب نماز میں قرآن پڑھا جائے تو اس وقت خاموشی اختیار کرنے کا حکم ہے)، تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے اور روح المعانی میں علامہ

آلوسیؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: الآية نزلت في ترك الجهر بالقراء ة وراء الإمام........... وهو قول أبي حنيفة (مفاتيح الغيب للرازي : ۸۳/۱۵،بیروت)، عن مجاهد قال: قرأ رجل من الأنصار خلف رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فى الصلاة، فنزلت وإذا قرئ القراٰن الآية. (روح المعاني :۹/۱۵۰، ط :امدادیہ ملتان).

اصحاب رسول ﷺ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابو ہریرہ، ابن عباس، عبداللہ بن مغفل رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین میں سعید بن جبیر، ابن رباح، امام نخعی، امام شعبی، حسن بصری، امام زہری، مجاہد اور قتادہ علیہم الرحمۃ سے یہی منقول ہے کہ اس آیت کا نزول، نماز یا خطبہ کے متعلق ہوا ہے حتی کہ اس بات پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت نماز ہی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ قال في التنسيق: أنهم أجمعوا و اتفقوا على أنها نزلت في القراء ة خلف الإمام وأخرج البيهقي عن الإمام أحمد قال: أجمع الناس على أن هذه الآية في الصلاة (أوجز المسالك : ۱/۲۴۶، افتتاح الصلاة، باب القراء ة خلف الامام، ط:یحیویہ سہارنپور) سورہ اعراف کی مذکورہ آیت میں مقتدیوں کو اپنے امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اب ذیل میں وہ احادیث وآثار پیش کیے جاتے ہیں، جن میں مقتدیوں کو قرآن پڑھنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے اور ان کو خاموش رہنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ مسلم شریف کی روایت ہے:

(۱) قال النّبي صلّى الله عليه وسلّم :إذا صليتم فأقيموا صفوفكم ، ثم ليؤمكم أحدكم فإذا كبر فكبروا، فإذا قال: غير المغضوب عليهم ولا الضالين ،فقولوا: آمين...... وعن قتادة وإذا قرأ فأنصتوا (مسلم:رقم: ۴۰۷، دار إحياء التراث العربي)، ترجمہ: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنی صفوں کو درست کرلو، پھر تم میں سے کوئی امامت کرے، جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ ”غير المغضوب عليهم ولا الضّالين“ کہے تو تم آمین کہو اور قتادہ سے یہ زیادتی بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب (امام) قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

(۲) عن أبي هريرة أن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال: إنما جعل الإمام ليؤتم به، فإذا كبر، فكبروا وإذا قرأ فأنصتوا. (ابن ماجة:رقم: ۸۴۶، دارالفكر) ترجمہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ امام بنایا گیا ہے؛ تاکہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

(۳) عن جابر قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: من کان له إمام فقراءة الإمام له قراءة (موطأ الإمام محمد: رقم: ۱۲۵، دار إحیاء التراث العربي) ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے لیے امام ہو تو امام کی قراءت اس کے لیے کافی ہوگی (یعنی اس کو علیحدہ سے قراءت کرنے کی ضرورت نہیں)۔

(۴) عن أبي موسیٰ قال: علمنا رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: إذا قمتم إلی الصلاة فلیؤمکم أحدکم، وإذا قرأ الإمام فأنصتوا (مسند احمد رقم: ۱۹۲۸۴، دار إحیاء التراث العربي) ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ تو تم میں سے کوئی نماز پڑھائے اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

ان احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت نہیں کرنی ہے؛ بلکہ خاموش رہنا ہے، نیز ان حدیثوں میں جہری وسری نمازوں کا کوئی فرق بھی مذکور نہیں؛ اس لیے یہ حکم سب نمازوں میں مقتدیوں کے لیے یکساں ہوگا۔ اب چند آثارِ صحابہ نقل کیے جاتے ہیں:

خلفائے راشدین امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے تھے:

قال (عبدالرحمن بن زید): أخبرني أشیاخنا أن علیا رضي اللّٰہ عنه قال: من قرأ خلف الإمام فلا صلاة له، قال: وأخبرني موسیٰ بن عقبة: أن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم وأبو بکر وعمر وعثمان کانوا ینهون عن القراءة خلف الإمام (مصنف عبدالرزاق: رقم: ۲۸۱۰، المکتب الإسلامي، بیروت) ترجمہ: عبدالرحمٰن بن زید کہتے ہیں کہ: ہمارے مشائخ نے خبر دی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے اس کی نماز ہی نہیں، اور موسیٰ بن عقبہ نے مجھے خبر دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر وعثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین، امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔

و کان عبد اللّٰہ بن عمر لا یقرأ خلف الإمام (موطأ الإمام محمد:۹۹) ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے، امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ میں نے ستر بدری صحابہ کو پایا ہے اور یہ سب کے سب مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرماتے تھے، **أدرکت سبعین بدریا کلھم یمنعون المقتدي عن القراء ۃ خلف الإمام** (روح المعانی:۹/۱۵۲)

خلفائے راشدین، ستر بدری صحابہ کے افعال اور ان کے علاوہ، دیگر صحابہ کرام کے آثار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کرنا منع ہے، جو حضرات امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی قرأت کو ضروری کہتے ہیں، ان کی سب سے اہم دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے، جو محمد بن اسحاق نے روایت کی ہے، **عن عبادۃ بن الصامت قال: کنا خلف النّبي صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم في صلاۃ الفجر، فقرأ، فثقلت علیہ القراء ۃ، فلما فرغ قال: لعلکم تقرؤون خلف إمامکم، قلنا: نعم! یا رسول اللّٰہ! قال: لا تفعلوا إلا بفاتحۃ الکتاب، فإنہ لا صلاۃ لمن لم یقرأبھا** (أبوداؤد: رقم: ۸۲۳، دارالفکر) ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرأت کی تو آپ کو قرأت میں دشواری ہوگئی، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو، ہم نے جواب دیا: جی ہاں یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، سوائے سورہ فاتحہ کے؛ کیوں کہ جس نے اس کو نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں؛ لیکن یہ حدیث سنداً ومتناً مضطرب ہے؛ اس لیے اس سے مذکورہ مسئلہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں، معارف السنن میں علامہ بنوریؒ نے سند میں اضطراب کی آٹھ وجوہات اور متن میں اضطراب کی تیرہ وجوہات نقل کی ہیں: **فھذہ ثمانیۃ وجوہ من اضطرابہ في الإسناد رفعاً ووقفا وانقطاعا واتصالا** (معارف السنن: ۳/۲۰۳، ط: دار الکتاب دیوبند) **وأما اضطراب متنہ فھو کذلک علی وجوہ ...... ثم قال: فھذہ ثلاثۃ عشر لفظا فی حدیث عبادہ** (معارف السنن: ۳/۲۰۵) اسی وجہ سے امام احمد اور امام ابن تیمیہ اور دیگر ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، **وھذا الحدیث معلل عند أئمۃ الحدیث بأمور کثیرۃ ضعفہ أحمد وغیرہ من الأئمۃ الخ** (فتاوی ابن تیمیہ: ۲۳/۲۸۶) **وقال النیموي: حدیث عبادۃ بن الصامت في**

التباس القراء ة قد روی بو جو ه کلّها ضعيفة. (آثار السّنن: ۱/ ۷۹)(۱)

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ، احادیث مبارکہ، خلفائے راشدین اور ستر بدری صحابہ کے عمل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی ہے؛ بلکہ خاموشی سے کھڑے رہنے کا حکم ہے، موجودہ دور کے غیر مقلدین، امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے کی وجہ سے احناف پر جو لعن طعن کرتے ہیں اور ان کی نمازوں کو قرآن وحدیث کے خلاف بتلاتے ہیں، وہ سراسر غلط اور گمراہ کن ہے، الحمد للہ احناف کا مذہب قرآن وحدیث سے ثابت ومبرہن ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

عندالاحناف نماز میں رفع یدین کا حکم

احادیث وآثار کی روشنی میں

سوال: ﴿۴۴﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ذیل کے مسئلہ میں: نماز میں رفع یدین کے سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کا کیا مذہب ہے؟ ان کا قول قرآن وحدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو احناف کی نمازوں کو رفع یدین نہ کرنے کی وجہ سے خلافِ سنت کہتے ہیں، ان کا کہنا کہاں تک درست ہے؟ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتي: امیر اللہ مشتاق قاسمی عفا اللہ عنہ کوپاگنجی (مئو) یوپی

خادم شعبۂ ترتیب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (۱۳۶۰/ د ۱۴۳۲ھ)

---

(۱) امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ''حسن'' کہا ہے، اور امام ترمذی کا ''حسن'' حسن لذاتہٖ سے فروتر ہے، معمولی ضعیف حدیث کو بھی امام ترمذیؒ ''حسن کہہ دیتے ہیں، قال أبو عيسٰی: وما ذکرنا في هذا الكتاب ''حديث حسن'' فإنّما أردنا حسن إسناده عندنا، كلّ حديث يُروى لايكون في إسناده من يُتَّهَمُ بالكذب ولايكون الحديث شاذًا ويُروٰی من غير وجهٍ نحو ذٰلك فهو عندنا حديث حسن. (ترمذی: کتاب العلل: ۲/ ۲۴۰)

تمہید

''رفع یدین کے سلسلے میں احناف کا مسلک اور صحیح احادیث وآثار سے اس کے ثبوت کے بیان سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں بہ طور مقدمے کے عرض کر دی جائیں۔

(۱) تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین باجماع امت مستحب ہے (۱) اور باقی مقامات میں اختلاف ہے، امام شافعیؒ وامام احمدؒ تین مواقع پر رفع یدین کو مستحب قرار دیتے ہیں، باقی جگہ پر نہیں (۲) امام ابوحنیفہؒ اور مشہور ومعتمد قول کے مطابق امام مالکؒ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مستحب سمجھتے ہیں اور باقی جگہ ان کے نزدیک مکروہ ہے۔ (۳)

(۲) رفع یدین کے مسئلے میں اختلاف کا منشا اور وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں روایات بھی مختلف ہیں اور اکابر کا عمل بھی مختلف رہا ہے (۴)۔

(۳) جس طرح امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سات جگہوں میں سے۔ جن میں حدیث کے اندر رفع

---

(۱) وفي شرح المهذب: اجتمعت الأمة على استحباب رفع اليدين في تكبيرة الإحرام.
(أوجز المسالك: ۱/۲۰۱، يحيوي)

(۲) أما رفعهما في تكبيرة الركوع وفي الرفع منه فمذهبنا (الشوافع) أنه سنة فيهما، (المجموع: ۳/۳۹۹، وكذا في كتاب الأم: ۱/۲۶) والحنابلة قالوا: يسن للرجل والمرأة رفع اليدين إلى حذو المنكبين عندتكبير الإحرام والركوع والرفع منه.
(الفقه على المذاهب الأربعة: ۱/۱۲۶)

(۳) (إلا في سبع) أشار إلى أنه لا يرفع عند تكبيرات الانتقالات خلافاً للشافعي وأحمد فيكره عندنا ولا يفسد الصلاة، الدر مع الرد: ۱/۳۷۴، زكريا.

المالكية قالوا: رفع اليدين حذو المنكبين عند تكبيرة الإحرام مندوب وفيما عدا ذلك مكروه. (الفقه على المذاهب الأربعة: ۱/۲۵۰)

(۴) چنانچہ کل سات طرح کی روایتیں ملتی ہیں: (۱) صرف تکبیر تحریمہ کے وقت، حدیث ابن مسعود: ترمذی: رقم ۲۳۸، (۲) رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت بھی، حدیث ابن عمر: ترمذی رقم: ۲۵۵ (۳) سجدے میں جاتے وقت، حدیث مالک بن حویرث، نسائی: رقم: ۱۰۸۵ (۴) دونوں سجدوں کے درمیان، حدیث ابن عباس، ابو داؤد، رقم: ۷۲۳ (۵) دوسری رکعت کے شروع میں، حدیث وائل بن حجر، (ابوداؤد، رقم: ۱۰۸۵) (۶) تیسری رکعت کے شروع میں، حدیث ابن عمر، (بخاری) (۷) ہر اونچ نیچ پر، حدیث عمیر بن حبیب، ابن ماجہ: رقم: ۸۶۱۔

یدین کی صراحت ہے۔صرف تین جگہوں پر رفع یدین کرنے کی وجہ سے تارکِ سنت نہیں کہلاتے، اسی طرح اگر امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ دلائل وترجیحات کی بناپر تحریمہ کے وقت رفع یدین کو سنت قرار دیں اور باقی مواقع پر مکروہ تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو تارکِ سنت کا خطاب دیا جائے۔

(۴) رفع یدین کا مسئلہ چونکہ معرکۃ الاراء مسئلہ ہے؛اس لیے موافق ومخالف دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کے دلائل کو مختلف طریقوں سے کمزور کرنے کی کوشش کی ہے،مگر اس سلسلے میں ہمارے نزدیک صحیح اور راجح بات وہ ہے جو حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری ''مدظلہٗ'' نے ''ادلۂ کاملہ/ ۴۸'' پر علامہ ابن الہمامؒ سے نقل کی ہے کہ دونوں طرح کی روایتیں حضور ﷺ سے ثابت ہیں؛ یعنی رکوع میں جاتے وقت ہاتھ اٹھانا اور نہ اٹھانا(۱)؛لہٰذا تعارض کی وجہ سے ترجیح کی ضرورت پیش آئے گی، نیز عمل کے اعتبار سے بھی دونوں باتیں حضور ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں(۲)

(۵) مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ رفع وترکِ رفع دونوں طرح کی روایات وعمل حضور ﷺ سے ثابت ہیں،اب صرف ضرورت اس کی ہے کہ احناف رفع یدین کو کیوں ترجیح دیتے ہیں اور ان کے پاس اس کے کیا دلائل ہیں،اس کو ثابت کیا جائے،ترکِ رفع کی روایات مفصل مع تحقیق پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی،مگر چونکہ بعض لوگ اس زمانے میں یہ سمجھنے لگے ہیں کہ رفعِ یدین کرنا ہی اصل سنت ہے اور نہ کرنا یہ ایک بدعت ہے،حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں؛اس لیے درج ذیل فتوے میں احناف کے مسلک کی ترجیح وافضلیت ثابت کرنے سے پہلے ان احادیث وآثار کو پیش کیا گیا ہے،جن سے معلوم ہو کہ رفعِ یدین کا ترک بھی احادیث رسول ﷺ وآثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے''

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز کی ابتدا میں تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھوں کا اٹھانا متفق علیہ ہے،اس کے علاوہ رکوع میں جاتے وقت رکوع سے اٹھتے وقت اور تشہد کے بعد تیسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت حنفیہ کے

---

(۱) والقدر المتحقق بعد ذلك كله ، ثبوت رواية كل من الأمرين عنه صلى الله عليه وسلّم: الرفع عند الركوع وعدمه فيحتاج إلى الترجيح لقيام التعارض. (فتح القدير: ۱/۲۷۰)

(۲) تواتر العمل بهما من عهد الصحابة والتابعين وأتباعهم على كلا النحوين، وإنّما بقي الاختلاف في أفضل الأمرين، (نيل الفرقدين: ۳)

یہاں ہاتھ نہ اٹھانا، یعنی رفع یدین کا ترک کرنا مسنون اور افضل ہے، ذیل میں احناف کے مسلک سے متعلق چند احادیث وآثار پیش کی جاتی ہیں، جن سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ رفعِ یدین کا ترک بھی احادیث وآثار سے ثابت ہے:

(۱) عن علقمةؓ قال: قال عبداللّٰه بن مسعود: ألا أصلي بكم صلاة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم؟ فصلى، فلم يرفع يديه إلا في أول مرة(۱)۔

ترجمہ: حضرت علقمہؒ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: کیا میں تمہیں رسول اکرم ﷺ کی نماز کی طرح نماز نہ پڑھاؤں؟ چنانچہ انہوں نے نماز پڑھائی تو صرف پہلی مرتبہ ہی اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا۔

(۲) عن البراء بن عازبؓ قال: كان النبي صلى اللّٰه عليه وسلّم إذا كبر لافتتاح الصلاة رفع يديه حتى يكون إبهاماه قريبا من شحمتي أذنيه ثم لا يعود (۲).

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز شروع کرنے کے لیے جب ''اللہ اکبر'' کہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کی لو سے قریب ہوجاتے، پھر اس کے بعد نہیں اٹھاتے تھے۔

(۳)عن عبداللّٰه بن عمرؓ قال: رأيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم إذا افتتح الصّلاة رفع يديه حتى يحاذى بهما، وقال بعضهم: حذو منكبيه، وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع لا يرفعهما(۳).

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب

---

(۱) (ترمذي: رقم: ۲۳۸، دار إحياء التراث العربي) اس حدیث کو امام ترمذی نے ''حسن'' کہا ہے اور ابن حزم ظاہری (غیر مقلد) نے اپنی مشہور کتاب ''المحلی''، میں ''صحیح'' کہا ہے۔

(۲) طحاوی: رقم: ۸۴۳، دار الکتب العلمية، بعض حضرات نے ''ثم لا یعود'' کی زیادتی کو اس حدیث کے ایک راوی ''یزید بن ابی زیاد'' کے اختلاط وتلقین کا نتیجہ قرار دیا ہے؛ مگر یہ رائے غلط ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے: اعلاء السنن: ۳/۶۸، ادارۃ القرآن، کراچی.

(۳) مستخرج أبي عوانة، رقم: ۱۲۴۰، دار المعرفة، بيروت. امام ابوعوانہ نے اس حدیث کی چار سندیں ذکر کی ہیں، چوتھی سند امام بخاری کے استاذ ''حمیدی'' کی ہے اور ''صحیح ابوعوانہ'' کی احادیث کا صحیح ہونا سب کو تسلیم ہے۔

آپ ﷺ نے نماز شروع کی تو اپنے ہاتھوں کو اٹھایا، یہاں تک کہ ان کو اپنے کندھوں کے بالمقابل کردیا، پھر رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

(۴) عن جابر بن سمرة قال: خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلّم فقال: مالي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس، اسكنوا في الصّلاة(۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے آپ ﷺ ہمارے پاس گھر کے باہر تشریف لائے تو فرمایا: کیا بات ہے کہ میں تمہیں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، گویا وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دمیں ہیں، نماز میں سکون اختیار کرو۔

یہ تو وہ احادیث تھیں جن میں تکبیر تحریمہ کے سوا ترکِ رفع یدین کی تصریح موجود ہے، ان کے علاوہ وہ احادیث بھی ترکِ رفع یدین کی دلیل ہیں، جن میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان فرمائی ہے مگر رفع یدین کا ذکر نہیں فرمایا؛ لیکن چوں کہ ان احادیث کو پیش کرنا طوالت کا موجب ہوگا؛ اس لیے ہم مذکورہ احادیث ہی پر اکتفا کرتے ہوئے اب وہ آثار پیش کرتے ہیں، جن سے صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع کرنا ثابت ہوتا ہے۔

آثار صحابہ: صحابہ میں سے حضرت عمرؓ (۲) حضرت علیؓ (۳) عبداللہ بن عمرؓ (۴) عبداللہ بن

---

(۱) مسلم: رقم: ۴۳۲، دار احياء التراث العربي. اس حدیث کی صحت میں کسی کو کلام نہیں؛ البتہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس حدیث میں سلام کے وقت اشارہ کرنے کی ممانعت مراد ہے؛ چنانچہ اس کی تائید مسلم شریف کی روایت جس میں سلام کے وقت کی صراحت ہے سے ہوتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں اور اگر ایک بھی تسلیم کرلیں تب بھی جب بوقتِ سلام رفع یدین کو سکون کے منافی سمجھا گیا، حالانکہ وہ نماز سے خروج کی حالت ہے تو نماز کے عین وسط میں سکون کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اعلاء السنن: ۳/۵۶، اشرفیہ دیوبند۔

(۲) عن الأسود قال: رأيت عمر بن الخطابؓ يرفع يديه في أول مرة ثم لا يعود. (الطّحاوي، رقم: ۸۵۳، دار الكتب العلمية، بيروت)

(۳) إن علي ابن أبي طالبؓ كان يرفع يديه في التكبير الأولىٰ التي يفتتح به الصلاة ثم لا يرفعهما في شيء من الصّلاة. (موطأ للإمام محمد، رقم: ۱۰۹، دار القلم، دمشق)

(۴) عن مجاهد قال: صليت خلف ابن عمرؓ، فلم يكن يرفع يديه إلا في التكبيرة الأولىٰ من الصّلاة. (الطحاوي، رقم: ۸۴۸، دار الكتب العلمية)

مسعودؓ(۱) عشرۂ مبشرہ (۲) اور تابعین کی ایک معتد بہ جماعت صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتی تھی، چنانچہ ابراہیم نخعیؒ، اسود، علقمہ، امام شعبی، عبدالرحمٰن ابن ابی لیلی، قیس بن حازم وغیرہ یہ حضرات صرف شروع نماز میں ہاتھ اٹھاتے تھے۔

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ رفع یدین کے سلسلے میں حنفیہ کا مسلک بھی احادیث رسول ﷺ و آثار صحابہؓ سے ثابت ہے، اب ہم یہ بتلاتے ہیں کہ احناف ترکِ رفع کی روایات کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔

ترکِ رفع کی روایات کو ترجیح دینے کی وجہ:

اس باب کی مجموعہ احادیث پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) پہلے نماز میں ہر تکبیر کے وقت رفع یدین کیا جاتا تھا، پھر تدریجاً اس کو ختم کیا گیا اور صرف تکبیر تحریمہ کے وقت باقی رہ گیا، اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا آخری عمل ترکِ رفع تھا؛ لہٰذا ترکِ رفع کی روایات رفع کی روایات کے لیے ناسخ ہوں گی، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: **إن بعض أنواع الرفع الثابت في الروايات متروك عند الجميع ومجمع عليه كما تقدم، فهذا قرينة على أنه وقع نسخ فيه فالأخذ المتفق عليه دون غيره أولى وأحوط وهو الرفع عند التحريمة.** (أوجز المسالك:۱/۲۰۵)

ترجمہ: رفع یدین کی بعض وہ صورتیں متفق طور پر متروک ہیں جو احادیث سے ثابت تھیں، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ رفع یدین میں نسخ ہوا ہے؛ لہٰذا صرف متفق علیہ صورت؛ یعنی تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا عمل اولیٰ و احوط ہے۔

پہلے یہ بات عرض کی جاچکی کہ احادیث میں سات جگہوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے؛ مگر امام

---

(۱) **عن إبراهيم عن عبدالله أنه كان يرفع يديه في أول ما يفتتح ثم لا يرفعهما.** (ابن أبي شيبة، رقم: ۲۴۵۲، الرشد، رياض)

(۲) **عن ابن عباس أنه قال: العشرة الذين شهد لهم رسول الله صلى الله عليه وسلّم بالجنّة ماكانوا يرفعون أيديهم إلا في افتتاح الصّلاة.** (أوجز المسالك: ۱/۲۰۲)

شافعیؒ وامام احمدؒ صرف تین مواقع پر رفع یدین کو سنت قرار دیتے ہیں اور باقی جگہوں پر منسوخ مانتے ہیں؛ لہٰذا فی الجملہ نسخ انہوں نے بھی تسلیم کرلیا، تو معقول بات یہ ہے کہ یا تو صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مانا جائے اور باقی روایتیں منسوخ قرار دیں؛ یا پھر ہر اونچ نیچ پر رفع یدین کو سنت قرار دیں(۱)۔

(۲) نماز میں حرکت سے سکون کی طرف تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں جیسا کہ ابوداوٗد کی روایت میں تحویلات ثلثہ سے معلوم ہوتا ہے، اس کے برعکس یہ نہیں ہوا کہ پہلے نماز میں سکون ہوتا ہو پھر حرکات شروع ہوگئی ہوں؛ چونکہ آپ ﷺ سے رفع وترکِ رفع دونوں طرح کی روایات مروی ہیں؛ اس لیے مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں یہ بات قرینِ قیاس وصواب ہے کہ آپ ﷺ کا آخری عمل ترکِ رفع تھا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی اس مسئلے میں احناف کا مسلک نہ صرف صحیح احادیث وآثار سے ثابت ومؤید ہے؛ بلکہ قرینِ صواب وقیاس بھی ہے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ''مدینہ منورہ'' جو مہبط وحی ہے اور ''کوفہ'' جو عساکرِ اسلام کی چھاؤنی ہے اور جس میں ۱۵۰۰ رصحابہؓ کا فروکش ہونا ثابت ہے، ان دوشہروں کے بارے میں موافق ومخالف سب تسلیم کرتے ہیں کہ ''کوفہ'' میں تو کوئی بھی رفع

(۱) حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم نے اس کو ایک بہت عمدہ اور واضح مثال سے سمجھایا ہے، فرماتے ہیں کہ ایک بڑے محل کے بارے میں ہمارے سامنے مختلف رپورٹیں ہیں کہ اس کے ایک کمرے میں بجلی ہے، تین کمروں میں بجلی ہے، چار میں، پانچ میں، چھ میں، سات میں، اور ہر کمرے میں بجلی ہے، رپورٹ کے اس اختلاف کو ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں، اگر صورتحال یہ ہے کہ تدریجاً بجلی بڑھائی گئی ہے تو ہمیں آخری رپورٹ لینی ہوگی کہ ہر کمرے میں بجلی ہے اور باقی رپورٹوں کے بارے میں ہمیں کہنا ہوگا کہ وہ پہلے زمانے کی رپورٹیں ہیں، جب کہ اتنے ہی کمرے میں بجلی لگی تھی، اور اگر صورتحال دوسری ہے؛ یعنی تدریجاً بجلی ختم کی گئی ہے تو پھر ہمیں ایک کمرے والی رپورٹ لینی ہوگی اور باقی کے بارے میں یہ کہنا ہوگا کہ وہ پہلے زمانے کی رپورٹیں ہیں، جب کہ ان کمروں میں بھی بجلی تھی، مگر وہ بعد میں ختم کردی گئی، اب اس مثال کی روشنی میں معقول نقطۂ نظر صرف دو ہی ہوسکتے ہیں یا تو صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مانا جائے اور باقی روایتیں منسوخ قرار دی جائیں یا پھر ہر اونچ نیچ میں رفع یدین مانا جائے، درمیان کی کوئی روایت لینا معقول نقطۂ نظر نہیں ہے۔
(ادلۂ کاملہ:۳۳)

یدین نہیں کرتا تھا (۱)، جب کہ ''عجلی'' کے قول کے مطابق تو کوفہ میں ۱۵۰۰ر صحابۂ کرام فروکش تھے، جس میں ستر بدری تھے اور تین سو اصحابِ بیعتِ رضوان تھے، اور مدینہ کی اکثریت رفع یدین نہیں کرتی تھی؛ اسی وجہ سے امام مالکؒ نے تعاملِ مدینہ کے پیشِ نظر ترکِ رفع کو اختیار کیا۔

الغرض دلائل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حنفیہ کا مسلک احادیثِ رسول ﷺ، آثار صحابہؓ سے ثابت ہے اور عشرۂ مبشرہ رضوان علیہم اجمعین کے تعامل کے موافق ہے؛ لہٰذا جو لوگ احناف کی نمازوں کو خلافِ سنت قرار دیتے ہیں، ان کا قول صحیح نہیں وہ دلائل سے ناواقفیت و جہالت پر مبنی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۰/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

مقتدی آمین بالسر کہے یا بالجہر

(احادیث وآثار کی روشنی میں میں)

سوال: ﴿۳۵﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد آمین آہستہ کہی جائے یا بلند آواز سے؟ ہمارے ایک دوست سعودیہ عربیہ سے آئے ہیں، وہاں کے ماحول سے کافی متاثر نظر آتے ہیں، آپ احادیث کی روشنی میں حنفیہ کا موقف بتائیں، تاکہ ان کے شکوک وشبہات دور ہوسکیں۔

المستفتی: صفوان احمد (۱۳۵۵/ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہنا بالاتفاق مسنون ہے، علماء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ سری اور انفرادی نمازوں میں آمین آہستہ کہی جائے گی، جہری نمازوں میں اختلاف ہے، حنفیہ کے

(۱) قال الإمام محمد نصر المروزي: لا نعلم مصراً من الامصار تركوا بإجماعهم رفع اليدين عند الخفض والرفع في الصلاة إلا أهل الكوفة. (التعليق الممجد: ۹۱)

نزدیک جہری نمازوں میں آہستہ آمین کہی جائے گی (۱)، حنفیہ کا یہ موقف قرآن وحدیث سے مؤید ہے، ذیل میں وہ دلائل درج کئے جاتے ہیں:

لفظ ''آمین'' ایک دعا ہے، جس کے معنی ہیں: اے اللہ! تو قبول فرما (۲)، امام بخاری علیہ الرحمۃ حضرت عطاء کے حوالے سے لکھتے ہیں: **الآمین دعاء**، آمین ایک دعا ہے (بخاری:۱/۱۰۷، **باب جهر الامام بالتأمين**) آیت قرآنیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا میں اصل اور افضل آہستہ مانگنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ادعوا ربكم تضرعا و خفية** (اعراف:۵۵)، ترجمہ: پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی آہستہ دعا مانگی تھی، **إذنادى ربه نداءً خفيا** (مریم:۳)، جب پکارا اس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے؛ اس لیے آمین کو بھی آہستہ کہنا افضل اور بہتر ہوگا۔

مذکورہ بالا آیت قرآنیہ کی روشنی میں، آمین کا آہستہ کہنا راجح معلوم ہوا۔ ذیل میں وہ احادیث وآثار نقل کیے جاتے ہیں، جن سے آمین آہستہ کہنے کا حکم مستفاد ہوتا ہے:

(۱) **عن أبي هريرة أن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال: إذا قال الإمام: غير المغضوب عليهم ولا الضّالين، فقولوا: آمين** (بخاری:۱/۱۰۸، **جهر المأموم بالتأمين، الرقم: ۱۵٦**) ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب امام **غير المغضوب عليهم ولا الضالين** کہے تو تم آمین کہو، اس حدیث میں مقتدی کے آمین کہنے کو امام کے ولا الضالین کہنے پر معلق کیا ہے، نہ کہ امام کے آمین کہنے پر، اس سے امام کا ''آمین'' آہستہ کہنا معلوم ہوا، جسے مقتدی نہیں سن سکیں گے، البتہ ولا الضالین کو جہر کی وجہ سے سب مقتدی سن لیں گے؛ اسی وجہ سے امام کے ولا الضالین کہنے پر مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم ہوا (اوجز:۱/۲۵۲)، اس بات کی تائید نسائی کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، جس کو علامہ نیمویؒ نے صحیح کہا

---

(۱) والثناء والتعوذ والتسمية والتأمين وكونهن سِرّاً. الدّرّالمختار.

واضح رہے کہ جہری نمازوں میں آمین کے آہستہ یا بلند آواز دونوں طریقے سے کہنے کے جواز پر سب کا اتفاق ہے؛ البتہ احناف ومالکیہ کے نزدیک آہستہ کہنا زیادہ بہتر ہے اور شوافع وحنابلہ کے یہاں زور سے کہنا زیادہ بہتر ہے؛ لہذا اختلاف اولیٰ وغیر اولیٰ کا ہے، جواز وعدم جواز کا نہیں۔

(۲) ففي مجمع البحار: معناه: استجب لي: ۱/۱۰۵.

ہے، جس میں ”**وإن الإمام يقول آمين**“ کا اضافہ ہے، اس سے امام کے آہستہ آمین کہنے کا پتہ چلتا ہے؛ کیوں کہ امام اگر جہراً کہتا تو مقتدیوں کو خود ہی پتہ چل جاتا اس جملے کے کہنے کی حاجت ہی نہ تھی۔

(۲) **عن علقمة بن وائل، عن أبيه، أنّ النّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم قرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين، فقال: اٰمين وخفض بها صوته** (ترمذی: ۱/۳۴، ابواب **ما جاء في التأمين**، الرقم: ۲۴۸) ترجمہ: وائل بن حجرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (کا عمل) نقل کرتے ہیں کہ آپ نے **غير المغضوب عليهم ولا الضالين** پڑھا تو آمین آہستہ آواز سے کہی۔

(۳) **عن أبي هريرةؓ أن رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال: إذا قال الإمام ولا الضالين، فقولوا: آمين، فان الإمام يقولها.** (رواه أحمد والنّسائي والدّارمي وإسناده صحيح (أوجز المسالك: ۱/۲۵۲، التامين خلف الإمام، ط: يحيويه سهارن پور) ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، کیوں کہ امام بھی اسے کہتا ہے، اس حدیث کو امام احمد، نسائی، دارمی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ ”**فإن الإمام يقولها**“ سے پتہ چلتا ہے کہ امام آمین آہستہ کہے گا ورنہ اس جملے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، امیر المومنین حضرت عمر فاروق اور علی رضی اللہ عنہما آہستہ آمین کہتے تھے ”**عن أبي وائل قال: لم يكن عمر وعلي يجهران ببسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحيم ولا التعوذ ولا آمين**“ (طحاوی: ۱/۹۹) ترجمہ: حضرت ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت عمر اور علی رضی اللہ عنہما تسمیہ تعوذ اور آمین بالجہر نہیں کہتے تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی آہستہ آمین کہتے تھے ”**عن أبي وائل قال: كان علي وعبد اللّٰه لا يجهران .... بالتامين**“ (۱) (المعجم الكبير: رقم: ۹۳۰۷،

(۱) صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی زیادہ تعداد آمین آہستہ کہتی تھی، امام طبریؒ فرماتے ہیں: ”**إن أكثر الصّحابة والتّابعين – رضي اللّٰه عنهم – كانوا يخفون بها**“ (اعلاء السنن: ۲/۲۲۳)، البتہ صغارِ صحابہ کے زمانے میں خاص طور سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جہراً آمین کہنے کا رواج ڈالا، اُن کا دار السلطنت مکہ تھا؛ اس لیے مکہ مکرمہ میں جہراً آمین کہنا رائج تھا؛ اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے – جن کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی – آمین بالجہر کو اختیار کیا؛ مگر مدینہ منورہ کی صورت حال دوسری تھی چنانچہ امام مالکؒ نے – جن کے یہاں تعاملِ مدینہ کی سب سے زیادہ اہمیت ہے – سراً آمین کہنے کو اختیار فرمایا۔ (ادلۂ کاملہ: ۴۳)

مکتب العلوم والحکم).

مذکورہ بالا احادیث مبارکہ اور آثارِ صحابہ سے معلوم ہوا کہ نماز میں آہستہ آمین کہی جائے گی، جہر کے سلسلے کی جو روایتیں آئی ہیں، ان میں سب سے قوی روایت حضرت وائل بن حجر کی ہے جس میں آمین بالجہر کی صراحت ہے: (جب کہ یہ روایت بھی اپنے مستدل پر تام نہیں) **وقرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين، فقال آمين ومد بها صوتَهُ** (ترمذی: ۲۴۸) ترجمہ: آپ نے **غير المغضوب عليهم ولا الضّالين** پڑھ کر آواز تیز کرتے ہوئے آمین کہی، اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ: اس میں آمین جہراً کہنا تعلیماً ہے، آپ ﷺ کا یہ مستقل عمل نہیں؛ چنانچہ بعض روایتوں میں اس کی صراحت ہے: **ما أراه إلا يعلمنا** میرا گمان یہ ہے کہ حضور ﷺ ہم کو تعلیم دے رہے تھے۔ (اعلاء السنن: ۱۸۲/۲)، تعلیم پر محمول کرنے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کے پیچھے صحابہ کرام روزانہ پانچ وقت کی نمازیں ادا کرتے تھے، اگر آمین بالجہر کا عام معمول ہوتا تو اس کو بیان کرنے والی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ صحیحین کی کسی روایت میں آمین بالجہر کا صریح تذکرہ موجود نہیں، صحیحین کے علاوہ جن احادیث میں آمین بالجہر کا تذکرہ ہے، ان میں سے ایک حدیث حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی ہے جس کے بارے میں ابھی معلوم ہوا کہ آمین جہراً کہنا تعلیماً ہوا ہے، نیز اضطراب کی وجہ سے حضرت وائل کی حدیث ضعیف ہے، تفصیل اعلاء السنن: ۲۲۳/۲ میں مذکور ہے، اس کے علاوہ جو دیگر روایات ہیں، وہ بھی ضعف اور علت سے خالی نہیں (۱)۔

مذکورہ بالا احادیث نبویہ اور آثارِ صحابہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ احناف کا آہستہ آمین کہنے کا مذہب قوی دلائل سے ثابت اور مبرہن ہے، موجودہ زمانہ کے اہلِ حدیث (غیر مقلدین) جو الزام لگاتے ہیں کہ احناف آمین کے سلسلے میں احادیث کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کا یہ قول سراسر غلط اور ذخیرۂ احادیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

---

(۱) چنانچہ محدث ابوبشر دولابی نے "كتاب الأسماء والكنى" میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے: **فقال آمين يمد بها صوته، ما أراه إلا ليُعَلِّمنَا. (معارف السنن: ۴۰٦/۲)**

(الف) مسبوق کے امام کے ساتھ سلام پھیر دینے کا حکم

(ب) کیا فجر کی سنت کی قضاء ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان کرام مسائل ذیل کے بارے میں:

سوال: ﴿۳۶﴾......(۱) زید نماز میں مسبوق تھا، امام صاحب نے جیسے ہی نماز کا سلام پھیرا، زید نے بھول کر امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک طرف کو سلام پھیر دیا، دوسری طرف سلام پھیرنے سے پہلے یاد آ گیا، زید اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اس شکل میں کہ زید مسبوق نے ایک طرف سلام پھیر دیا تھا تو زید پر سجدہ سہو واجب ہوا یا نہیں؟

ہمارے یہاں اہل علم کے درمیان اختلاف ہو رہا ہے: کچھ کی رائے ہے، سجدہ سہو واجب ہو جائے گا، دار الافتاء دارالعلوم دیوبند سے فیصلہ مع حوالہ کتب مطلوب ہے۔

(۲) فرض اور واجب کے علاوہ دیگر سنتوں کی قضا نہیں ہے، تو کیا فجر کی سنت اگر چھوٹ جائے تو ان کی قضا ضروری ہے؟ آپ کے مسائل اور ان کا حل کتاب: ۲/۲۷۱ پر لکھا ہے کہ فجر کی سنتوں کے علاوہ باقی کسی سنت کی قضا نہیں ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

المستفتی: علماء سیڈھا بجنور　　(۱۳۳۶/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) امام سے پہلے یا بالکل ساتھ ساتھ سہواً سلام پھیر دینے سے سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا؛ البتہ امام کے بعد پھیرنے کی صورت میں، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے اور سوال میں بھی یہی صورت پیش آئی ہے، مسبوق پر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرنا واجب ہے، **قال في البحر: لو سلّم مع الإمام ساهياً أو قبله لا يلزمه سجود السهو؛ لأنه مقتدٍ وإن سلّم بعده لزمه.** (البحر الرائق: ۱/۶۶۲).

(۲) قضا اصل میں وقت کے بعد واجب کی ادائیگی کو کہتے ہیں، اس معنی کر تو قضا کسی سنت کی نہیں ہے؛ لیکن مجازاً سنت کے غیر وقت میں پڑھنے کو قضا کہہ دیتے ہیں، قضا کا اطلاق اس پر مشاکلت کے طور پر ہے، اصل معنی کے اعتبار سے وجوب کے درجہ میں نہیں ہے، اسی لحاظ سے اگر فجر

کی سنت مع فرض کے قضا ہوجائے تو زوال سے پہلے پہلے فرض کے ساتھ سنت کی قضا کرنے کا حکم ہے تبعاً للفرض، اور زوال کے بعد کسی اور وقت میں صرف فرض کی قضا ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے: **ولم تقض سنة الفجر إلا بفوتها مع الفرض إلى الزّوال** (حاشیہ الطحطاوی علی المراقی:۴۵۳)، اسی طرح اگر فجر کی صرف سنت رہ گئی تو امام محمدؒ کے قول پر طلوع شمس کے بعد زوال سے پہلے تک اس کے پڑھ لینے کو بہتر کہا ہے۔ **قال محمد: وتقضى منفردةً بعد الشّمس قبل الزّوال فلا قضاء لها قبل الشّمس ولا بعد الزّوال اتفاقاً .... قيل: لا خلاف بينهم في الحقيقة لأنهما يقولان: ليس عليه القضاء وإن فعل، لا بأس به، ومحمّد يقول: أحب إلىٰ أن يقضي وإن لم يفعل فلا شيء عليه.** (حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی: ص:۴۵۳، دارالکتاب دیوبند)

حاصل یہ کہ قضا ''اتیان واجب غیر وقت میں'' کرنے کو کہتے ہیں اس معنی کر کسی سنت کی قضا نہیں ہے؛ لیکن مذکورہ دوصورتوں میں فجر کی سنت کے قضا کرنے کو بہتر کہنا اور اسے قضا کہنا مجازاً ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۸/۲۹ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

کیا نماز توڑ کر موبائل کی گھنٹی بند کرنا جائز ہے؟

سوال: ﴿۳۷﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
(۱) نماز باجماعت میں کسی کا موبائل بجنے لگے تو کیا وہ نماز توڑ کر موبائل بند کرے یا یہ کہ بجتا رہنے دے؟
(۲) حالت نماز میں جیب سے موبائل نکال کر بند کرنا عمل قلیل ہے یا عمل کثیر؟
(۳) پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل بند کرنے میں کتنی دیر لگنے سے عمل کثیر بن جائے گا؟
(۴) واضح ہو کہ بعض لوگ موبائل میں گھنٹی کی جگہ ایسے گانے لگاتے ہیں کہ اللہ کی پناہ ایسے حالات میں مسجد کے اندر گانا یا میوزک بجنے دیا جائے یا نیت توڑ کر موبائل بند کر کے دوبارہ جماعت

میں شریک ہو؟ اگر نیت توڑ کر دوبارہ جماعت میں شریک ہوگا تو اس کا حکم مسبوق کا ہوگا یا لاحق کا؟

دلائل شرعیہ کے ساتھ جواب مرحمت فرما کر لوگوں کو صحیح راستہ کی رہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

نوٹ: اس سے پہلے آپ کے یہاں سے ایک فتوی(۱) آیا تھا، جس میں نماز توڑ کر موبائل بند کرنے کو کہا گیا ہے اور اب ساتھ میں ایک فتویٰ ارسالِ خدمت ہے، جس میں نماز نہ توڑنے کا حکم دیا گیا ہے، اب جو راستہ صحیح ہو اس پر روشنی ڈالیں۔ والسلام

گلزار مرزا، ۴۲۱۶ کمرہ بنگش، دریا گنج، نئی دہلی ۔۲ (۲۵۲/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) نماز میں موبائل کی گھنٹی بجنے پر اگر عمل قلیل سے بٹن بند کرنا ممکن ہو تو بند کردے اور اگر بند کرنے میں عمل کثیر کی ضرورت پیش آئے اور آواز ہلکی پھلکی ہے تو بجتی رہنے دے نماز کا توڑنا جائز نہیں ہے۔ اگر فحش قسم کا گانا یا میوزک بج رہی ہے، جو نمازیوں کے لیے تشویش وانتشار کا باعث ہو اور بدونِ عمل کثیر بند کرنا ممکن نہ ہو تو دوسروں کی نماز کے صیانت کے لیے اپنی نماز توڑ دینے کی اجازت ہے، بالخصوص جب کہ جماعت کی نماز ہو(۲)۔

(۲) نماز میں ایسا کام کرنا کہ دوسرے دیکھنے والے کو یہ یقین یا ظن غالب ہو جائے کہ یہ شخص نماز میں نہیں تو عمل کثیر ہے، ورنہ یعنی اگر نماز میں ہونے نہ ہونے کے متعلق تردد ہو، تو وہ عمل قلیل ہے، موبائل جیب سے نکال کر بند کرنے میں، جب کہ دونوں ہاتھ کا استعمال ہو بظاہر عملِ کثیر کا تحقق

---

(۱) محولہ سابق فتوی کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:

''اگر ہاتھ سے (یعنی عملِ کثیر کے بغیر) بند کرنا ممکن ہو تو دورانِ نماز ہی ہاتھ سے بند کردے ورنہ نماز توڑ کر بند کر کے شاملِ جماعت ہو جائے، اور لوگوں کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ مسجد میں موبائل نہ لائیں، تا کہ لوگوں کی نماز میں خلل نہ ہو۔ از: مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی، سابق نائب مفتی دار العلوم دیو بند۔

تصحیح وتصویب: مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری، مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی، مفتی عبد الرحمٰن صاحب مفتی مدرسہ امینیہ دہلی۔ (فتوی ۹۷۲/د، ۲۸۷ مجریہ ۱۴/۲/۱۴۲۷ھ دار الافتاء دار العلوم دیو بند)

(۲) مستفاد مما في الدر مع الرد: ۲/۴۰۸، ''صلاته مع مدافعة الاخبثين أو أحدهما .... والغائط..... سواء كان بعد شروعه أو قبله، فإن شغله، قطعها إن لم يخف فوت الوقت.

ہوجائے گا(۱)۔

(۳)ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر بند کرنے سے بظاہر عملِ قلیل معلوم ہوتا ہے، جو مفسدِ صلاۃ نہیں ہے۔

(۴)نیت توڑ دینے سے نماز فاسد ہوجائے گی، دوبارہ نماز میں شرکت کرنے سے وہ پڑھی ہوئی نماز کے حق میں مسبوق ہوگا، لاحق کا اطلاق اس پر صحیح نہیں ہے(۲)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۲۹/۲/۱۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا عنہ، ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا مستحب ہے

سوال: ﴿۳۸﴾ سعودی عرب میں اکثر لوگ بغیر ٹوپی یا پگڑی کے نماز ادا کرتے ہیں؛ لیکن یہ غیر سعودی ہیں، جب کہ سعودی کے لباس میں ہی سر چھپانا شامل ہے۔ ایک ہندوستانی صاحب نے ہم سے کہا کہ بغیر ٹوپی نماز قبول نہیں ہوتی ہے؟ اس کی شرعی حیثیت بیان کردیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

رشید انڈیا (۱۲۵۳/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین عظام کی عادت شریفہ عام حالات میں ٹوپی، عمامہ پہننے کی تھی، کتب حدیث میں اس کی جابجا صراحت ملتی ہے، چناں چہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

(۱)(أصح ما جاء في حد العمل الكثير) مالا يشك بسببه الناظر من بعيد في فاعله أنه ليس فيها وإن شك أنه فيها أم لا، فقليل. (الدر مع الرد : ۳۸۵/۲، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها)

(۲) والمسبوق من سبقه الإمام بها أي بكل الركعات أو ببعضها. (الدر مع الرد: ۳۴۶/۲، مطلب في أحكام المسبوق) واللاحق: من فاتته الركعات كلها أو بعضها لكن بعد اقتداءه بعذر كغفلة وزحمة وسبق حدث الخ (الدرمع الرد: ۳۴۳/۲).

کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفید ٹوپی پہنتے تھے، اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، امام سیوطی رحمہ اللہ نے جامع صغیر میں فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے (۱)، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں کان والی اور حضر میں پتلی یعنی شامی ٹوپی پہنتے تھے، عراقی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ٹوپی کے باب میں یہ سب سے عمدہ سند ہے (۲)۔

بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم آدمی کو کرتا، عمامہ، پائجامہ اور برانس (ایک خاص قسم کی ٹوپی) پہننے سے منع فرمایا ہے: **عن عبد الله بن عمرؓ أن رجلًا قال: يارسول الله! ما يلبس المحرم من الثياب، قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم: لا يلبس القُمُص، ولا العمائم، ولا السراويلات، ولا البرانس، ولا الخفاف الخ.**
(بخاری: رقم: ۵۱۴۲، باب ما يلبس المحرم من الثياب) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانے میں لباس، کرتا، پائجامہ، عمامہ، اور ٹوپی ہوا کرتا تھا، اس لیے احرام کے وقت اس کے پہننے سے ممانعت فرمائی، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث، ٹوپی کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، جب کہ یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا عذر کبھی ننگے سر نماز پڑھی ہو یا صحابہ کرام کے زمانہ میں برہنہ سر نماز پڑھنے کا رواج رہا ہو، یا کسی نے برہنہ سر نماز ادا کی ہو، کسی ضعیف سے ضعیف حدیث سے بھی ثابت نہیں؛ اس لیے فقہائے کرام نے ان احادیث اور عادت شریفہ مستمرہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ تذلل اور غایت درجہ خشوع وخضوع کی وجہ سے نہ پہنے تو مکروہ نہیں؛ لیکن تہاون اور سستی کی وجہ سے نہ پہننا اور اس کی عادت بنالینا سخت مکروہ ہے، (۳) یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اس کے بغیر اس کی نماز قبول نہ ہوگی، البتہ تہاون اور سستی کی صورت میں کراہت کی

---

(۱) كان يلبس قلنسوة بيضاء، شعب الإيمان للبيهقي: رقم: ۵۷۷۳، فصل في العمائم.
(۲) قال الحافظ العراقي في شرح الترمذي: وأجود إسناد في القلانس ما رواه أبو شيخ (ابن حبان)، عن عائشة كان يلبس القلانس في السفر ذوات الآذان وفي الحضر المضمرة يعني الشامية (فيض القدير للمناوى، باب "كان" وهي الشمائل الشريفة: رقم: ۷۱۶۷)
(۳) وكره .... صلاته حاسراً أي كاشفاً رأسه للتكاسل ولا بأس به للتذلل، وأما للإهانة بها فكفر (الدر مع الرد: ۲/ ۴۰۷، كتاب الصلاة باب ما يفسد الصلاة، وما يكره فيها).

وجہ سے ثواب میں کمی ہوگی۔

از: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۱۰/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

تین روز یا پانچ روز کی تراویح کا حکم

(جس میں آدابِ قرآن کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے)

محترمی، مکرمی حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ! .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ درج ذیل سوال کا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

سوال: ﴿۳۹﴾ ہر شخص بخوبی اس بات سے واقف ہے کہ رمضان المبارک میں بہت سی جگہوں پر نماز تراویح میں قرآن پاک پورا ہوتا ہے اور مساجد کے علاوہ گھروں میں، کارخانوں میں اور دیگر بہت سی جگہوں پر تین، پانچ، سات اور نو شب میں پورا کر دیا جاتا ہے، اور حفاظ کرام جس تیزی سے پورا کرتے ہیں، اس کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کلام پاک کا کوئی ادب ملحوظ رکھا جاتا ہے، ایسے تیز رو حفاظ کرام عوام میں بھی بے حد مقبول ہوتے ہیں، آں جناب سے معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر اس طریقہ سے قرآن کریم پڑھنا اور سننا ممنوع ہے، تو عوام مقتدیوں کو کس طریقہ سے منع کیا جائے اور ان کو سمجھانے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ نیز آں جناب ممانعت کے اسباب پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک تفصیلی اور جامع فتوی آپ کے دارالافتاء سے ایسا جاری ہو کہ ماہِ مبارک میں قرآن کریم کی بے ادبی کو حتی الامکان روکا جا سکے اور پورے مہینے مساجد کلامِ الٰہی کے انوار سے آباد و معمور رہیں اور چند شب میں پورا کرنے کا یہ سلسلہ قطعاً بند ہو سکے۔ فقط

محمد اظہر انصاری محلّہ قاضی سہارن پور (۱۱۹۷/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز تراویح میں تین چیزیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں:

(الف) قرآن شریف کا جو حصہ پڑھا جائے، وہ تصحیح اور ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد خداوندی ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (مزمل:۴)، یعنی (قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو، ایک ایک حرف الگ الگ ہو)، لہٰذا ایسی تیز رفتاری سے پڑھنا جس میں حروف کٹ جائیں اور الفاظ کی ادائیگی، صحیح وصاف نہ ہو درست نہیں ہے، قال في الفتاویٰ الهندية: ويكره الإسراع في القراءة وفي أداء الأركان كذا في السراجية، وكلما رتل فهو حسن كذا في فتاوى قاضي خان(۱)۔

(ب) پورے رمضان میں نماز تراویح کے اندر ایک قرآن کا ختم کرنا سنت ہے، جس میں قرآن پڑھنے اور سننے کے آداب کا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جس کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ ایک رکعت میں ایک رکوع یا دس آیتیں پڑھی جائیں، قال في الهندية: ويكره أن يعجل ختم القرآن في ليلة إحدى وعشرين أو قبلها، وحكى أن المشائخ رحمهم اللّٰه تعالىٰ جعلوا القرآن على خمس مائة وأربعين ركوعاً واعلموا ذلك في المصاحف حتى يحصل الختم في ليلة السابع والعشرين، وفي غيرهذا البلد كانت المصاحف معلمة بعشرمن الآيات وجعلوا ذٰلك ركوعاً ليقرأ في كل ركعة من التراويح القدر المسنون، كذا في فتاوى قاضى خان (۲)، وقال الزيلعي: ومنه من استحب الختم في ليلة السابع والعشرين رجاء أن ينالوا ليلة القدر، لأن الأخبار تظاهرت عليها، وقال الحسن عن أبي حنيفةؒ: يقرأ في كل ركعة عشر آيات ونحوها، وهو الصحيح لأن السنة الختم فيها مرة وهو يحصل بذلك مع التخفيف (۳)، قال في العالمگيري: وينبغي للإمام إذا أراد الختم أن يختم في ليلة السابع والعشرين كذا في المحيط(۴)۔

عبارتِ مذکورہ بالا سے معلوم ہوا کہ مقدار مسنون کا خیال کرتے ہوئے، ایک رکعت میں ایک

(۱-۲) الفتاوى الهندية،فصل في التراويح:۱/۱۱۸.
(۳) الدر مع الرد، باب الوتر والنوافل:۲/۴۹۷.
(۴) الفتاوى الهندية، فصل في الترو ايح:۱/۱۱۸.

رکوع یا دس آیتیں پڑھی جائیں، اس مقدار کو مشائخ فقہاء نے مستحب قرار دیا ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہؒ سے منقول ہے، تاکہ ستائیسویں شب میں قرآن کا ختم ہوجائے، جس سے لیلۃ القدر کی فضیلت بھی حاصل ہوسکے گی، اور تخفیف وسہولت کی رعایت کے ساتھ ایک قرآن ختم ہوجائے گا، کیوں کہ امام کو نماز میں تخفیف کی ہدایت فرمائی گئی ہے، قرآن سننے میں اگر لوگ کسل مندی کریں اور آداب استماع (غور سے سننے) کی رعایت ملحوظ نہ رکھیں تو مقدار مذکور میں تخفیف بھی کی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ قرأت قرآن اور اس کے استماع کے آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، کم از کم ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیتیں سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھ کر نماز تراویح اگر ادا کی جائے تو بھی درست ہے کہ لوگ رغبت سے تراویح کی نمازیں ادا کریں اور مسجدیں غیر آباد نہ ہوں، **قال في الدر المختار: والختم مرة سنة أي قراءة الختم في صلاة التراويح سنة، ومرتين فضيلة، وثلاثا أفضل ولا يترك الختم لكسل القوم لكن في الاختيار الأ فضل في زماننا قدرما لا يثقل عليهم، وأقره المصنف وغيره، وفي المجتبى عن الإمام لو قرأ ثلا ثاً قصاراً أو آية طويلة في الفرض، فقد أحسن ولم يسئى فما ظنك بالتراويح؟ وفي فضائل رمضان للزاهدى أفتى أبو الفضل الكرمانى الوبرى أنه إذا قرأ في التراويح الفاتحة وآية أو آيتين لايكره ومن لم يكن عالما بأهل زمانه، فهو جاهل (١)، قال في البحر: فالحا صل أن المصحح في المذهب أن الختم سنة لكن لا يلزم منه عدم تركه إذا لزم منه تنفير القوم وتعطيل كثيرمن المساجد خصوصا في زماننا، فالظاهر اختيار الأخف على القوم (٢)، والمتأخرون كانوا يفتون في زماننا بثلاث آيات قصاراً أو آية طويلة حتى لا يمل القوم ولا يلز م تعطيل المساجد وهذا أحسن كذا في الزّاهدي (٣).**

پس معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن پڑھنے میں جلد بازی کرنا مکروہ ہے، اسی طرح اتنی مقدار پڑھنا کہ لوگوں کو گرانی ہو اور بے رغبتی سے لوگ سنیں مکروہ ہے۔

(١-٢) الدر مع الرد، باب الوتر والنوافل: ٢/٤٩٨.

(٣) الفتاوى الهندية .، فصل في التراويح: ١/١١٨.

(ج) تراویح کی بیس رکعت رمضان کے پورے ماہ پڑھنا، جس میں ایک قرآن جو اطمینان کے ساتھ صحیح اور درست پڑھا گیا ہو، لوگ پورا سن لیں، پھر مہینہ کے باقی دنوں میں مختصر سورتوں کے ساتھ تراویح پڑھتے رہیں یا قرآن سننے کے شوق میں ایک کے بجائے دو تین قرآن بھی دل چسپی اور رغبت کے ساتھ سن لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ؛ بلکہ موجبِ فضیلت وثواب ہے، **قال في الدر: والختم مرة سنة ومرتين فضيلة وثلاثا أفضل** (۱) لیکن قرآن پورا ہونے کے بعد باقی دنوں میں نماز تراویح چھوڑ دینا مکروہ اور بڑی فضیلت سے محرومی ہے، **قال في الهنديه: لو حصل الختم ليلة التاسع عشر أو الحادى والعشرين لا تترك التراويح في بقية الشهر لأنها سنة كذا في الجوهرة النيرة، الأصح أنّه يكره له الترك كذا في السّراج الوهاج** (۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کے بعض دنوں میں تراویح میں ایک قرآن ختم کر لینے سے باقی دنوں کی نماز تراویح ساقط نہیں ہوتی ؛ بلکہ تراویح کی سنیت برقرار رہتی ہے اور اس کا ترک کرنا مکروہ اور فضیلت سے محرومی کا باعث ہے۔

حاصل یہ کہ تراویح میں ختم قرآن کے لیے یہ چند امور ضروری ہیں جن کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے؛ (۱) قرآن صاف صاف پڑھا جائے، اتنی جلدی نہ پڑھا جائے کہ حروف سمجھ میں نہ آئیں، (۲) سننے والوں کا آدابِ استماع کا خیال رکھنا (۳) اتنی مقدار پڑھی جائے کہ قوم کسل مند نہ ہو، (۴) سنانے والے کا معاوضہ نہ لینا، (۵) حفاظ کو ریا ونمود مقصود نہ ہونا، (۶) ختم قرآن ایک مرتبہ کر لینے کی بنا، پر باقی ایام کی تراویح کا تارک نہ بننا، (۷) تراویح غیر مسجد میں پڑھنے کی صورت میں نماز عشاء مسجد کی جماعت کے ساتھ پڑھی جائے۔

ان امور مذکورہ کی رعایت کرتے ہوئے اگر لوگ رغبت وشوق سے سننے کے لیے تیار ہوں تو ۳/۵/۷/۱۰/۱۵/دن میں بھی ختم قرآن کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

لیکن ۳/۵/۷/دن میں ختم قرآن کا جو رواج شہروں میں پایا جا رہا ہے، اس میں بالعموم درج ذیل مفاسد کل یا بعض پائے جاتے ہیں: (۱) ترتیل وتجوید کو جلدی کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے،

(۱) الدر مع الرد، باب الوتر والنوافل: ۲/ ۴۹۷.
(۲) الفتاوى الهندية، فصل في التراويح: ۱/ ۱۱۸.

بعض جگہ تو اس قدر پڑھنے میں جلدی کی جاتی ہے کہ حروف سمجھ میں نہیں آتے، نہ زبر کی خبر نہ زیر کی، نہ غلطی کا خیال، نہ تشابہ کا، (۲) حفاظ کو عوض مالی کی امید ہونا، (۳) امام کو تخفیف صلاۃ کا حکم ہے اس کی مخالفت کا پایا جانا، (۴) جماعت میں شرکت کرنے والوں کا آدابِ استماع کا ضائع کرنا؛ کوئی بیٹھا ہے، تو کوئی سو رہا ہے، تو کوئی باتیں کر رہا ہے، تو کوئی امام کے رکوع میں جانے کا منتظر ہے، کوئی ''**إذا قاموا إلى الصّلاة قاموا كسالى**'' کا مصداق بنا ہوا ہے، لوگوں کا شور وشغب کرنا، اوران کے آمد ورفت کی چہل پہل مستزاد ہے، (۵) بہت کم لوگ قرآن سے شغف یا اس کے سننے سے دلچسپی کی وجہ سے شرکت کرتے ہیں، (۶) اکثر لوگ رمضان کے باقی دنوں کی تراویح سے چھٹی حاصل کرنے کی غرض سے شریک ہوتے ہیں، (۷) تراویح کی معیت میں عشاء کی فرض نماز غیر مسجد میں جماعت سے پڑھنے کے رواج کا عام ہونا، (۸) اس بنا پر مسجد کی جماعت کا کم ہوجانا، (۹) ریاء ونمائش کے ساتھ ۳/۵/۷/ دن میں ختم قرآن کا انتظام واعلان کیا جانا، دعوت شیرینی کا اہتمام ہونا، (۱۰) اس کے لیے باقاعدہ چندہ کیا جانا، اس وقت نوجوانوں میں اس رسمی مروجہ ختم قرآن کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، جس کی وجہ سے مسجدوں میں نماز تراویح کے لیے لوگوں کی شرکت کم ہونے لگی، بھیڑ نمازیوں کی ان جگہوں میں اکٹھا ہوتی ہے، جہاں ۳/۵/۷/ دنوں میں ختم قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے، پھر ان مسجدوں میں بھی اخیر ماہ مبارک تک تراویح میں اقل قلیل افراد رہ جاتے ہیں، اور ختم قرآن کے بعد باقی دنوں میں کم ہی لوگ تنہا یا جماعت سے نماز تراویح ادا کرنے کی فکر کرتے ہیں۔

لہٰذا مذکورہ بالا قباحتوں کی وجہ سے اس رجحان کو کم کرنے اور لوگوں کو نماز تراویح، نیز ختم قرآن کا اصل حکم بتلانے کی ضرورت ہے؛ تاکہ لوگ مروجہ طریقہ کو ختم کرتے ہوئے تراویح کا اہتمام مسجدوں ہی میں کریں اور قرآن سننے سنانے کا عمل پورے ماہ برقرار رکھیں، تاکہ نمازیوں کی تعداد اخیر عشرہ کی تراویح میں بھی اسی قدر نظر آئے، جتنی کہ آغاز ماہ میں نظر آتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۷/۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری،

فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ،

چھ روزہ شبینہ کا حکم

(جس کی وجہ سے مسجد کے اصل نمازی دوسری جگہ نماز پڑھنے پر مجبور ہوں)

سوال: ﴿۴۰﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

ایک مسجد ہے جس میں پنجوقتہ نماز ہوتی ہے، رمضان میں ایسا ہوتا ہے کہ اولاً اس مسجد میں چھ روز کا شبینہ ہوتا ہے، جس میں شرکت کرنے والے ۹۰/نوے فیصد وہ حضرات ہوتے ہیں جو مستقل اس مسجد کے نمازی نہیں ہیں، اور اہلِ محلّہ جو اس مسجد کے مستقل نماز پڑھنے والے ہیں، ان کو ان چھ ایام میں دوسری جگہ مسجد سے علاحدہ تراویح پڑھنی پڑتی ہے، جس میں کچھ لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے، شبینہ پورا ہونے کے بعد باہر تراویح پڑھنے والے حضرات مسجد میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ شبینہ کرنے والے حضرات کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اس میں مستقل نماز پڑھنے والوں کی حق تلفی ہے یا نہیں؟ نیز جو اہلِ محلّہ مسجد میں شبینہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً مسجد سے باہر تراویح پڑھتے ہیں اور پھر شبینہ ختم ہونے کے بعد باقی تراویح مسجد میں پوری کرتے ہیں، ان کے اس جگہ بدلنے سے ثواب وفضیلت تراویح ومسجد میں کوئی کمی واقع ہوگی یا نہیں؟ حکم شرعی سے آگاہ فرمائیں۔

(۱) مسجد میں اہلِ محلّہ کا حق ہے کہ وہ شروع رمضان سے مسجد میں تراویح باجماعت ادا کریں اور شبینہ سننے کے شوقین حضرات مسجد سے باہر کسی مدرسہ وغیرہ میں اپنا شوق پورا کریں،

(۲) یا شبینہ کے شوقین حضرات (جو اکثر اس مسجد کے نمازی نہیں ہوتے) کا حق ہے کہ وہ مسجد میں اکثر اہلِ محلّہ کی مرضی کے برخلاف مسجد میں شبینہ کریں اور اس مدت میں اہلِ محلّہ مسجد سے باہر تراویح ادا کریں۔ فقط

المستفتی: فضل الرحمٰن واللہ راضی ہمایوں نگر میرٹھ (۱۴۶۲/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

چھ روز میں قرآن سننا فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن بالعموم پڑھنے والے قرأت کے آداب کا لحاظ نہیں

کرتے ؛ مثلاً اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ حروف کٹ جاتے ہیں، زیر زبر متشابہ کا خیال نہیں رہتا(۱) اور سننے والے آدابِ استماع کا لحاظ نہیں کرتے، کوئی رکوع کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے تو کوئی نیند سے مغلوب رہتا ہے، بعض نہایت کسل مندی اور بوجھ سے شریک جماعت ہوتے ہیں اور باقی دنوں کی تراویح کی نماز ترک کردیتے ہیں، قرآن پورا ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں نماز تراویح پورے رمضان میں سنت مؤکدہ ہے، اس کو ضروری نہیں سمجھتے (۲)، خلاصہ یہ ہے کہ جہاں ایسی خرابیاں پائی جاتی ہوں، وہاں مذکورہ صورت کو بڑھ چڑھ کر رواج دینا درست نہیں، ہاں جہاں ایسی خرابیاں نہ ہوں تو فی نفسہ چھ ،سات روز میں ختمِ قرآن، جو آدابِ قرآن کی رعایت کے ساتھ ہو جائز ہے، قرآن اطمینان سے پڑھا جائے اتنی مقدار پڑھی جائے کہ لوگوں کو گرانی نہ ہو اور لوگ توجہ اور شوق سے سننے کا اہتمام کریں۔

(۱) مسجد میں چھ دن کا انتظام کردینا جس سے اصل نمازی دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور ہوں مکروہ ہے، ان کی سخت حق تلفی ہے، مسجد میں قرآن سننے اور ختم کرنے کا انتظام اتنے دن میں کیا جائے کہ اصل پنج وقتہ نمازی اور دیگر حضرات آسانی سے شریک ہوسکیں، بہتر یہ ہے کہ ستائیسویں شب میں ختم کیا جائے۔

(۲) شبینہ کے شوقین حضرات کا یہ عمل مکروہ ہے اصل نمازیوں کی حق تلفی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/ ۸/ ۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

فرض نمازوں کے بعد دعا

سوال: ﴿۱۴۱﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ہذا کے متعلق:

کیا امام کو فرض نماز کے بعد بآواز بلند دعا مانگنی چاہیے یا نہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ مقتدیوں کو

---

(۱) ويكره الإسراع في القراءة وفي أداء الأركان كذا في السراجية وكلما رتّل فهو حسن (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۷-۱۱۸، فصل في التراويح).

(۲) قال في البحر: فالحاصل أن المصحح في المذهب أنّ الختم سنة لكن لا يلزم منه عدم تركه إذا لزم منه تنفير القوم وتعطيل كثير من المساجد خصوصاً في زماننا، فالظاهر اختيار الأخف على القوم (البحر الرائق: ۲/ ۱۲۱).

امام کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا میں شامل ہونا چاہیے؟ کیا اس طرح امام کے ساتھ شامل ہونے پر دعا کے مقبولیت کے مواقع بڑھ جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اکثر امام بہ آواز بلند دعا کیوں نہیں مانگتے؟ ہر فرض نماز کے بعد، یہاں تک کہ ہمارے امام صاحب تو یہ اشارہ بھی نہیں دیتے کہ اب امام نے دعا کو ہاتھ اٹھائے یا ختم کر کے گرایا، اگر امام کے ساتھ دعا میں شامل ہونا ہے تو امام کو پوری دعا نہ سہی صرف بآواز بلند اشارہ تو کرنا چاہیے کہ مقتدی کو پتہ چلے کہ اب امام صاحب نے دعا کو ہاتھ اٹھایا، چوں کہ ممبئی میں مسجدیں دو منزلہ ہوتی ہیں اور مسجدیں اوپر بھی بھری رہتی ہیں، اگر امام اشارہ نہ کرے تو مقتدی کو کیسے معلوم ہوگا کہ امام نے دعا کے لیے صرف ہاتھ اٹھائے ہیں، زور سے بھی اشارہ نہیں کر سکتے، حتی کہ صرف اللھم درود شریف کا ایک لفظ بھی زور سے نہیں کہہ سکتے ہیں، تو اگر ایسا ہے تو کیوں؟ قرآن وحدیث سے بیان کریں۔ (۹۲۲/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

فرض نماز کے بعد دعا کرنا احادیث سے ثابت ہے (۱)، مگر دونوں (امام اور مقتدی) کا ایک ساتھ دعا شروع کرنا ضروری نہیں اور نہ ایک ساتھ ختم کرنا ضروری ہے، امام کے سلام پھیرتے ہی اقتداء ختم ہوجاتی ہے، اب امام اور مقتدی دونوں اپنے اپنے عمل میں آزاد ہیں اور حسبِ منشاء اپنی اپنی دعا کر سکتے ہیں، دعا زور سے بھی کی جاسکتی ہے اور آہستہ بھی (۲)، البتہ آہستہ دعا کرنا افضل ہے؛ کیونکہ قرآن نے دعا کا ادب ہی یہ بتایا ہے کہ دعا میں فروتنی اور پست آواز ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً** (سورہ اعراف:۵۵) ترجمہ: تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو، تذلل ظاہر کر کے اور چپکے چپکے بھی، اس میں سہولت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق

---

(۱) عن أبي أمامة رضي الله عنه قال: مادنوت من رسول الله صلّى الله عليه وسلّم في دبر صلاة مكتوبة ولا تطوع إلا سمعته يقول: اللّهم اغفرلي ذنوبي وخطاياي كلها الخ (عمل اليوم والليلة لابن سني، باب ما يقول في دبر صلاة الصبح، رقم:۱۱۷، ط: ابن حزم، بيروت)

(۲) ما من عبد بسط كفيه في دبر كل صلاة ثم يقول: اللهم إلهي وإله إبراهيم وإسحاق ويعقوب وإله جبرئيل وميكائيل الحديث (عمل اليوم والليلة لابن السني، رقم:۱۳۹، ط: ابن حزم، بيروت)

دعا کرسکتا ہے: کیوں کہ ہر شخص کی ضرورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے (۳) ویسے گاہ بہ گاہ یا کسی خاص موقعے سے زور سے دعا کرنے اور دعا کے شروع وختم کے کلمات کو بلند آواز سے کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں (۴)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۶/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

امامت: جس پر فقہاء نے اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے اس کے عموم میں تراویح کی امامت داخل نہیں، لہٰذا اس عنوان سے تراویح پڑھانے پر اجرت لینا جائز نہیں

سوال: ﴿۴۲﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں:

ایک مسجد میں امامت کے لیے مولانا مفتی.............صاحب کا تقرر ہوا، منتظمہ کمیٹی نے پنجوقتہ نمازوں کی امامت کے لیے مفتی صاحب کا مشاہرہ، دس ہزار روپے طے کیا اور منتظمہ کمیٹی نے مفتی صاحب سے یہ کہا کہ اگر آپ جمعہ کے روز خطبہ سے قبل بیان فرمائیں گے تو فی جمعہ دوسو روپے کے لحاظ سے مزید آپ کی خدمت کی جائے گی، مفتی صاحب پنجوقتہ نمازوں کی امامت اور جمعہ کی خطابت کے لیے مذکورہ مشاہرہ پر راضی ہوگئے، مگر مفتی صاحب نے اپنی جانب سے یہ شرط لگائی کہ ماہِ رمضان میں اضافی خدمت یعنی پنجوقتہ نمازوں کے علاوہ روزانہ بعد نماز فرض عشاء مزید تیئیس

(۱) عن أبي موسیٰ الأشعري أنه صلّی اللّٰه علیه وسلّم قال لقوم یجهرون: أیها الناس! اربعوا علی أنفسکم أنکم لا تدعون أصم ولا غائباً، إنکم تدعون سمیعاً بصیراً وهو معکم وهو أقرب إلیٰ أحدکم من عنق راحلته (روح المعاني سورة: ۷:الآیة :۵۵، أبو داؤد: رقم: ۱۵۲۶، بتغیریسیر).

(۲) إذا دعا بالدعاء المأثور جهراً ومعه القوم أیضاً لیتعلموا الدعاء لا بأس به (الفتاوی الهندیة: ۳۱۸/۵، ط: کتاب الکراهیة).

رکعتوں کی امامت کے لیے بیس ہزار روپے لوں گا، منتظمہ کمیٹی نے مفتی صاحب کی اس معقول شرط کو تسلیم کرلیا کہ جب خدمت میں اضافہ ہو تو مشاہرہ میں بھی اضافہ ہونا چاہیے، منتظمہ کمیٹی نے مفتی صاحب کو اس اضافی خدمت کے نتیجے میں طے شدہ مشاہرہ کے علاوہ بیس ہزار روپے دینا منظور کرلیا، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ پنجوقتہ نمازوں کی امامت کے علاوہ رمضان میں یومیہ ۲۳/ رکعتوں کی امامت کے لیے مفتی صاحب کو طے شدہ ۲۰/ ہزار روپے لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

المستفتی: انیس احمد آزاد قاسمی بلگرامی خادم جامعہ عربیہ سید المدارس ۵۲۱/ ڈ گلی نمبر ا متصل سعیدیہ مسجد چوہان بانگر نیو سیلم پور، دہلی ۵۳۔ (۴/ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

تراویح کی نماز کے لیے الگ سے معاوضہ طے کرنا درست نہیں، فی نفسہ امامت جو بالفعل ادائیگی نماز کے ساتھ بعض اور ذمہ داریوں (مثلاً پابندی اوقات وغیرہ) پر مشتمل ہوتی ہے، اس کی اجرت لینا فقہائے متأخرین کے قول پر جائز ہے، مگر ایک ایک نماز کے لیے رقم کی تعیین کر کے لینا ثقاہت اور وقار نماز کے خلاف ہے کہ عصر پڑھانے کا دس روپیہ اور مغرب پڑھانے کا پندرہ روپیہ، تراویح کی نماز فرض بھی نہیں ہے، نیز اس کی امامت سے مقصود قرآن سنانا اور اسی پر اجرت لینا ہوتا ہے اور قرآن سنانے کی اجرت کا لین دین ناجائز ہے؛ لہٰذا تراویح کی امامت کے لیے تنخواہ الگ سے مقرر کرنا درست نہیں، منتظمہ کمیٹی کو چاہیے نماز تراویح کی امامت جملہ نماز میں شامل کر کے معاملہ طے کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

نوٹ: مفتی صاحب نے معاملہ کس طرح طے کیا بقلم خود لکھ کر بھیجیں تو اس کا جواب لکھ دیا جائے گا۔

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

سوال: ﴿۳۴﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

ایک بستی میں ۳/ مساجد ہیں، ایک مسجد کے امام صاحب حافظ قرآن نہیں ہیں، اس مجبوری کی وجہ سے وہ روزانہ تراویح کی ۲۰/ رکعتوں میں آخری دس سورتوں کے اعادہ کے ساتھ قرآن کی

تلاوت فرماتے ہیں، دوسری مسجد کے امام صاحب بھی مکمل حافظ نہیں ہیں، البتہ پارہ عم انہیں از بر یاد ہے، وہ اپنے مقتدیوں کی رضامندی سے روزانہ بیس رکعت تراویح میں ایک پارہ عم کی تلاوت فرماتے ہیں، تیسری مسجد کے امام صاحب مکمل حافظ قرآن ہیں اور وہ روزانہ تراویح کی بیس رکعتوں میں تدریج کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان تینوں اماموں میں سے کس کے لیے تراویح کی بیس رکعتوں کی امامت پر مشاہرہ کے علاوہ اضافی رقم لینا جائز ہے اور کس کے لیے جائز نہیں؟

سوال کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ماہنامہ ندائے شاہی میں ستمبر ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں حضرت مفتی شبیر احمد صاحب کا ایک فتوی شائع ہوا ہے اور اس فتویٰ کی تصدیق دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء نے بھی کی ہے، اس فتویٰ میں مفتی شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں:

''موضوع بحث ختم قرآن پر اجرت کا جواز وعدم جواز ہے، نفس تراویح پر اجرت کا جواز وعدم جواز نہیں ہے، اگر کسی جگہ الم ترکیف سے تراویح کی نماز ہوتی ہے اور امام اس پر اجرت لیتا ہے تو میری معلومات میں فقہائے متأخرین اور اکابر اہلِ فتویٰ میں سے کسی نے بھی اس کے عدمِ جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے''۔ (انوارِ رحمت ۴۸۹) ماہنامہ ندائے شاہی ماہِ ستمبر ۲۰۰۰ء)

تو جس مسجد کے امام صاحب ایک پارہ تراویح کی نماز پڑھاتے ہیں، ان امام صاحب کا کہنا ہے کہ جب الم ترکیف سے تراویح پڑھانے والے امام صاحب ماہِ رمضان میں مفتیان کرام کے فتویٰ کی روشنی میں اضافی رقم لے سکتے ہیں تو مجھے اضافی رقم لینے میں کیا شرعی عذر ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ الم ترکیف سے پڑھانے والے سے زیادہ میرا وقت محبوس ہوتا ہے، اسی طرز میں ان امام صاحب نے بھی بحث چھیڑ دی، جو پورے قرآن کی تدریجی تلاوت سے تراویح کی بیس رکعتیں پڑھاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: جب ''الم ترکیف'' سے تراویح پڑھانے والے کے لیے مفتیان کرام نے اضافی رقم لینے کے جواز کا فتویٰ جاری کر دیا ہے تو میرے لیے اضافی رقم لینے پر کیوں پابندی ہے؟ تراویح کی نمازوں میں قرآن خواہ تھوڑا پڑھا جائے یا زیادہ حکم یکساں رہنا چاہیے۔

اس لیے یہ وضاحت مطلوب ہے کہ ان تینوں اماموں کے لیے اضافی رقم کے سلسلے میں یکساں حکم ہے یا تینوں کے لیے الگ الگ حکم ہے؟

گستاخی کی معذرت کے ساتھ عرض گزار ہوں کہ جواب با حوالہ ہو اور عبارت اپنے موضوع میں صریح ہو، سائل آپ سے اس موضوع پر شریعت کا حتمی فیصلہ حلال یا حرام کی شکل میں جاننا چاہتا ہے، سائل آپ سے فی الحال کسی مشورہ کا طلبگار نہیں ہے، اس لیے نہایت واضح لفظوں میں حلال یا حرام کا فیصلہ مع دلائل شرعیہ، تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں، واضح رہے کہ سوال کا تعلق نفس تراویح کی امامت سے ہے نہ کہ قرأت مجردہ سے۔ بینوا توجروا۔

انیس احمد آزاد قاسمی بلگرامی خادم جامعہ عربیہ سید المدارس چوہان بانگر دہلی ۵۳

المدیر العام لهئية شؤون الائمة فی الهند

D-521 گلی نمبر ا، متصل سعیدیہ مسجد، چوہان بانگر، نیوسیلم پور، دہلی -53 (۲۷/۱ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

روزانہ ۲۰؍ رکعات تراویح کے بالمقابل، اضافی تنخواہ مستقلاً طے کر کے لینا، مذکورہ تینوں اماموں میں سے کسی کے لیے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اگر تلاوت کا عوض مقصود ہے تب تو آیت کریمہ: ''وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا'' اور حدیث نبوی: ''اقرأوا القرآن ولاتأكلوا بــــه'' (مسند احمد)(۱) کی رو سے ناجائز اور حرام ہے، اور اگر تلاوت مقصود نہ ہو، بلکہ صرف امامتِ تراویح کا عوض مقصود ہو جیسا کہ مستفتی کا دعوی ہے تب بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ متأخرینِ فقہاء نے اگر چہ اجرت کو ضرورۃً جائز قرار دیا ہے لیکن امامت میں عموم نہیں ہے بلکہ امامت سے پنجوقتہ نمازوں کی امامت مراد ہے، لہٰذا تراویح، نمازِ جنازہ اور عیدین کی امامت پر اجرت لینا جائز نہ ہوگا، ذیل میں اکابر ارباب افتاء کے چند فتاویٰ نقل کیے جاتے ہیں جن سے لفظِ امامت - جو فقہا کی عبارتوں میں وارد ہوا ہے - کی مراد سمجھنے میں آسانی ہوگی:

(۱) فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۵/ ۳۰۸ میں ہے:

سوال: وعظ، قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ الخ

جواب: وعظ پر اجرت لینے کو متأخرین حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ رد المحتار میں ہے:

(۱) اقرأو القرآن ولاتغلوا فيه ولا تجفوا عنه ولاتأكلوا به ولا تستكثروا به. (مسند أحمد: رقم: ۱۵۱۰۳)

وزاد بعضھم الخ اور اس کے علاوہ قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح کی نماز پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اور مشہور قاعدہ "**المعروف کا لمشروط**" کے اعتبار سے مذکورہ اجرت کو صدقہ نام دینا، مفیدِ حلت نہیں ہے اور اسے جائز قرار دینے والے اور حرام امور کو رائج کرنے والے، بدعتی اور گناہ گار ہیں الخ۔

(۲) فتاوی محمودیہ: ۱۷/۱۶۱ میں ہے:

سوال: مردے کی نماز پڑھ کر خیرات لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اصل یہ ہے کہ عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں؛ لیکن متأخرین نے بہ ضرورت بعض عبادات کو مستثنیٰ کیا ہے؛ ان میں امامت نمازِ پنجوقتہ بھی ہے، اور یہ خیرات بہ ظاہر اجرت ہے اور امامتِ نمازِ جنازہ کو فقہاء نے مستثنیٰ نہیں کیا؛ لہٰذا محض اس امامت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

(۳) امداد المفتین: ۳۶۳ میں ہے:

(ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں) اصل مذہب میں مطلقاً عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، خواہ کوئی عبادت ہو، لیکن حضرات متأخرین نے ضرورت کی وجہ سے اس قاعدہ کلیہ سے چند چیزیں مستثنیٰ کی ہیں اور یہ تصریح فرمائی کہ یہ استثناء انہیں چیزوں میں ہے، باقی عبادات وطاعات اپنے اصلی حکم پر ہیں کہ ان میں اجرت لینا جائز نہ ہوگا اور ان مستثنیات میں ختمِ قرآن اور تراویح کو (۱) کسی نے شامل نہیں فرمایا، اس لیے اس پر اجرت لینا اسی طرح ناجائز رہے گا .... مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ تراویح میں ختمِ قرآن کرنا واجب نہیں ہے؛ بلکہ سنت ہے اور سستی قوم کے عذر سے چھوڑ دینا بھی جائز ہے؛ اس لیے ختم کی ضرورت کو ضرورتِ امامت یا ضرورتِ تعلیم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا؛ لہٰذا اگر کوئی شخص بلا اجرت پڑھنے والا نہ ملے تو جس قدر سورتیں محلّہ والوں کو یاد ہوں ان سے تراویح پڑھنا اس سے بہتر ہوگا کہ اجرت دے کر کسی سے پڑھوائیں۔

---

(۱) نوٹ: اصل کتاب میں "اور" کے بجائے "در" ہے ایسی صورت میں امداد المفتین کی عبارت سے استشہاد تام نہیں ہوتا؛ لہٰذا اس استشہاد سے رجوع کیا جاتا ہے۔ زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دار العلوم دیوبند ۶/۱۹/۳۲ھ

(۴) فتاوی رحیمیہ: ۶/ ۲۵۶ میں ہے:

(ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں) اصل حکم تو یہی ہے کہ طاعات پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے؛ مگر متاخرین نے بقاء دین کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر تعلیم قرآن، امامت، اذان وغیرہ چند چیزوں پر اجرت لینے دینے کے جواز کا فتوی دیا ہے، جن چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جواز کا حکم انہی میں منحصر رہے گا، تراویح مستثنیٰ کردہ چیزوں میں نہیں ہے؛ اس لیے اصل مذہب کی بنیاد پر تراویح پر اجرت لینا ناجائز ہی رہے گا۔

(۵) فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۵/ ۳۲۰ میں ہے:

''معاوضہ لینا اور فدیہ لینا، نماز جنازہ کا حرام ہے، یہ لینے والے کی جہالت ہے اور طمع دنیاوی نے اس کو اندھا کر دیا ہے کہ مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنے پر اجرت لیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔

(۶) فتاوی دارالعلوم: ۱۵/ ۳۱۴ میں ہے:

سوال: مسجد کا امام امامت کی اجرت تو نہیں لیتا، مگر جنازہ کی نماز اور نکاح بغیر اجرت کے نہیں پڑھاتا یہ درست ہے یا نہیں؟

جواب: امامت پر اجرت لینا درست ہے؛ لیکن خاص جنازہ کی نماز بلا اجرت لیے نہ پڑھانا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ بہ موجب حکم صلّوا علی کلّ برّ وفاجر الحدیث نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے اس پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔ انتہیٰ

نیز تراویح کی امامت پر اجرت لینے کے عدمِ جواز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امامت پر اجرت لینے کی اجازت ضرورت کے بنا پر دی گئی ہے یہ ضرورت پنجوقتہ نمازوں میں تو مکمل طور پر متحقق ہے؛ اس لیے کہ پانچ وقت نماز اور ان کو باجماعت ادا کرنا شعائرِ اسلام میں سے ہے، اسی لیے احادیث میں جماعت میں شریک ہونے کے بارے میں بہت تاکید وارد ہوئی ہے اور تارکینِ جماعت کے سلسلے میں سخت وعید آئی ہے، لیکن تراویح کی امامت میں یہ ضرورت کما حقہ نہیں پائی جاتی، اس لیے کہ تراویح کی جماعت محض سنت ہے، اس پر تاکیدی حکم وارد نہیں ہوا ہے، اسی لیے اکثر فقہاء نے تراویح کی جماعت کو سنت علی الکفایہ قرار دیا ہے (الدر مع الرد: ۲/ ۴۹۵) نیز تراویح کی امامت کی ذمہ داری امام مسجد پر ہوتی ہے، جیسا کہ عیدین اور نمازِ جنازہ پڑھانے کی بھی ذمہ داری امامِ مسجد پر ہوتی ہے، اگر

امام صاحب بلا اضافی تنخواہ کے ختمِ قرآن پر راضی نہ ہوں تو الم ترکیف سے ۲۰؍رکعات تراویح پڑھادیں، اگر بالفرض ایسا بھی ممکن نہ ہوتو جس قدر سورتیں محلّہ والوں کو یاد ہوں ان سے باجماعت یا پھر تنہا ہی پڑھ لیوے۔ چناں چہ امداد الاحکام: ۴۳۵ میں ختمِ قرآن کی اجرت پہلے سے طے کرنے والے حافظ سے متعلق لکھتے ہیں ''یہ فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہ چاہیے، بلکہ الم ترکیف سے چند آدمیوں کے ساتھ جدا جماعت کرلی جاوے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتو تنہا پڑھ لی جاوے۔

حضرت مولانا مفتی شبیر صاحب کے جس اقتباس کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے، اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ وہ کوئی مستقل فتویٰ نہیں ہے؛ بلکہ ایک بنگالی عالم مولوی غلام رحمٰن صاحب کی تحریر (جس میں مولوی موصوف نے امامتِ تراویح کا شبہہ پیدا کر کے ختمِ قرآن پر اجرت کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی تھی) کے جواب اور تردید میں لکھے گئے اجرتِ تراویح کے حرام ہونے سے متعلق ایک مفصل فتویٰ کا اقتباس ہے، جسے حضرت مفتی صاحب نے دورانِ بحث تحریر فرمایا اور اپنے علم کے مطابق ایک بات کی نفی کی ہے، اس عبارت کے ذریعہ حضرت مفتی صاحب نے کسی مسئلے کے بارے میں فتویٰ نہیں دیا ہے؛ لہٰذا یہ اقتباس مسئلۂ زیرِ بحث میں حجت نہ بنے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۲/۲/۲۵ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلندشہری، فخرالاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ،

(مہر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) العبد محمد طاہر عفا اللہ عنہ، مقصود عالم، مظاہر علوم سہارن پور ۱۴۳۲/۲/۲۷ھ

(مہر مدرسہ جامعہ خادم الاسلام ہاپوڑ) محمد اصغر غفرلہ ۱۴۳۲/۳/۲، محمد عباد الرحمٰن ۳۲/۳/۷ھ،

عبدالرحمٰن غفرلہ ۳۲/۳/۸ھ　مدرسہ جامعہ خادم الاسلام ہاپوڑ

نوٹ: مسئلہ زیرِ بحث کے متعلق حضرت مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ (طاعتیں) جن میں سوائے ثواب آخرت نہ کچھ اور مقصود ہے نہ موضوع، جیسے تسبیح وتہلیل، تلاوتِ قرآن نوافل، ان کا اجارہ ناجائز اور عوض غیر حلال ہے، اس لیے کہ ثواب موقوف ہے نیت وخلوص وللّٰہیت پر، اور یہاں ہمہ تن اجرت ہے، پس اجر نہ رہا اور بعد نفی اجر، نہ ان کے لیے صحت ہے نہ فائدہ، کیسا اجر اور کس کا اجارہ؟ اور اگر ثواب فرض کیا جائے تو اجرت مکرر کی وجہ، پھر ثواب عطیۂ الٰہی ہے ملک عبد نہیں، جسے وہ بیچ سکے، ص: ۱۴۳۔ اور آگے تحریر فرماتے ہیں کہ ''تراویح یا قرآن پڑھنا

بشرط اجرت نہ موجبِ ثواب ہیں نہ قابلِ عوض، علماء نے اسے حرام، واجب الترديد قرار دیا ہے، **كذا في تطهير الأموال في تحقيق الحرام والحلال: ۱۴۴/.**

(مہر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) مجد القدوس خبیب رومی

مفتی مظاہر علوم وقف سہارن پور ۲۷/۲/۱۴۳۲ھ،

عبد الحسیب، مظفر الاسلام تھانوی، محمود حسن، علی حسن نہٹوری ۲۷ صفر المظفر ۳۲ھ،

دار الافتاء مظاہر علوم (وقف) سہارن پور ۲۷/۲/۱۴۳۲ھ

۸۳۷/ د، ۱۸۲۱/ الف، ۳/۳/۳۲ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پنجوقتہ نمازوں کی امامت اور تعلیمِ قرآن وغیرہ پر بھی متقدمین کے نزدیک اجرت لینا دینا جائز نہیں ہے اور متأخرین فقہاء کرام نے ان پر اجرت کے جواز کا جو فتویٰ دیا ہے، اس میں علت کی وضاحت فرمائی ہے کہ اگر ان امور پر اجرت کا لین دین نہ ہو تو فی زمانہ ان امور کو پورے طور پر انجام نہیں دیا جائے گا اور ان ابواب کے تعطل سے ہدمِ دین لازم آئے گا، جب کہ بقاء دین بنیادی مقصد ہے، ہدایہ: ۳/ ۲۸۷، الجوہرۃ النیرۃ: ۲/ ۱۲۶، رسم المفتی: ۳۸ اور شامی: ۹/ ۷۶ وغیرہ کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے، فی زمانہ بغیر اجرت نماز تراویح کی امامت کے لیے جس درجہ شوق ہے اور جس قدر سہولت ہے، اس کے ہوتے ہوئے نماز تراویح کی امامت پر اجرت کے جواز کو پنجوقتہ نمازوں اور تعلیم قرآن وغیرہ کے جواز پر قیاس کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، مذکورہ سوال میں ایک رسالہ میں شائع کسی فتوی کا حوالہ ہے جس میں لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ الم ترکیف سے تراویح کی نماز ہوتی ہے اور امام اس پر اجرت لیتا ہے تو میری معلومات میں فقہاء متأخرین اور اکابر اہلِ فتویٰ میں سے کسی نے بھی اس کے عدمِ جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ تحریر کنندہ سے معلوم کیا جائے کہ کسی نے بھی عدمِ جواز کا فتویٰ نہیں دیا؛ لیکن جواز کا فتویٰ بھی تو کسی نے نہیں دیا، جب کہ عبادات پر اجرت اصلاً ناجائز ہے۔ حاصل یہ کہ تراویح کی امامت پر اجرت کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور دار الافتاء دار العلوم دیوبند کا فتویٰ مجریہ ۲۵/ صفر ۳۲ھ سوال ۱۷۱/ د، جواب ۱۱۵/ د بالکل صحیح اور درست ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

محمد احسان، خورشید عالم (مہر دار العلوم وقف دیوبند)

تمہید: گذشتہ فتوی: ۱۱۵/۱۷۱۲ دمجریہ ۳۲/۲/۲۵ میں نقل عبارت میں ایک تسامح ہو گیا تھا نیز بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ سابقہ دونوں فتوے اکابر علماء دیوبند خصوصاً ارباب افتاء کے نہج سے مختلف لکھے گئے ہیں؛ اس لیے حضرت مہتمم دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب مدظلہ العالی کے استفسار پر دونوں امر کی وضاحت پیش کرتے ہوئے درج ذیل مفصل فتویٰ جاری کیا گیا جس پر بعض مؤقر اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے بھی دستخط ہیں۔

(۲۶۰/ فائل د) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدومی ومکرمی حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتکم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ واقعۃً ''**امداد المفتیین**'' کی عبارت مسودہ میں نقل کرنے میں ''در'' کی جگہ ''اور'' لکھا گیا، پھر اسی کے مطابق مطلب مفہوم ہو کر فتوے میں درج ہو گیا، چونکہ **امداد المفتیین** کی اصل عبارت سے استشہاد تام نہیں ہوتا؛ اس لیے احقر **امداد المفتیین** کے مذکورہ استشہاد سے رجوع کرتا ہے۔ اس سے جملہ استشہادات میں سے ایک کی کمی اگر چہ ہو جائے گی، مگر نفس حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا، کیوں کہ مسئلے کا اثبات صرف اسی پر موقوف نہیں ہے۔

فتوی ۴/د/ فائل: ا مجریہ ۴/۱/۳۲ھ و ۱۷۲/د/ ۱۱۵ مجریہ ۳۲/۲/۲۵ھ میں جو حکم لکھا گیا ہے اس کے اور بھی مؤیدات ہیں، جنہیں آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

دونوں فتووں کی بابت عرض یہ ہے کہ فتوی ۴/د/ فائل: ا اور فتویٰ ۱۷۲/ ۱۱۵ یہ دونوں فتوے افادۂ حکم میں اکابر کے فتووں کے موافق ہیں۔

فتوی ۴/ دمجریہ ۴/۱/۳۲ھ میں بنیادی طور پر تین باتیں ذکر کی گئی ہیں:

(۱) تراویح کی امامت کی اجرت الگ سے مستقلاً طے کر کے لینا جائز نہیں۔

(۲) تبعاً رقم لینے کی گنجائش ہے۔

(۳) امامت تراویح سے مقصود قرآن سنانا ہی ہوتا ہے۔

اول الذکر بات یعنی تراویح کی امامت کی اجرت الگ سے مستقلا طے کر کے لینا جائز نہیں، فتویٰ ۴/ د کے پہلے جملے ''تراویح کی نماز کے لیے الگ سے معاوضہ طے کرنا درست نہیں'' اور دوسری

بات یعنی ''تبعاً رقم لینے کی گنجائش ہے'' فتوی ۴/د کی عبارت منتظمہ کمیٹی کو چاہیے کہ نماز تراویح کی امامت، جملہ نمازوں میں شامل کر کے معاملہ کرے'' سے، اور تیسری بات یعنی ''امامت تراویح سے مقصود قرآن سنانا ہی ہوتا ہے'' فتوی ۴/د کے الفاظ ''اس کی امامت سے مقصود قرآن سنانا اور اس پر اجرت لینا ہوتا ہے'' سے بیان کی گئی ہے۔

نوٹ: تراویح کے لیے کسی امام کو متعین کرنے کی نظیر قدیم عربی کتابوں میں بہت کم ملتی ہے اس کا رواج بعد میں پڑا؛ اس لیے ہمارے اکابر اربابِ فتوی کے فتاوی سے مؤیدات وشواہد پیش کیے جاتے ہیں۔

جزء اوّل: ''تراویح کی امامت کی اجرت الگ سے مستقلاً طے کر کے لینا جائز نہیں'' اس کی وجہ یہ ہے کہ متقدمین احناف کے نزدیک تو ہر طرح کی طاعت پر اجرت لینا ناجائز تھا، لیکن فقہاء متأخرین نے (حبس وقت نہیں) بلکہ ضرورت شرعی کے پیشِ نظر (ملاحظہ ہو: فتاوی محمودیہ: ۱۷/۹۱، کتاب الاجارۃ) چند طاعات پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا: **ویفتی الیوم بصحتها (الاجارة) علی تعلیم القرآن والفقه والإمامة والأذان**'' الدر مع الرد: ۵/۴۶، اور فقہائے احناف نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ جن چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا، استثناء انہیں میں منحصر رہے گا۔''**علی أن المفتی به لیس هو جواز الاستجار علی کل طاعة ، بل علی ماذکروه فقط مما فیه ضرورة ظاهرة تبیح الخروج عن أصل المذهب الخ**(الدر مع الرد، کتاب الاجارۃ: ۹/۷۶)۔

مستثنیٰ کردہ چیزوں میں لفظ ''امامت'' اگرچہ مطلق ہے؛ لیکن دار العلوم دیوبند کے اکابر ارباب افتاء خصوصاً مفتیٔ اعظم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ نیز دیگر مفتیان کرام کے نزدیک یہ لفظ یعنی ''امامت'' اپنے اطلاق پر نہیں ہے؛ بلکہ اس سے پنج وقتہ فرائض کی امامت مراد ہے، تراویح، نماز عیدین اور جنازے کی امامت مراد نہیں، اس لیے ان چیزوں (تراویح، عیدین اور نماز جنازہ) پر اجرت لینے کا حکم اپنی اصل یعنی عدمِ جواز ہی کا رہے گا۔ ذیل میں حضرات اکابر ارباب افتاء کے چند اقتباسات ذکر کیے جاتے ہیں، جن سے واضح طور پر مذکورہ بالا باتیں (یعنی لفظ امامت کا اپنے اطلاق پر نہ ہونا اور تراویح، عیدین اور نماز جنازہ کی امامت کا مستثنیٰ کردہ چیزوں میں شامل نہ ہونا) ثابت ہوتی ہیں۔

اقتباس نمبر (۱): از حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۵/ ۳۰۸

سوال: وعظ، قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اسے صدقہ کا نام دینا، جواز کے حیلے کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جائز قرار دینے والوں اور جواز کا عقیدہ رکھنے والوں پر فسق کا حکم لگے گا یا نہیں؟ ان کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: وعظ پر اجرت لینے کو متأخرین حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے جیسا کہ ردالمحتار میں ہے: **وزاد بعضهم الخ**، اس کے علاوہ قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح کی نماز پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اور مشہور قاعدہ "**المعروف كالمشروط**" کے اعتبار سے مذکورہ اجرت کو صدقہ کا نام دینا مفید حلت نہیں، اور اسے جائز قرار دینے والے اور حرام امور کو رائج کرنے والے، بدعتی اور گنہ گار ہیں، اقتداء کے لائق نہیں ہیں اور فسق کے نام کے زیادہ حقدار ہیں۔

اقتباس نمبر (۲): از حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی، فتاوی محمودیہ: ۱۷/ ۶۱، ۶۲، ادارہ صدیق ڈھابیل گجرات۔

سوال: مردے کی نماز پڑھ کر خیرات لینا جائز ہے یا نہیں؟ فقط

الجواب حامداً مصلیا: اصل یہ ہے کہ عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، لیکن متأخرین نے بضرورت بعض عبادات کو مستثنیٰ کیا ہے، ان میں امامتِ نماز پنجوقتہ بھی ہے: **ويفتى اليوم بصحتها (أي الإجارة) على تعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان** " درمختار علی الشامی: ۵/ ۴۶، اور یہ خیرات بظاہر اجرت ہے اور امامت نماز جنازہ کو فقہاء نے مستثنیٰ نہیں کیا لہٰذا محض اس امامت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اقتباس نمبر (۳): از مفتی عزیز الرحمٰن صاحب فتاوی دارالعلوم: ۱۵/ ۳۱۴

سوال: مسجد کا امام، اجرت تو نہیں لیتا، مگر جنازے کی نماز اور نکاح بغیر اجرت کے نہیں پڑھاتا یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: امامت پر اجرت لینا درست ہے، لیکن خاص جنازہ کی نماز بلا اجرت لیے نہ پڑھانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ موجب حکم: **صلوا على كل بر وفاجر** (الحدیث)، نماز جنازہ فرض کفایہ ہے اس پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔

اقتباس نمبر (۴): از مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، فتاوی دار العلوم: ۵/ ۳۶۵

سوال: صلاۃ جنازہ با جرت خواندہ شود آیا صلاۃ جنازہ ادا شود یا نہ از مصلیان فرض کفایہ ساقط شود یا نہ؟

الجواب: صلاۃ جنازہ ادا شود، فرضیت ساقط شود، لیکن اخذ اجرت بر آں حرام ومعصیت است درحق آخذ وآنچہ معروف است نیز بحکم مشروط شدہ حرام خواہد شد۔

اقتباس نمبر (۵): از حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب فتاوی دار العلوم: ۵/ ۳۲۰

سوال: ایک شخص نے عمر بھر نماز روزہ نہیں کیا، بعد مرنے کے ایک عالم نے مشکل سے پانچ روپے فدیہ کے لے کر نماز جنازہ پڑھائی، ایسا فدیہ لینا شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس مسلمان بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھنا فرض تھا، **لقوله علیه الصّلاة والسّلام: صلّوا علی کل برو فاجر** (الحدیث) اور معاوضہ لینا اور فدیہ لینا نماز جنازہ کا حرام ہے، یہ لینے والے کی جہالت ہے اور طمع دنیاوی نے اس کو اندھا کر دیا ہے کہ مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنے پر اجرت لیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہدایت فرمادے۔

اقتباس نمبر (۶): از حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، فتاوی محمودیہ: ۱۷/ ۵۲، ۵۱

سوال: بعض علاقہ میں دستور ہے کہ عید کے روز خصوصیت سے عید ہی کی نماز پڑھانے کے لیے ایک امام مقرر کیا جاتا ہے، بلکہ بعض ائمہ اپنی اجرت متعین کر لیتے ہیں کہ مثلاً بیس روپے دو گے تو عید کی نماز پڑھاؤں گا، اور بعض ائمہ اپنی اجرت تو مقرر نہیں کرتے مگر بعض مقتدی حسبِ وسعت امام کی خدمت میں کچھ نذرانہ پیش کرتے ہیں، اگر مقتدی روپیہ نہیں دیتے ہیں تو امام صاحب ناراض ہو جاتے ہیں، اور یہ بھی دستور ہے کہ عید کے روز ہر شخص اپنے احباب وعزیزوں وبزرگوں کے ساتھ معانقہ ومصافحہ کرتا ہے، عید کے روز مصافحہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً مصلیا: اس طرح امامت پر اجرت لینا، ناجائز ہے، عید کا مصافحہ اور معانقہ جیسا کہ بعض جگہ رائج ہے، وہ بدعت اور ممنوع ہے۔

اقتباس نمبر (۷): از مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، کفایت المفتی: ۳/ ۴۱۲

سوال: ایک مسلمان خود نماز پنج گانہ یا تراویح نہیں پڑھتا، لیکن بغرض حصول ثواب روپیہ دے کر کسی مسلمان سے نماز تراویح پڑھواتا ہے تو اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟

(۱) کسی مسجد میں ایک امام بہ تنخواہ قلیل یا کثیر، پنج وقتہ نماز پڑھانے کے لیے مقرر ہے اور وہ نماز تراویح بھی پڑھاتا ہے تو ایسی نماز تراویح سے امام ومقتدی کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

(۲) ایسا روپیہ جو امام صاحبان نماز تراویح میں خلاف شرع لیتے ہیں تو وہ رقم حلال ہے یا حرام؟

الجواب: روپیہ دینا جب تراویح کے معاوضہ میں جائز ہی نہیں ہے تو اس کا ثواب کیا ملے گا۔

(۱) بے شک ایسی نماز تراویح سے امام ومقتدیان کو بھی ثواب ملے گا۔

(۲) یہ رقم جو ناجائز طریق پر وہ لیں گے، ان کے لیے مکروہ تحریمی ہوگی۔

اقتباس نمبر (۸): فتاوی رحیمیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں، جس میں امامتِ تراویح کو امامتِ پنج وقتہ پر قیاس کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اقتبـاس ''یہ اشکال نہ ہونا چاہیے کہ مسجد کا مقرر امام بھی امام ہے اور تراویح کے لیے جو حافظ مقرر کیا گیا ہے وہ بھی امام تراویح ہے، تو مقرر امام کی تنخواہ کیوں جائز اور امام تراویح کی اجرت کس بنا پر ناجائز؟ اصل مذہب یہ ہے کہ طاعات پر اجرت لینا دینا جائز نہیں؛ مگر فقہاء نے بقاء دین کو ملحوظ رکھ کر تعلیمِ قرآن، امامت، اذان وغیرہ چند چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے اور ان پر اجرت لینے دینے کے جواز کا فتوی دیا ہے۔ تراویح مستثنیٰ چیزوں میں شامل نہیں، اس لیے اصل مذہب کی بنیاد پر تراویح پر اجرت لینا دینا، ناجائز ہی رہے گا، نیز تراویح کی ادائیگی، ختم قرآن پر موقوف نہیں الم ترکیف سے بھی پڑھی جاسکتی ہے اس لیے اس میں ضیاعِ دین بھی نہیں؛ لہٰذا تراویح کی قرأت مثل تلاوت مجردہ ہے جس پر اجرت لینا ناجائز ہے (فتاوی رحیمہ: ۷/ ۲۹۷)۔

نیز اگر تراویح کی امامت کے لیے الگ سے معاوضہ طے کر کے لینا شرعاً جائز ہوتا تو اکابر مفتیان عظام، مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ وغیرہ کو حافظ کی خدمت میں نذرانہ پیش کرنے کے لیے مختلف حیلوں کا سہارا نہ لینا پڑتا، صاف یہ کہہ سکتے تھے کہ حافظ چوں کہ تراویح کی بیس رکعت نماز کی امامت کرتا ہے اور امامت پر اجرت لینے کو متأخرین فقہاء نے جائز لکھا ہے؛ لہٰذا تراویح کی امامت کا معاوضہ حافظوں کو دیدیا جائے۔ ذیل میں اکابر مفتیان کرام کے فتاوے کے چند اقتباسات جن میں اسی مقصد، یعنی حفاظ کی مالی خدمت کے لیے حیلوں کی رہنمائی کی گئی ہے۔ پیش کئے جاتے ہیں............

(۱) حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر رمضان المبارک کے مہینے کے لیے حافظ کو تنخواہ پر رکھ لیا جائے اور ایک دو نمازوں میں اس کی امامت معین (مقرر) کر دی جائے تو یہ صورت جواز کی ہے، کیوں کہ امامت کی اجرت (تنخواہ) کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔
(بحوالہ فتاوی رحیمیہ: ۱/۳۵۰. قدیم)

(۲) حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحبؒ نے بھی اسی حیلے کی تائید فرمائی، چناں چہ حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں: اصل مذہب تو عدمِ جواز ہی ہے؛ لیکن حالتِ مذکورہ میں حیلۂ مذکور کی گنجائش ہے۔ (بحوالہ رحیمیہ: ۱/۳۵۰. قدیم)

(۳) حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ فتاوی رحیمیہ: ۷/۲۹۷ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: مجبوراً یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ حافظ صاحب کو رمضان المبارک کے لیے نائب امام مقرر کریں، عشاء وغیرہ ایک دو نمازیں ان کے ذمہ کر دیں اور ساتھ ساتھ تراویح بھی پڑھائے تو اس حیلے سے مسجد کے پیسوں سے نائب امام کی تنخواہ کے طور پر لینا دینا جائز ہوگا۔

جزء دوم: ''تبعاً اجرت لینے کی گنجائش ہے''؛ یعنی تراویح کے لیے الگ سے معاوضہ طے نہ کر کے کوئی طریقہ ضمنی طور پر اپنایا جائے؛ مثلاً امام صاحب کی ماہانہ تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے اور تعیینِ تنخواہ کے وقت امام کی اضافی خدمت مثلاً نماز تراویح کی امامت، جنازہ اور عیدین کی امامت کو ملحوظ رکھا جائے، یا اس کے علاوہ تبعاً کی کوئی اور معقول شکل ہو، حضرات مفتیان کرام نے بعض موقعوں پر تبعاً رقم لینے کی اجازت اور مشورہ دیا ہے:

(۱) حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ اس بحث (تراویح میں حافظ کی اجرت) میں لکھتے ہیں کہ: اگر اہلِ مسجد واقعۃً امام اور مؤذن کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جائز صورت یہ ہے کہ ان کی مقررہ تنخواہ میں اضافہ کر دیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۳/۵۱۶، ط: زکریا دیوبند)

(۲) حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں: ہاں اگر پنجگانہ نماز کی امامت کرتا ہے اور اس کے لیے اجرت مقرر ہے اور رمضان شریف میں اس پر کچھ اضافہ کر دیا جائے تو اصل اجرتِ امامت میں تو بفتوائے متأخرین کوئی اشکال نہیں اور اس اضافہ میں بھی بظاہر گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ اضافہ اس شئ کے تابع ہے جو جائز ہے (فتاوی محمودیہ: ۷/۱۷۶)؛ یعنی امامتِ پنج گانہ کے تابع ہو کر جائز رہے گی۔

نـــــوٹ: اگر امامتِ تراویح مطلق امامت کی فرد ہوتی اور امامتِ تراویح کے نام سے مستقلاً اجرت لینا جائز ہوتا تو حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ اور حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ امامتِ تراویح پر تنخواہ لینے کو جائز فرما دیتے، لیکن مفتی عبد الرحیم صاحبؒ نے امامتِ پنج گانہ یا دوگانہ کے تابع بنا کر جائز ہونے کی بات کہی، اسی طرح مفتی محمود حسن صاحبؒ نے امامت پنج گانہ کے تابع بنا کر اضافہ کی گنجائش دی، اصالۃً امامت تراویح کی اجرت جائز نہیں فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ اصالۃً اس کی اجرت جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ امامت کے فردِ مستثنیٰ میں داخل نہیں۔

جزء سوم: ''امامت تراویح سے مقصود قرآن سنانا ہی ہوتا ہے۔''

امامتِ تراویح کے لیے امام کا تقرر نیز اس پر معاوضہ، اجرت اور نذرانہ وغیرہ کی بات، عموماً وہاں آتی ہے جہاں تراویح میں قرآن ختم کیا جاتا ہے، خواہ مسجد کا مستقل امام قرآن سنائے یا کوئی دوسرا حافظ، اور جہاں قرآن ختم نہیں کیا جاتا، وہاں چوں کہ الم تر کیف سے پڑھانا، عموماً امام مقرر کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، نیز سورۃ تراویح پڑھانے والے مصلیوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں، اس لیے وہاں معاوضہ واجرت وغیرہ کی بات پوچھی ہی نہیں جاتی، چناں چہ متداول اردو فتاوے کی کتابوں میں جہاں بھی تراویح کے حوالے سے اجرت ومعاوضہ اور نذرانہ وغیرہ کی بات دریافت کی گئی اکثر وبیشتر مقامات میں تراویح میں قرآن سنانے کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا گیا، نیز یہ بات بھی معلوم ہے کہ مفتی کے لیے فتویٰ دیتے وقت اپنے زمانہ اور قرب وجوار کے عرف کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے، مستفتی کے الفاظ کی مکمل پابندی ضروری نہیں، اس اصول اور عرف زمانہ کے پیشِ نظر زیر بحث فتویٰ ۴/ د میں یہ جملہ ''امامت تراویح سے مقصود قرآن سنانا ہی ہوتا ہے'' لکھا گیا ہے۔

ماضی کے مفتیان کرام نے بھی اپنے جوابات میں اسی عرف کو ملحوظ رکھا، ملاحظہ ہو مفتی اعظم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے دریافت کیا گیا ایک سوال اور اس پر آپ کا جواب:

سوال: جس طرح پنجوقتہ نمازوں کے لیے امام مقرر کیا جاتا ہے اسی طرح ماہِ رمضان میں تراویح کے لیے امام مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: چونکہ مسئلہ یہ ہے کہ **الأمور بمقاصدها** اور یہ بھی ہے **المعروف کالمشروط**، پس اگر کسی حافظ کو ختم قرآن شریف کے لیے تراویح کا امام بنایا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے مقصود

امامت نہیں؛ بلکہ قرآن شریف کا ختم ہے؛ لہٰذا اس پر جو کچھ اجرت دی جائے گی، وہ ختم قرآن شریف کی وجہ سے نہ بوجہ امامت محضہ کے پس حسبِ قاعدہ "لایجوز أخذ الأجرة علی قرأة القرآن" تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا جائز نہ ہوگا۔ (فتاوی دارالعلوم: ۴/۲۷۳)

نوٹ: یہاں سوال میں نہ تو ختمِ قرآن کے بارے میں پوچھا گیا اور نہ ہی حافظ وغیرہ جیسا کوئی لفظ موجود ہے، جس سے قرآن سنانے کا مفہوم مترشح ہو؛ بلکہ مطلق امامت تراویح کا سوال کیا گیا؛ لیکن حضرت مفتی اعظمؒ نے اپنے زمانے کے عرف کو جواب میں ملحوظ رکھا اور یہ جملہ "اس سے مقصود امامت نہیں؛ بلکہ قرآن شریف کا ختم ہے" تحریر فرمایا، اسی طرح احقر نے اپنے زمانے کے عرف کے پیشِ نظر اپنے فتویٰ ۴/ د مجریہ ۴/۱/۳۲ھ میں یہ جملہ "امامت تراویح سے مقصود قرآن سنانا ہی ہوتا ہے" بڑھایا، جو واقعۃً نفس الامر کے مطابق ہے۔ (جو شروع میں مذکور ہو چکا)

نوٹ: دوسرا فتویٰ ۲۷۱/ ۱۱۵/ د مجریہ ۳۲/۲/۲۵ھ جو پہلے گذر چکا اب اس کے شواہد پیش کئے جاتے ہیں، چوں کہ نفس مضمون دونوں فتووں کا قریب قریب ایک ہی ہے؛ اس لیے بعض شواہد کا تکرار ہو گیا ہے، ان شواہد کے پیش کرنے کا مقصد، یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ دونوں فتوے افادۂ حکم میں اکابر کے نہج اور طرز پر ہیں۔

زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۶/۳۲ھ

فتویٰ: ۲۷۱/ ۱۱۵/ د مجریہ ۳۲/۲/۲۵ھ میں بھی بنیادی طور پر تین باتیں کہی گئی ہیں:

(۱) "صرف نماز تراویح کی امامت کے لیے الگ سے مستقلاً تنخواہ طے کر کے لینا جائز نہیں۔"

(۲) تبعاً لینے کی گنجائش ہے، مثلاً: ماہانہ تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے اور تنخواہ کی تعیین میں "رمضان" کی اضافی خدمت کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۳) "امامت" اگر چہ ان امور دینیہ میں سے ہے، جن پر اجرت لینے کو متأخرین فقہاء نے جائز لکھا ہے؛ لیکن اس "امامت" سے اکابر مفتیان کرام، خصوصاً حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، اور حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ کے نزدیک ہر طرح کی امامت (خواہ مستقلاً تراویح کی امامت ہو یا عیدین و جنازے کی امامت ہو) مراد نہیں؛ بلکہ نماز پنج وقتہ کی امامت مراد ہے۔

نوٹ: ثانی الذکر بات پر تو کوئی اختلاف نہیں؛ اس لیے اس کی دلیل ذکر کرنے کی ضرورت

نہیں، اول الذکر مسئلہ ایک دعویٰ ہے، جس کا ثبوت آخری بات کے اثبات پر موقوف ہے؛ اس لئے تیسری بات یعنی ''امامتِ تراویح'' کا فقہاء کی عبارتوں میں وارد لفظ ''امامت'' (جس پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے) میں داخل نہ ہونے کو حضرات اکابر مفتیان کرام کے فتاوی کی روشنی میں ثابت کیا جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں: یہاں بنیادی طور پر دو باتیں قابلِ ذکر ہیں:

(۱) امامت سے پنج وقتہ کی امامت مراد ہے۔

(۲) تراویح، عیدین اور جنازے کی امامت مراد نہیں۔

حضرت مفتی اعظم مفتی محمود حسن صاحبؒ نے ایک سوال کے جواب میں درج ذیل فتوی دیا:

اقتباس نمبر (۱)

سوال: مردے کی نماز پڑھا کر خیرات لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ''اصل یہ ہے کہ عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں؛ لیکن متاخرین نے بضرورت بعض عبادات کو مستثنیٰ کیا ہے، ان میں امامتِ نمازِ پنجوقتہ بھی ہے: **ویفتی الیوم بصحتها (أي الإجارة) علی تعلیم القرآن والفقه والإمامة والأذان** '' (درمختار: ۵/۴۶)، اور یہ خیرات بظاہر اجرت ہے اور امامت نماز جنازہ کو فقہاء نے مستثنیٰ نہیں کیا؛ لہٰذا محض اس امامت پر اجرت لینا جائز نہیں''۔

(فتاوی محمودیہ: ۱۷/۶۲)

نوٹ: یہاں پر حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے سامنے بھی لفظ ''امامت'' مطلق تھا، جس کا تقاضہ یہ تھا کہ امامتِ نمازِ جنازہ (جو امامت کا فرد ہے) اس (امامت) کے عموم میں داخل ہوتی اور اس پر اجرت لینا جائز ہوتا؛ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کی باریک بین نظر نے پتہ لگالیا کہ یہاں ''مستثنیات میں'' لفظ ''امامت'' سے مراد صرف پنج وقتہ کی امامت ہے، ہر طرح کی امامت مراد نہیں اور اپنے الفاظ (ان میں یعنی مستثنیٰ کردہ چیزوں میں امامت نماز پنج وقتہ بھی ہے) سے لفظ ''امامت'' کی مراد متعین کردی، یعنی جس طرح بعض دیگر طاعات مثلاً: تعلیم قرآن وفقہ اور اذان پر اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح پنج وقتہ نماز کی امامت پر بھی اجرت لینا جائز ہے؛ لیکن تراویح، نماز جنازہ اور عیدین کی امامت پر اصالۃً تنخواہ لینا جائز نہیں، ورنہ حضرت مفتی صاحبؒ کا لفظ ''پنج وقتہ'' تو فضول

ہو جائے گا۔

اقتباس نمبر (۲)

سوال: بعض علاقے میں یہ دستور ہے کہ عید کے روز خصوصیت سے عید ہی کی نماز پڑھانے کے لیے ایک امام مقرر کیا جاتا ہے؛ بلکہ بعض ائمہ اپنی اجرت متعین کر لیتے ہیں کہ مثلاً: بیس روپے دو گے تو عید کی نماز پڑھاؤں گا اور بعض ائمہ اپنی اجرت تو مقرر نہیں کرتے، مگر بعض مقتدی حسب وسعت امام کی خدمت میں کچھ نذرانہ پیش کرتے ہیں، اگر مقتدی روپیہ نہیں دیتے تو امام ناراض ہو جاتے ہیں الخ۔

جواب: اس طرح امامت پر اجرت لینا ناجائز ہے الخ (۱۷/۵۲)

نوٹ: اگر متأخرین فقہاء کی استثناء کردہ چیزوں میں لفظ ''امامت'' اپنے اطلاق پر ہوتا، تو یہاں حضرت مفتی صاحبؒ نماز عید کی امامت پر اجرت متعین کرنے یا بہ طور نذرانہ لینے کو ناجائز نہ قرار دیتے

دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے فتاوی کے اقتباسات جن سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''امامت'' اپنے اطلاق پر نہیں ہے اور اس میں تراویح، جنازہ اور عیدین کی امامت بالکل شامل نہیں ہے۔

اقتباس نمبر (۱)

ملاحظہ ہو!

(۳) سوال: وعظ، قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اسے صدقہ کا نام دینا، جواز کے حیلے کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جائز قرار دینے والوں اور جواز کا عقیدہ رکھنے والوں پر فسق کا حکم لگے گا یا نہیں؟ اور ان کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

جواب: وعظ پر اجرت لینے کو متأخرین حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے جیسا کہ ''رد المحتار'' میں ہے: **وزاد بعضهم الخ** اور اس کے علاوہ قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح کی نماز پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، اور مشہور قاعدہ ''**المعروف كالمشروط**'' کے اعتبار سے مذکورہ اجرت کو صدقہ کا نام دینا مفید حلت نہیں ہے، اور اسے جائز قرار دینے والے اور حرام امور کو رائج کرنے والے بدعتی اور گنہ گار ہیں، اقتداء کے لائق نہیں ہیں اور فسق کے نام کے زیادہ حقدار ہیں۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۵/۳۰۸)

نوٹ: یہاں پر حضرت مفتی اعظمؒ کی عبارت اپنے موضوع (یعنی امامت کا اپنے اطلاق پر نہ

ہونے اور تراویح، عیدین اور جنازہ پر اجرت ومعاوضہ لینے کے ناجائز ہونے) میں بالکل واضح ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے لفظ ''تراویح'' کو بڑھا کر یہ بھی واضح کر دیا کہ ''امامت''۔جس پر اجرت لینا جائز ہے ــــــ میں تراویح کی امامت داخل نہیں ہے، اب جب کہ مفتیٔ اعظمؒ کی صراحت کے مطابق عیدین، جنازہ اور تراویح کی امامت فقہائے متاخرین کے استثناء کردہ امور سے خارج ہوگئی تو اس ''امامت'' میں پنج وقتہ کی امامت کے علاوہ کوئی بھی امامت داخل نہ رہی؛ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ امامتِ پنج وقتہ کے علاوہ کسی بھی امامت خواہ تراویح ہو یا عیدین ہو یا جنازہ پر مستقلاً طے کر کے اجرت لینا جائز نہیں رہا۔

اقتباس نمبر (۲)

(۴) سوال: مسجد کا امام اجرت تو نہیں لیتا؛ مگر جنازے کی نماز اور نکاح بغیر اجرت کے نہیں پڑھاتا، یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: امامت پر اجرت لینا درست ہے، لیکن خاص جنازہ کی نماز بلا اجرت لیے نہ پڑھانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ بہ موجب حکم صلّوا علی کلّ برّ و فاجر الحدیث نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، اس پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۵/۳۱۴)

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی اعظم کا تیسرا فتوی:

اقتباس نمبر (۳)

(۵) سوال: صلاۃ جنازہ با جرت خواندہ شود آیا صلاۃ جنازہ ادا شود یا نہ؟ از مصلیان فرض کفایہ ساقط شود یا نہ؟

الجواب: صلاۃ جنازہ ادا شود، فرضیت ساقط شود؛ لیکن اخذ اجرت بر آں حرام ومعصیت است در حق آخذ، وآنچہ معروف است نیز بحکم مشروط شدہ حرام خواہد شد۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۵/۳۶۵)

نوٹ: یہاں خط کشیدہ جملہ قابلِ لحاظ ہے، اگر امامت سے ہر طرح کی امامت مراد ہوتی تو نماز جنازہ کی امامت پر اجرت لینا ناجائز کیوں ہوتا؟

اقتباس نمبر (۴)

(۶) سوال: ایک شخص نے عمر بھر نماز، روزہ نہیں کیا، بعد مرنے کے ایک عالم نے مشکل سے

پانچ روپے فدیہ کے لے کر نماز جنازہ پڑھائی، ایسا فدیہ لینا شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس مسلمان بے نمازی کے جنازہ کی نماز پڑھنا فرض تھا، **لقوله عليه الصلاة والسلام : صلوا على كل برو فاجر الحديث** اور معاوضہ لینا اور فدیہ لینا نماز جنازہ کا حرام ہے یہ لینے والے کی جہالت ہے اور طمع دنیاوی نے اس کو اندھا کر دیا ہے کہ جنازہ مسلمان کی نماز پڑھنے پر اجرت لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمادے۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۳۲۰/۵)

خط کشیدہ کلمات سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ نماز جنازہ کی امامت پر اجرت لینا بالکل جائز نہیں اور ''امامت'' پر جو اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے وہ ''امامت'' اپنے عموم پر نہیں، پنج وقتہ نماز کی امامت مراد ہے۔ ے

سابق مفتیٔ اعظم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ کے فتاوی کے کل چھ اقتباسات سے یہ بات منقح ہوگئی کہ فقہائے متاخرین کی عبارت میں جو لفظ ''امامت'' آیا ہے وہ اپنے عموم پر نہیں؛ بلکہ اس سے پنج وقتہ نماز کی امامت مراد ہے، تراویح، عیدین اور جنازہ کی ممانعت اپنی اصل پر ہے، یعنی ان میں سے کسی پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اب ذیل میں اکابر ارباب افتاء کے فتاوی کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں، جن سے خصوصی طور پر تراویح کے لیے الگ سے مستقلاً اجرت لینے کا عدمِ جواز ثابت ہوتا ہے۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا فتوی، جس میں انہوں نے واقعۃً یہ کہا کہ تراویح مستثنیات میں شامل نہیں، حضرت کا جواب ملاحظہ ہو!

اقتباس نمبر (۱): وعظ پر اجرت لینے کو متأخرین حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ رد المحتار میں ہے: **وزاد بعضهم الخ**. اس کے علاوہ قرآن خوانی، نماز جنازہ، عیدین اور تراویح کی نماز پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، اور مشہور قاعدہ **المعروف كالمشروط** کے اعتبار سے مذکورہ اجرت کو صدقہ کا نام دینا مفید حلت نہیں ہے۔ (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۳۰۸/۱۵)

نوٹ: یہ عبارت اپنے موضوع میں بالکل واضح ہے، کسی طرح کی معقول تاویل اس عبارت میں نہیں چل سکتی، یہاں کوئی یہ بے معنی تاویل نہیں کرسکتا کہ ''تراویح'' سے مراد ''ختم قرآن'' ہے، اس کی چند وجوہات ہیں:

(۱): نہ سوال میں کہیں ختم قرآن کا ذکر ہے اور نہ جواب میں۔

(۲) تراویح پر اجرت کا عدمِ جواز ختم قرآن کی بنا پر ہو، تو عیدین اور نماز جنازہ کی امامت پر عدمِ جواز کی کیا وجہ ہے؟ اس میں تو ختم قرآن نہیں ہوتا۔

(۳) قرآن پڑھنے پر اجرت کے عدم جواز کا ذکر تو حضرتؒ نے پہلے کر ہی دیا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ایک سائل نے امامت تراویح کو نماز پنج گانہ کی امامت پر قیاس کر کے حافظ کے لیے اس (امامت تراویح) پر اجرت لینے کے جواز کی بات پوچھی، لیکن حضرت علامہ تھانویؒ نے اس کی اجازت نہ دی۔ ملاحظہ ہو!

اقتباس نمبر (۲): سوال: ہمارے محلّہ میں کوئی حافظ قرآن نہیں اور ختم قرآن تراویح میں سننا بھی سنت ہے، ایسی حالت میں ہم کوئی دوسرے ملکی حافظ کو ''ختم قرآن فی التراویح'' کے لیے بالاجرت یا بلا اجرت رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر بلا اجرت مقررہ رکھیں، تب بھی دونوں طرف سے جانتے ہیں کہ کم سے کم اتنے روپے لینا دینا ہیں، مولانا رشید احمد صاحبؒ مرحوم اپنے فتویٰ میں ناجائز کہتے ہیں، مگر ہم کو یہ خدشہ پڑ گیا کہ جس سنت کے ترک پر حاکم کو تشدد کرنا ہوتا ہے اس کے لیے کیوں مثل امامت پنج گانہ کے امام **بالأجرة سواء كان معروفا أو مشروطا** نہیں رکھ سکتے —— (خط کشیدہ الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں)

جواب: یہ سنت کون سی ہے، تراویح یا ختم قرآن، اگر تراویح ہے تو بدونِ اجرت کے قائم ہوسکتی ہے، اگر ختم قرآن ہے تو اس پر تشدد کس نے لکھا ہے؟ (امداد الفتاوی: ۳/۳۹۲)

نوٹ: حضرت اقدس علامہ تھانویؒ کے جواب سے دو باتیں مستفاد ہوئیں (۱) تراویح کی امامت کو نماز پنج گانہ کی امامت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ اگر دونوں یعنی پنج گانہ اور تراویح کی امامت کا حکم، اجرت لینے میں یکساں ہوتا تو پھر حضرت تھانویؒ نے حافظ کے لیے تراویح کی امامت کی اجرت کو کیوں جائز قرار نہیں دیا؟

(۲) حضرت اقدس کے الفاظ ''اگر تراویح ہے تو بدونِ اجرت قائم ہوسکتی ہے'' سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ تراویح کی امامت۔ خواہ امام مکمل قرآن کریم پڑھے یا قرآن کا کچھ حصہ یا ''الم ترکیف'' سے پڑھائے —— پر اجرت لینے کی گنجائش نہیں۔

اقتباس نمبر (۳): حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ فتاوی رحیمیہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں: یہ اشکال نہ ہونا چاہیے کہ مسجد کا مقرر امام بھی امام ہے اور تراویح کے لیے جو حافظ مقرر کیا گیا ہے وہ بھی امام تراویح ہے، تو مقرر امام کی تنخواہ کیوں جائز اور امام تراویح کی اجرت کس بنا پر ناجائز؟ اصل مذہب یہ ہے کہ طاعات پر اجرت لینا دینا جائز نہیں، مگر فقہاء نے بقاء دین کو ملحوظ رکھ کر تعلیم قرآن، امامت، اذان وغیرہ چند چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے اور ان پر اجرت لینے دینے کے جواز کا فتوی دیا ہے، تراویح مستثنیٰ چیزوں میں شامل نہیں؛ اس لیے اصل مذہب کی بنیاد پر تراویح پر اجرت لینا دینا، ناجائز ہی رہے گا، نیز تراویح کی ادائیگی ختم قرآن پر موقوف نہیں الم ترکیف سے بھی پڑھی جاسکتی ہے اس لیے اس میں ضیاعِ دین بھی نہیں؛ لہٰذا تراویح کی قرأت مثل تلاوت مجردہ ہے؛ جس پر اجرت لینا ناجائز ہے (فتاوی رحیمیہ:۶/۲۶۵)۔ ''تراویح مستثنیٰ چیزوں میں شامل نہیں''، خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

فقہائے متاخرین کی عبارت میں ذکر کردہ لفظ ''امامت'' ــــــ یعنی جس پر اجرت لینا جائز ہے کی وضاحت کے لیے کافی ہے ــــــ یعنی اس امامت میں امامتِ تراویح داخل نہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوا کہ فتوی ۴/ دمجریہ ۳۲/۱/۴ھ اور ۱۱۵/۲/۱۷، افادہ حکم شرعی میں اکابر مفتیان عظام کے فتاوی کے عین مطابق ہے اور اسی نہج اور طرز پر ہے جو اکابر دارالعلوم دیوبند نے اپنے فتاوی میں اختیار فرمایا ہے۔ یعنی تراویح کی امامت کی تنخواہ مستقلاً طے کر کے لینا درست نہیں، فرائضِ خمسہ کے تابع کر کے لینے کی گنجائش ہے۔ چوں کہ یہ مفصل تحریر ''دارالافتاء'' کے سابقہ دو فتوؤں: ۴/ دمجریہ: ۳۲/۱/۴ھ اور فتویٰ ۱۱۵/۲/۱۷ مجریہ: ۳۲/۲/۲۵ھ سے متعلق ہے؛ اس لیے ''دیگر مفتیان دارالافتاء دارالعلوم دیوبند'' کے دستخط کرائے جاتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ احکم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/ ۶/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ،

الجواب صحیح: والمجیب مصیب: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ،

الجواب صحیح: سعید احمد عفی عنہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند ۲۲/ رجب ۳۲ھ،

الجواب صحیح: ریاست علی بجنوری غفرلہٗ خادم التدریس دارالعلوم دیوبند ۲۴/ رجب ۳۲ھ۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ: چونکہ اس فتویٰ پر حضرات مفتیان کرام دار الافتاء کے ساتھ موقر اساتذہ کرام کے بھی دستخط ثبت ہو چکے ہیں؛ لہٰذا اہتمام کو اس پر اطمینان ہے۔دار الافتاء کی طرف سے اندراج کی کاروائی مکمل کر کے مہر لگادی جائے۔ابوالقاسم نعمانی غفرلہ۔کارگذار مہتمم دار العلوم دیوبند ۲۴/۷/۳۲ھ

شبِ برات کے مستحب اعمال

(احادیث کی روشنی میں)

محترم حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم

سوال: ﴿۴۳﴾ مجھے آپ سے ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، شعبان کے مہینہ کی ۱۴ر تاریخ کی رات کو جاگنا اور اگلے دن روزہ رکھنا، یہ کس حدیث سے ثابت ہے اور کیا قرآن سے بھی ثابت ہے؟ آپ اس بارے میں تفصیل سے بتائیں اور جو بتائیں وہ حدیث سے اور قرآن سے ثابت ہونی چاہیے اور حدیث کا نام اور نمبر بھی بتائیں آپ کا بڑا احسان ہوگا۔محمد تبریز دیوبند (۱۳۴۹/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

شعبان کی پندرہویں شب اور آنے والے دن کے بعض فضائل قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، جس قدر فضائل احادیث سے ثابت ہیں انہیں ماننا چاہیے؛ مثلاً اللہ کی طرف سے منادی ہونا، بندوں کی مغفرت وبخشش ہونا، روزہ کا مستحب ہونا(۱)، آں حضرت ﷺ کا اس شب میں بقیع قبرستان تشریف لے جانا اور مردوں کے لیے دعاءِ مغفرت کرنا حدیث سے ثابت ہے(۲)،اس لیے

(۱) إذا كانت ليلة النصف من شعبان، فقوموا ليلها وصوموا نهارها؛ فإن الله تعالىٰ ينزل فيها لغروب الشمس إلى السماء الدنيا، فيقول: ألا مستغفر، فاغفرله الخ (ابن ماجه: رقم: ۱۳۸۸، باب ما جاء في ليلة النصف).

(۲) عن عائشة: فقدت رسول الله ـ صلّى الله عليه وسلّم ـ ذات ليلة، فخرجت أطلبه فإذا هو بالبقيع رفع رأسه إلى السماء وفيه "إن الله تعالىٰ يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِأَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ" (ابن ماجه: رقم: ۱۳۸۹، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان)

کبھی کبھار اس رات میں قبرستان چلا جانا مستحب ہوا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے سورہ دخان میں لیلۃ مبارکۃ کی بعض خصوصیات بیان فرمائی ہیں، بعض مفسرین (صحابہ کرام وتابعین) نے اس رات کا مصداق شب برأت (۱۵شعبان کی رات) کو قرار دیا ہے(۱)۔

جس قدر فضیلت احادیث وقرآن سے ثابت ہے اس کو ماننا چاہیے جن سے رات میں جاگنا، توبہ واستغفار کرنا، دن میں روزہ رکھنا، اعمال کا مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن ان چیزوں کو فرض وواجب سمجھنا، قبرستان جانے کو ضروری سمجھنا، اس کے لیے چراغاں کرنا، مسجد میں لوگوں کو اکٹھا کر کے عبادت کا اہتمام کرنا، پٹاخا بجانا، حلوا پکانا، یہ امور شریعت سے ثابت نہیں ہیں، ان سے احتراز کرنا واجب ہے۔ تفصیل کے لیے اصلاحی خطبات (۲) میں ''شبِ برأت'' نامی رسالہ کا مطالعہ کریں۔

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/ ۸/ ۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

جواب صحیح ہے، مزید دو باتیں عرض ہیں:

پہلی بات: لیلہ مبارکہ کا مصداق اصح قول کے مطابق ''شبِ قدر'' ہے، آلوسی رحمہ اللہ نے یہی تفسیر کی ہے: **في ليلة مباركة: في ليلة القدر على ما روى عن ابن عباس، وقتادة، وابن جبير، و مجاهد، وابن زيد، والحسن، وعليه اكثر المفسرين**، پھر عکرمہ اور ایک جماعت کا قول لکھا ہے کہ لیلہ مبارکہ سے شعبان کی پندرہویں رات مراد ہے، **فعلى المفتي أن يَّتَّبِعَ بأصح ما هنالك**، پس صحیح قول کے مطابق شب براءت کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔

دوسری بات: شعبان کی پندرہویں رات کے اعمال اور اگلے دن کا روزہ: انفرادی اعمال ہیں، اگر ان کو اجتماعی بنایا جائے گا تو وہ بدعت ہو جائیں گے، جیسا کہ فتوی میں بھی اس کی صراحت ہے، اور بخاری شریف میں یہ روایت ہے کہ لوگ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے، حضرت عروہ

---

(۱) قال العلامة الآلوسي في الروح تحت قوله تعالى''في ليلة مباركة :قال عكرمة وجماعة: هي ليلة النصف من شعبان (۱۳/ ۱۱۰، ط:ملتان).

(۲) مؤلفہ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم۔

رحمہ اللہ نے اس نماز کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا: بدعت ہے! حالانکہ اس نماز کا احادیث سے ثبوت ہے، بخاری شریف کے حاشیہ میں اس کا یہ جواب دیا ہے کہ چاشت کی نماز انفرادی عمل ہے، لوگوں نے اس کو اجتماعی عمل بنایا دیا تھا اس لیے حضرت ابن عمرؓ نے اس کو بدعت کہا (تحفۃ القاری: ۴/۴۸۶) اور آج کل عام طور پر لوگوں نے شب براءت کے اعمال کو بھی اجتماعی عمل بنا دیا ہے، اس لیے ان سے احتراز کرنا ضروری ہے، لوگ گھروں میں اپنے طور پر ضرور نوافل پڑھیں، اپنے لیے اور مردوں کے لیے استغفار کریں اور اگلے دن کا روزہ بھی رکھیں، یہ مستحب ہے مگر مسجدوں میں اور قبرستان میں اکٹھا ہو کر نہ کریں، یہ بدعت ہے۔

حررہ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

روزہ، حج اور قربانی سے متعلق بعض مسائل

بھول کر کھانے پینے یا جماع کرنے کے بعد اگر مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود قصداً روزہ توڑ دیا تو اس کا حکم
(بہشتی زیور کی ایک عبارت کی وضاحت)

مکرم جناب مفتی صاحب!........................ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۴۴﴾ بعد آداب عرض ہے کہ عافیت خواہ بعافیت ہے امید ہے کہ آں جناب بھی بخیریت وعافیت ہوں گے، باعثِ تحریر یہ ہے کہ بندہ بہشتی زیور دیکھ رہا تھا اس کے حصہ ۱۱/۱۰۴ میں مسئلے ۵/ پر نظر پڑی جو باب الصوم سے متعلق تھا، بندہ کو اس مسئلے میں کچھ خلجان ہے؛ لہٰذا اس مسئلہ/ ۵ کو بندہ آپ کے پاس تحریراً ارسال کر رہا ہے؛ تاکہ اطمینان ہو جائے اور وہ مسئلہ یہ ہے:

کسی شخص نے بسبب اس کے کہ اس کو روزے کا خیال نہ رہا، کچھ کھا پی لیا یا جماع کر لیا اور یہ سمجھا کہ میرا روزہ جاتا رہا، اس خیال سے قصداً کچھ کھا پی لیا تو اس کا روزہ اس صورت میں فاسد ہو جائے گا اور کفارہ لازم نہ ہوگا، صرف قضا واجب ہے، اور اگر مسئلہ جانتا ہو اور پھر بھول کر ایسا کرنے کے بعد عمداً افطار کر دے تو جماع کی صورت میں کفارہ بھی لازم ہوگا اور کھانے کی صورت میں اس وقت بھی صرف قضا ہی ہے۔ (اختری بہشتی زیور: مسئلہ: ۵، ص: ۱۰۴) حالاں کہ بہشتی زیور کے حاشیے میں شامی کی جس عبارت کو حوالہ میں نقل کیا ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کھانے، پینے اور جماع ہر ایک کا حکم ایک ہی ہے، وہ یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں ہوگا، خواہ مسئلہ معلوم ہو یا نہ ہو؛ کیوں کہ عدم وجوب کفارہ کی علت میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے اور وہ اختلاف تینوں یعنی کھانے پینے اور جماع ہر ایک میں ہے اور شامی کی عبارت یہ ہے: **إلا في مسئلة المتن وهي مالو أكل وكذا لو جامع أو شرب؟ لأن علة عدم الكفارة خلاف مالك وخلافه في الأكل والشرب**

والجماع كما في الزيلعي. شامي: ۳/ ۳۷۵، قبل مطلب جواز الإفطار بالتحري.

لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ بہشتی زیور میں نقل مسئلہ میں تسامح ہوا ہے یا بندہ کی سمجھ کا قصور ہے؟ تشفی بخش جواب سے نوازیں۔

نوٹ: بہشتی زیور کے نسخے میں عبارت مختلف نقل کی گئی ہے؛ یعنی کسی نسخے میں درمختار اور شامی دونوں کی عبارت ہے اور کسی میں صرف درمختار کی عبارت ہے۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے، وہ کتب خانہ اختری متصل مظاہر علوم سہارنپور کا مطبوعہ ہے۔ فقط والسلام

محمد شاہد عفی عنہ ۱۲/ ۱۰/ ۲۸ھ (۱۲۶۵/ د ۱۴۲۹ھ)

محترمی ومکرمی...

درمختار کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

(أو أكل) أو جامع (ناسياً)............ (فظن أنه أفطر فأكل عمداً) للشبهة ولو علم عدم فطره لزمته الكفارة إلا في مسئلة المتن فلا كفارة مطلقاً على المذهب لشبهة خلاف مالك. (الدر مع الرد: ۳/ ۳۳۵، دار الکتاب)

ترجمہ: کچھ کھا پی لیا یا جماع کر لیا بھول کر یا احتلام ہو گیا یا کسی کو دیکھنے کی وجہ سے انزال ہو گیا یا اسے قے آ گئی پھر تو وہ یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا.............. قصداً (کچھ) کھا لیا (تو ان تمام صورتوں میں اس پر صرف قضا ہوگی، کفارہ نہ ہوگا۔ یہ اس وقت ہے جب کہ مسئلہ سے واقفیت نہ ہو) اور اگر (بھول کر ایسا کرنے سے) روزے کے نہ ٹوٹنے کو جانتا ہو تو پھر (تنویر الابصار کے) متن کے مسئلہ (یعنی بھول کر کھانے) کے علاوہ تمام صورتوں میں (چاہے جماع ہو یا دوسری صورتیں) کفارہ بھی لازم ہوگا، (رہا متن کا مسئلہ) تو اس میں کفارہ نہ ہوگا، مطلقاً چاہے مسئلہ پہلے سے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، ظاہری مذہب (یعنی ظاہری روایت) کے مطابق الخ۔

درمختار کی اس عبارت کا خلاصہ وہی ہے جو بہشتی زیور میں مذکور ہے؛ یعنی ''اور اگر مسئلہ جانتا ہو اور پھر بھول کر ایسا کرنے کے بعد عمداً افطار کر دے تو جماع کی صورت میں کفارہ بھی لازم ہوگا اور کھانے کی صورت میں اس وقت بھی صرف قضا ہی ہوگی'' رہ گیا اس مسئلہ پر علامہ شامی کی عبارت والا حاشیہ تو وہ صاحبِ بہشتی زیور کا مرقوم نہیں ہے بلکہ بعد میں دوسروں نے اس پر حاشیہ چڑھایا ہے، بہشتی زیور اختری کا حاشیہ علامہ شامی کی تحقیق پر مبنی ہے، اور دوسرے نسخوں کا حاشیہ جس میں صرف درمختار کی عبارت پر اکتفاء کیا گیا ہے وہ ظاہری مسئلہ پر مبنی ہے: خلاصہ یہ کہ بہشتی زیور میں نقل مسئلہ میں تسامح نہیں ہوا بلکہ حضرت نے درمختار کے مسئلہ کو ذکر کیا ہے، اب یہ اور بات ہے کہ درمختار کی تحقیق صحیح ہے یا شامی کی؟ اس کے لیے آپ بڑے مفتیان کرام سے رجوع فرمائیں، وہ لوگ آپ کو صحیح مسئلہ سے آگاہ کریں گے۔ (محمد امین پالن پوری ۹/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت مولانا تھانویؒ سے نقل مسئلہ میں تسامح نہیں ہوا؛ بلکہ انھوں نے مسئلہ کے نقل کرنے میں صاحبِ درمختار کی پیروی کی ہے، شامی کی تحقیق سے اعتناء نہیں کیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کس کی تحقیق صحیح اور راجح ہے، صاحب درمختار کی یا علامہ شامی کی؟ ہم نے جب اس مسئلے پر غور کیا تو علامہ شامی کی تحقیق تین وجہوں سے صحیح اور راجح معلوم ہوئی اور یہ وجوہات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) روزے کے باب میں ''اکل وشرب وجماع'' تینوں کو ایک درجہ دیا گیا ہے، چنانچہ ''مجمع الأنھر'' میں ہے:

ولو أكل أوشرب أوجامع ناسياً لا يفطر استحسانا لقوله عليه الصلاة والسلام: للذي أكل أوشرب ناسياً " تِمَّ على صومك فإنما أطعمك الله وسقاك''والجماع في معنى الأكل أيضاً بدلالته. (مجمع الأنهر ط:دار الكتب العلمية: بيروت:۱/۳۵۹)

مذکورہ عبارت سے صاف واضح ہے کہ تینوں کا حکم یکساں ہے۔ نیز بدائع میں ہے:

قال في البدائع: وإنا نقول: نعم: الحديث ورد في الأكل والشّرب؛ لكنه معلول بمعنى يوجد في الكل: (الأكل والشرب والجماع) وهو أنه فعل مضاف إلى اللّٰه تعالىٰ عن طريق التّمحيض بقوله ''فإنما أطعمه الله وسقاه'' قطع إضافته عن العبد بمعنى يوجد في الكل، والعلة إذا كان منصوصاً عليها كان الحكم منصوصاً عليه، ويتعمم الحكم بتعمم العلة، وكذا معنى الحرج يوجد في الكل'' (البدائع ط: زكريا ديوبند: ۲/۲۳۷).

یہ عبارت بھی اس بابت واضح اور بے غبار ہے کہ ''اکل، شرب، جماع'' تینوں کا درجہ ایک ہے اور حکم یکساں ہے؛ پس حکم کی یہ یکسانیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اگر ''اکل'' کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا تو شرب وجماع کی صورت میں بھی کفارہ واجب نہ ہو، **لعدم القائل**

بالتفريق بين الثلاثة.

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ صاحبِ درمختار نے ''اکل'' کی صورت میں کفارہ کے ساقط ہونے کی جو دلیل بیان کی ہے وہ ''شبہ خلاف مالک'' ہے اور امام مالک کا اختلاف صرف ''اکل'' ہی میں نہیں بلکہ تینوں صورتوں میں ہے؛ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

قال الشّامي: قوله " إلا في مسئلة المتن" وهي مالو أكل، وكذا لو جامع أو شرب؛ لأن علة عدم الكفارة خلاف مالك، وخلافه في الأكل والشرب والجماع كما في الزيلعي والهداية وغيرهما (الشامي: ط زكريا ديوبند: ۳/۳۷۵).

پس تینوں صورتوں میں علت کا اشتراک حکم میں مساوات کا متقاضی ہے۔

(۳) تیسری وجہ شامی کی تحقیق کے راجح ہونے کی یہ ہے کہ صاحبِ درمختار کے علاوہ کسی اور نے ''اکل'' اور ''شرب وجماع'' کے درمیان تفریق نہیں کی ہے؛ بلکہ سب نے علامہ شامی کی طرح تینوں کا ایک حکم لکھا ہے اور وہ ہے کفارہ کا عدم وجوب، چنانچہ **''مجمع الانهر''** میں ہے:

(وأكل ناسيًا فظنّ أنّه أفطر فأكل عمدًا) فإن كان بلغه الحديث وهو قوله عليه الصّلاة والسّلام: ''من نسي وهو صائم فأكل أو شرب فليتم صومه فإنما أطعمه الله وسقاه'' وعلم أن صومه لا يفسد في النسيان، روي عن الإمام أنه لا كفارة عليه وهو الصحيح. (مجمع الأنهر، ط: بيروت: ۱/۳۵۸).

اس عبارت میں اکل اور شرب کا ذکر تو صراحتاً آ گیا (ایک مصنف کی عبارت میں اور دوسرے کا حدیث میں) کہ ان دونوں صورتوں میں کفارہ ساقط ہو جاتا ہے اور دلالۃً ''جماع'' کا ذکر بھی آ گیا اس لیے اگلے صفحے پر مصنف نے لکھا ہے کہ ''جماع'' ''اکل'' کے معنی میں ہے؛ پس جب ''اکل'' کا تذکرہ آیا تو ''جماع'' کا بھی ضمناً و دلالۃً آ گیا۔ ملاحظہ ہو سب سے پہلی والی عبارت جو **''مجمع الأنهر''** کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے۔

نیز صاحبِ بحر ''کنز'' کے متن: **''وقضي ولم يكفر كأكله عمدا بعد أكله ناسيا''** کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وإنما لم تجب الكفارة بإفطاره عمداً بعد أكله أوشربه أوجماعه ناسيًا؛ لأنه

ظن في موضع الاشتباه بالنظير وهو الأكل عمداً لأن الأكل مضاد للصوم ساهياً أو عامداً ، فأورث شبهة وكذا فيه شبهة اختلاف العلماء، فإن مالكاً يقول بفساد صوم من أكل ناسياً، وأطلقه فشمل ما إذا اعلم بأنه لا يفطره بأن بلغه الحديث أو الفتوى أولاً وهو قول أبي حنيفةؒ وهو الصّحيح.................... وكذا لو احتلم للتشابه في قضاء الشهوة وإن علم أن ذلك لا يفطره فعليه الكفارة؛ لأنه لم توجد شبهة الاشتباه ولا شبهة الاختلاف الخ (البحر ط:زكريا ديوبند:۲/۵۱۲).

اس عبارت میں دو باتیں غور کرنے کی ہیں:

(الف) صاحب کنز کے قول میں صرف اکل کا ذکر ہے، شرب اور جماع سے کوئی تعرض نہیں؛ لیکن صاحبِ بحر نے اپنی شرح میں اکل کے ساتھ ''شرب اور جماع'' کو بھی لاحق قرار دیا اور کفارہ کے ساقط ہونے کی دو دلیلیں ذکر کیں اور دونوں دلیلیں تینوں صورتوں کو شامل ہیں، پس جب دلیل میں اشتراک کی بنیاد پر صاحبِ بحر نے شرب وجماع کو جو کہ مسکوت عنہ ہیں ''اکل'' منطوق کے ساتھ لاحق کیا، تو اسی علت کے اشتراک کی بنیاد پر صاحب کنز کے قول ''**بعد اكله ناسيا**'' کے اطلاق میں (جس کی وضاحت صاحب بحر نے **واطلقه فشمل** سے کی ہے) میں بھی مسکوت عنہ منطوق کے حکم میں شامل ہوگا اور جس طرح اکل کی صورت میں مسئلہ جاننے کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا، شرب اور جماع میں بھی کفارہ واجب نہ ہوگا۔

(ب) اس کے بعد صاحب بحر نے دو مسئلے اور ذکر کیے ہیں، ان میں ایک مسئلہ قے کا ہے دوسرا احتلام کا، اور لکھا ہے کہ اگر کسی کو احتلام ہوجائے اور وہ مسئلہ سے واقف ہو کہ احتلام سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس کے بعد عمداً کھا پی لے تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا کفارہ دونوں واجب ہوگا، دلیل یہ بیان کی ہے ''**لأنــه توجد شبهة الاشتباه لا شبهة الاختلاف**'' پس معلوم ہوا کہ ''**شبهة خلاف**'' جہاں پایا جائے گا کفارہ ساقط ہوجائے گا اور تینوں مسئلوں میں شبہہ خلاف پایا جاتا ہے؛ لہٰذا تینوں جگہ کفارہ ساقط ہوجائے گا۔

خیر اوپر کی مذکورہ بالا عبارتوں میں قدرے اجمال وابہام تھا، نیچے ہم جو عبارتیں پیش کررہے ہیں، وہ بیان مدعیٰ میں بالکل واضح ہیں اور ان سے اوپر کی عبارتوں کا ابہام بھی دور ہوجائے گا........

إذا أكل أو شرب أو جامع ناسياً فظن أن ذلك فطره، فأكل بعدذلك متعمداً لا كفارة عليه، فإن كان بلغه الحديث وعلم أن صومه لا يفسد بالنسيان، عندهما أنه يلزمه الكفارة وعن أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ أنه لا يلزمه وهو الصحيح (خلاصة الفتاوى مع مجموعة الفتاوى:۱/ ۲۵۸).

ظاہر ہے کہ "**وعلم ان صومه لا يفسدبالنسيان**" تینوں صورتوں کو عام ہے اور تینوں صورتوں میں صاحبین وجوب کفارہ کے قائل ہیں اور امام صاحب عدم وجوب کے اور امام صاحب ہی کا مذہب صحیح اور مفتی بہ ہے، اور بعینہ یہی عبارت صاحبین کے اختلاف کو حذف کر کے ''ہندیہ'' میں نقل کی گئی ہے:

لوأكل أو شرب أوجامع ناسيًا وظن أن ذلك فطره فأكل متعمداً لا كفارة عليه وإن علم أن صومه لا يفسد بالنسيان عند أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ لا تلزمه هو الصّحيح هكذا في الخلاصة (الهندية :۱/۲۰۶).

اس عبارت میں تینوں کا حکم ایک ہی بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے کفارہ کا عدم وجوب اور اسی کو امام ابوحنیفہؒ کا قول قرار دیا اور وضاحت کردی کہ یہی صحیح اور مفتی بہ قول ہے۔

اور اس مسئلے کے بارے میں فقیہ قاضی خاں لکھتے ہیں:

إذا أكل أو شرب أو جامع ناسياً فظن أن ذلك فطره فأكل متعمداً لا كفارة عليه؛ لأن صومه فسد قياساً فصارذلك شبهة، فإن كان بلغه الحديث وعلم أن صومه لايفسد في النّسيان عن أبي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ أن عليه الكفارة، وروى الحسن عن أبي حنيفة رحمه الله تعالّى أنّه لا كفارة عليه وهو الصحيح.

(الخانية هامش الهندية :۱/ ۲۱۶).

ان عبارتوں سے بخوبی یہ واضح ہوگیا کہ ''اکل وشرب و جماع'' تینوں کا حکم ایک ہی ہے اور اس مسئلہ میں بھول کر کھانے، پینے یا جماع کرنے سے اور پھر قصداً افطار کر لینے سے۔خواہ مسئلہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔امام صاحب کے نزدیک صرف قضا واجب ہے، کفارہ نہیں اور پانچوں معتبر اور مستند کتابوں کی تصریح کے مطابق امام صاحب کا قول ہی صحیح اور مفتی بہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ تینوں وجہوں سے یہ واضح ہوگیا کہ علامہ شامی کی تحقیق صحیح ہے اور صاحبِ درمختار کے کلام سے ''اکل'' اور شرب وجماع'' کے درمیان جو تفریق مفہوم ہوتی ہے، وہ غیر صحیح ہے۔ہم نے مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ''فتاوی بزازیہ، بدائع الصنائع، تاتارخانیہ'' اور فتح القدیر کی بھی مراجعت کی ہے پہلی میں صرف اکل والی صورت کا ذکر کیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کرکے اس کی تصحیح کی ہے، شرب اور جماع والے مسئلے سے تعرض نہیں کیا ہے، بدائع میں بھی مسئلہ قدرے اختلاف کے ساتھ وہی مذکور ہے، جو بحر اور مجمع الانہر میں ہے؛ البتہ صاحبِ بدائع کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبین کی بات کو راجح سمجھتے ہیں؛ لیکن صراحتاً اس کی تصریح نہیں کی ہے، ''تاتارخانیہ'' کی مراجعت کی اور بسیار تلاش کے باوجود یہ مسئلہ اس میں نہ مل سکا، فتح القدیر بھی سرسری دیکھی، غالباً اس میں بھی یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے، پس صاحب درمختار کی تفریق تسامح سے خالی نہیں؛ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ بہشتی زیور میں جو مسئلہ مذکور ہے یعنی اکل کی صورت میں کفارہ کے عدم وجوب کا اور جماع کی صورت میں کفارے کے وجوب کا وہ مرجوح ہے صحیح نہیں ہے۔ **وهذا ما ظهر لفهمي القاصر فإن اهتديت إلى الصواب فمن الله وإن أخطأت فمن نفسي وما أبرّئ نفسي من الخطايا.**

كتبه الطالب محمد أجمل القاسمي

المتخصص في الفقه والإفتاء بالجامعة الإسلامية دار العلوم ديوبند

۱۸/۳/۱۴۲۹ھ ۲۷/۳/۲۰۰۸ء يوم الخميس.

الجواب صحیح: بندہ محمد حنیف غفرلہ ۸/۴/۱۴۲۹

باسمہ تعالیٰ: تصدیق کی جاتی ہے کہ عزیز گرامی مولوی محمد اجمل قاسمی صاحب سلمہ نے بہشتی زیور کے ایک مسئلہ صوم میں وجوب کفارہ سے متعلق جو توضیح پیش کی ہے اور کتابوں کی مراجعت کرکے عبارات فقہیہ کی روشنی میں نفس مسئلہ کی ترجیح وتحقیق ذکر کردی ہے وہ درست اور صحیح ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۵/۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ

فخر الاسلام عفی عنہ معین مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۷/۱۴۲۹ھ

حج کے بعض اہم مسائل

نیابت فی الرمی مبیت فی منی اور تقصیر وغیرہ

سوال: ﴿۴۵﴾ حج بیت اللہ ایک ایسی عبادت ہے، جو عام طور پر کسی مسلمان کو زندگی میں ایک مرتبہ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے، اور حج بیت اللہ کی ادائیگی شرعی احکام اور اسلامی آداب کی رعایت کے ساتھ ہونے پر سابقہ سارے گناہوں کی معافی کا مژدہ سنایا گیا ہے، حج کے عنوان پر جتنی کتابیں ہیں، ان سب کتابوں میں مرکزی حیثیت ''معلم الحجاج'' کو حاصل ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ حج ایک ایسا عمل ہے جس میں امیر، غریب، عالم، غیر عالم کا کوئی فرق نہیں رکھا گیا، ہر عمل میں سارے حجاج متحد ہیں۔

چند سالوں سے یہ بات دیکھنے میں آرہی ہے کہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور مکہ المکرّمہ میں حجاج کرام اعمال میں یکساں نظر نہیں آتے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مکہ المکرّمہ میں رسول اکرم ﷺ نے قصر والی نماز ادا فرمائی تھی، لہٰذا آں حضور ﷺ کی اتباع میں ہم بھی نماز قصر ادا کریں گے اور منی کے خیموں میں بھی نماز کے اوقات میں اسی طرح کی باتیں گشت کرتی رہتی ہیں کہ نماز قصر یا مکمل نماز، عرفات میں جمع بین الصلوتین یعنی ظہر اور عصر کی نماز ایک ہی وقت میں پڑھیں گے یا ظہر کے وقت ظہر اور عصر کے وقت عصر وغیرہ۔

ان اختلافات کے پیشِ نظر حج سے متعلق چند سوالات آں محترم کی خدمت میں ارسال کیے جارہے ہیں؛ تاکہ صحیح اور مستند جوابات کی روشنی میں ملک بھر میں حج کے سیمینار منعقد کر کے مسلمانوں میں پیش آرہے اختلاف کو ختم کرنے کی سعی اور کوشش کی جائے، امید کہ مسئلہ کی نزاکت اور حساسیت کے پیشِ نظر، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ:

(۱) مکۃ المکرّمہ، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں نماز قصر ادا کی جائے گی یا مکمل؟ وضاحت کے ساتھ جواب کی درخواست ہے۔

(۲) عرفات میں عرفہ کے دن جمع بین الصلوتین کی جائے گی یا ظہر کو ظہر کے وقت اور عصر کے وقت میں عصر کی نماز پڑھنا چاہیے؟

(۳) پہلے منیٰ وغیرہ اور مکہ کی بلدیہ الگ الگ تھی، ابھی دو چار سال سے دونوں کی بلدیہ ایک ہوگئی، اس سے مسائل پر کوئی اثر پڑے گا؟

(۴) ۸/ ذی الحجہ کو منیٰ میں تمام حجاج کرام کا قیام کرنا ضروری ہے، حکومت سعودیہ عرب نے منیٰ کے خیموں کو پھیلا کر مزدلفہ تک پہنچا دیا، کیا ان حضرات کی منیٰ میں قیام کی سنت ادا ہوگی یا نہیں جن کے خیمے مزدلفہ میں ہیں؟

(۵) جن کے خیمے مزدلفہ میں ہیں، ان حضرات کا عرفات سے واپسی پر اپنے خیمے میں رات کا قیام کرنا صحیح ہے یا نہیں؛ اس لیے کہ خیمہ مزدلفہ میں ہے؟

(۶) چونکہ ۱۲/ ذی الحجہ کی غروب آفتاب سے پہلے منیٰ کے حدود چھوڑ نا ضروری ہے، اس شخص کے لیے جو ۱۳ر ذی الحجہ کی رمی نہیں کرنا چاہتا، اس کے پیشِ نظر حکومت سعودیہ عرب نے ۱۲ر کی رمی زوال سے پہلے کرنے کی اجازت دی ہے، کیا ۱۲ر ذی الحجہ کو زوال سے پہلے رمی کرنا جائز ہے؟

(۷) قربانی خود سے کرنا ممکن نہیں، بنک الراجحی کی جانب سے ٹوکن فروخت کیے جاتے ہیں اور بنک الراجحی کی طرف سے قربانی ٹوکن خریدنے والے ہزاروں، بلکہ لاکھوں حجاج کرام کو صبح ۱۰ر تا ۱۱/ بجے دن کا وقت دیا جاتا ہے اور یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ لاکھوں جانور ایک گھنٹہ میں ذبح کردیے جائیں، کیا ٹوکن پر اعتماد کرنا صحیح ہے؟

(۸) رمی، حلق یا قصر اور قربانی میں ترتیب لازم ہے یا کچھ اس میں رعایت ہے؟

(۹) بال حلق تو افضل ہے، قصر کرنے میں لوگ سر کے کسی حصہ کے بال کٹوا کر احرام کھول لیتے ہیں، بالوں کے قصر کی مکمل وضاحت فرمائیں۔

(۱۰) رمی کرنے میں کیسا عذر نیابت کے لیے قابلِ قبول ہے؟ عام طور پر ایسا ہو رہا ہے کہ

نوجوان آدمی ہے اس کی بیوی، ماں، بہن، بیٹی یا اور کسی غیر معذور شخص کی طرف سے دوسرے محرم یا غیر محرم نوجوان کنکریاں مارتے ہیں، غیر معذور کی طرف سے رمی میں نیابت کرنا کیسا ہے؟

(۱۱) کوئی شخص بغیر احرام کے سیدھے عرفات پہنچ گیا اور عرفات میں احرام باندھتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے کیا حکم ہے؟ والسلام محمد یاسین سلمان (کنوینر)

انجمن ارشاد الحجاج

23/A/437 -13 نزد مسجد ابراہیمی قادر باغ (حیدر آباد) 008 500

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) اس مسئلے کی کل تین صورتیں ہیں: (۱) آفاقی نے مکۃ المکرّمۃ میں پندرہ یوم یا اس سے زائد قیام کی نیت کی تو مکۃ المکرّمۃ اس کے حق میں وطنِ اقامت ہوگا، وہ مکۃ المکرّمۃ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات سب میں نماز کا اتمام کرے گا۔ (۲) مکۃ المکرّمۃ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات سب میں قیام کی مجموعی مقدار پندرہ یوم سے کم ہے تو ان سب مقامات مقدسہ میں نماز کا قصر کرے گا۔ (۳) مکۃ المکرّمۃ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں آفاقی کے قیام کی مجموعی مقدار پندرہ یوم یا اس سے زائد ہے تو بھی آفاقی نماز کا قصر کرے گا بشرطیکہ ان مقامات میں سے کسی ایک مقام میں مستقل پندرہ یوم قیام کا ارادہ نہ ہو۔ (اگر مکہ میں مکمل پندرہ یوم قیام کا ارادہ ہوا تو وہ شخص مقیم ہوگا)

(۲) عرفات میں عرفہ کے دن جمع بین الصلوتین کی جائے گی؛ یعنی ظہر اور عصر دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت میں الگ الگ اقامتوں کے ساتھ ادا کیا جائے گا (۱-۲)

(۳) اس سے مسائل پر کوئی اثر نہیں پڑے گا؛ کیوں کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک مکہ معظّمہ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات سب ہی ایک دوسرے سے الگ اور مستقل میدان اور مشاعر مقدسہ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں، ان کے مستقل اور الگ الگ ہونے پر نصوصِ شرعیہ، احادیثِ نبویہ اور

---

(۱) فبعد الزوال قبل الظهر خطب الإمام خطبتين كالجمعة وعلم فيها المناسك وصلى بهم الظهر والعصر بأذان وإقامتين. (الدر مع الرد: ۳/۵۱۸).

(۲) میدانِ عرفات میں جمع بین الصلوتین اسی وقت صحیح ہے جب کہ دونوں نمازیں بادشاہ یا اس کے نائب کے پیچھے ادا کی جائیں اور مقتدی حالتِ احرام میں ہوں؛ لہذا جو لوگ اپنے خیموں میں علاحدہ نماز ادا کریں، انہیں دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں ادا کرنا چاہیے، ان کے لیے جمع بین الصلوتین جائز نہیں ہے۔ (زین الاسلام)

کتبِ فقہ کی واضح عبارات موجود ہیں۔

(۴) حدودِ منیٰ منصوص ہے، حضور ﷺ نے حدود کی تعیین فرمادی ہے، ان حدود کے دائرے میں کہیں بھی قیام کرے گا، قیامِ منیٰ کی سنت ادا ہوجائے گی، ان حدود سے باہر قیام کرنے سے سنت ادا نہیں ہوگی، اگر حجاج کی کثرت کی وجہ سے حدودِ منیٰ کے دائرے میں کہیں بھی جگہ نہ ملے تو قیامِ منیٰ اور مبیتِ منیٰ ترک کردینا بلا کراہت جائز ہے اس پر نہ کوئی گناہ ہوگا اور نہ ہی کوئی جرمانہ لازم ہوگا، ایسی مجبوری میں حدودِ منیٰ سے باہر رات گذارنے میں کوئی حرج نہیں؛ جیسا کہ حضور ﷺ نے بیرِ زمزم سے پانی پلانے والوں سے مبیتِ منیٰ ساقط فرمادیا ہے: **عن ابن عمر أن العباس بن عبد المطلب استأذن رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يبيت بمكة ليالي منىٰ من أجل سقايته فأذن له .** (مسلم شریف: ۱/۴۲۳)

(۵) عرفات سے واپسی پر اپنے خیمہ میں رات گزارنا صحیح ہے، بشرطیکہ خیمہ مزدلفہ میں ہو۔

(۶) گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کی رمی زوال سے پہلے کرنا جائز نہیں ہے زوال کے بعد کرنا واجب ہے؛ لہٰذا اگر زوال سے پہلے رمی کرے گا تو وقت کے اندر اندر اس کا اعادہ واجب ہے اگر اعادہ نہیں کیا تو ترکِ واجب کی وجہ سے دم دینا لازم ہوجائے گا۔ **وأما وقت الرمي في اليوم الثاني والثالث؛ فهو ما بعد الزوال إلى طلوع الشمس من الغد حتى لا يجوز الرمي فيهما قبل الزوال** (عالمگیری: ۱/۲۳۳)۔

(۷) ٹوکن پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، اس معاملہ میں حنفی مسلک کے لوگوں کو بہت زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ رمی، قربانی اور حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے اور ترتیب بدلنے سے عندالاحناف دم لازم ہوتا ہے؛ اس لیے حجاج کرام کو اپنی قربانی خود کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۸) رمی، قربانی اور حلق کے درمیان ترتیب قائم رکھنا واجب ہے؛ ترتیب اس طرح ہے کہ: اولاً یوم النحر میں جمرۂ عقبہ کی رمی کرے پھر قربانی کرے (اگر قربانی لازم ہے) اس کے بعد حلق یا قصر کرے؛ لہٰذا اگر رمی سے پہلے قربانی یا حلق کرے گا یا قربانی سے پہلے حلق کرے گا تو جرمانہ میں ایک دم دینا لازم ہوگا: **وإنّما يجب ترتيب الثّلاثة: الرمي، ثم الذبح، ثم الحلق.** (شامی: ۳/۵۸۸، زکریا دیوبند)۔

(۹) اگر کوئی حاجی حلق کے بجائے قصر کرنا چاہے تو قصر کے لیے کم از کم اتنے لمبے بال ہونا ضروری ہے کہ انگلی کے ایک پوروے کے برابر یا اس سے زائد کٹ جاتے ہوں، اگر سر کے بال اس سے کم ہوں تو قصر صحیح نہیں ہوگا، حلق واجب ہوگا، ورنہ دم دینا لازم ہوجائے گا۔ ہاں اگر سر کے بال اتنے لمبے ہیں کہ انگلی کے پوروے کے برابر یا اس سے زائد کتروایا جا سکتا ہے تو پورے سر کا قصر کرے اگر پورے سر کا قصر نہیں کیا تو کم از کم چوتھائی سر کا قصر تو واجب ہے ہی، اس سے کم جائز نہیں ہے؛ یعنی اس سے کم کر دیا تو واجب ادا نہ ہوگا۔ **وأما التقصير فالتقدير فيه بالأنملة لما روينا من حديث عمرؓ، لكن أصحابنا قالوا: يجب أن يزيد في التقصير على قدر الأنملة لأن الواجب هذا القدر من أطراف جميع الشعر، وأطراف جميع الشعر لا يتساوى طولها عادة، بل تتفاوت، فلو قصر قدر الأنملة لا يصير مستوفياً قدر الأنملة من جميع الشعر، بل من بعضه فوجب أن يزيد عليه حتى يستيقن باستيفاء قدر الواجب فيخرج عن العهدة بيقين** (بدائع: ۲/۳۳۰: زکریا)۔

(۱۰) ایسے مریض کمزور اور بوڑھے اور اپاہج وغیرہ کی طرف سے رمی جمرات میں نیابت جائز ہے (۱)؛ جو کہ از خود جمرات تک پہنچ کر رمی کرنے پر قادر نہ ہو، رمی میں ایسے لوگوں کو بھی معذور اور مریض اور کمزور شمار کیا جائے گا جو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں اور جمرات تک پیدل یا سوار ہو کر پہنچنے میں سخت تکلیف اور مرض و کمزوری بڑھ جانے کا اندیشہ انھیں ہو اور اگر سوار ہو کر جمرات تک آ سکتے ہوں اور مرض و کمزوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو خود رمی کرنا لازم ہے دوسرے سے رمی کرانا جائز نہیں ہے، اگر ایسے حالات میں دوسرے سے رمی کرائے گا تو رمی کا وجوب ذمہ میں باقی رہ جائے گا اور ترک واجب کا دم دینا لازم ہوگا (۲)۔

---

(۱) سواء رمي بنفسه أو بغيره عند عجزه عن الرمي بنفسه كالمريض الذي لا يستطيع الرمي، فوضع الحصى في كفه فرمى بها أو رمى عنه غيره؛ لأن أفعال الحج تجري فيها النيابة كالطواف والوقوف بعرفة ومزدلفة (بدائع الصنائع: ۲/۳۲۳).

(۲) من ترك الرمي بغير عذر فعليه دم، قال أحمد: أعجب إلي إذا ترك الأيام كلها كان عليه دم وفي ترك جمرة واحدة دم أيضاً نصّ عليه أحمد وبهذا قال عطاء والشافعي وأصحاب الرأي. (المغني لابن قدامه: ۲/۴۲۸، ناشر: مكتبة القاهرة)

(۱۱) ایسے شخص پر جرمانے میں ایک بکرے کی قربانی لازم ہوگی: **ولو جاوز الميقات بغير إحرام فأحرم ولم يعد إلى الميقات حتى طاف شوطاً أو شوطين أو وقف بعرفة أو كان إحرامه بالحج، ثم عاد إلى الميقات لا يسقط عنه الدم لأنه لما اتصل الإحرام بأفعال الحج تأكد عليه الدم فلا يسقط بالعود.** (بدائع: ۳۷۳/۲ زکریا) فقط واللہ اعلم

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۹/محرم/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

وقوف عرفہ سے پہلے جماع کی صورت میں حج کی قضاء کب کرے؟

(اس سے متعلق دو متضاد عبارتوں کے درمیان محاکمہ)

سوال: ﴿۴۰۶﴾ اگر کوئی شخص وقوف عرفہ سے پہلے جماع کرلے، تو ایسے شخص کے بارے میں ''انوار مناسک/ ۲۱۵'' میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ وقوف عرفہ سے پہلے ہمبستری کی وجہ سے حج بھی فاسد ہوجائے گا اور ساتھ ہی ایک دم بھی واجب ہوجائے گا؛ لہٰذا اگر جماع اور ہمبستری کے بعد اتنا وقت ہے کہ دوبارہ حج کا احرام باندھ کر عرفہ کی رات ختم ہونے سے قبل وقوف کرسکے تو دوبارہ حج کا احرام باندھ کر وقوف کرلیا جائے تو حج صحیح ہوجائے گا، گویا اسی سال فاسد شدہ حج کی قضا ہوجائے گی اور ساتھ ہی ایک دم بھی دیدے اور اگر اس سال وقت نہیں ہے تو دوسرے حجاج کی طرح حج کے ارکان میں عمل کرتا رہے اور آئندہ سالوں میں حج کی قضا کرنا لازم ہوگا، اور ایک دم بھی بہرحال لازم رہے گا''۔ حاشیہ میں یہ حوالہ درج ہے ''**وإن جامع في أحد السبيلين قبل الوقوف بعرفة فسد حجه وعليه شاة ويمضي في الحج كما يمضي من لم يفسد ه.** ۱۵. (ہدایہ رشیدیہ: ۲۵۱/۱)، مگر معلم الحجاج/ ۲۴۱ میں یہ حکم اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''حج فاسد ہوگیا اور دم واجب ہوگیا اور باقی افعال حج مثل حج صحیح کے ادا کرنے ہوں گے اور آئندہ سال حج کی قضا واجب ہوگی''. اس سے معلوم ہوتا ہے اسی سال قضاء کرنا یا دوبارہ احرام باندھنا نہیں ہوسکتا؛ بلکہ آئندہ سال ہی میں ہوسکتا ہے۔ اس کی تائید ذیل کی عبارت سے ہوتی ہے:

(۱) آگے خود صاحب ہدایہ استدلال میں حدیث پیش کرتے ہیں؛ جس میں ''**وعليها الحج**

من قابل " کا لفظ آیا ہے۔

(۲) ولـو أهـل بحجة أو عمرة وجامع فيها ثم أحرم بأخرىٰ ينوي قضاء ها قبل أدائها فهي هي وإهلاله لم يصح مالم يفرغ

(غنية الناسك :۱۴۵،قبيل مطلب في جماع القارن، مطبوعه: كراچى).

(۳) وعليهما قضاء الحجة من قابل الخ.

(عالمگيري :۱/۲۴۴زكريا.الفصل الرابع في الجماع).

(۴) وكـذا فـي فتـاوى قاضي خان أن نية الرفض باطلة؛ لأنه لا يخرج عنه إلا بالأعمال .(بحر ،كوئٹه :۳/۱۵)

(۵) قـولـه:(ويـمضي. الخ) لأن التحلل من الإحرام لا يكون إلا بأداء الأفعال أو الإحـصار ولاوجود لأحدهما وإنما وجب المضي فيه مع فساده لما أنه مشروع بأصله دون وصفه ولم يسقط الواجب به لنقصانه .(شامي:زكريا ۳/۵۹۳).

(۶) (قـولـه:فهـو صـريـح فـي جـواز الـقـضاء من عامه الخ) الذي سيأتي متناً وشـرحـاً: جاوز الميقات بلا إحرام فأحرم بعمرة؛ يعني داخل الميقات، ثم أفسدها مـضـى وقـضى ولا دم عليه لترك الوقت لجبره بالإحرام منه في القضاء الخ، وبهذا تـعـلـم ما في نقله وإن ما يأتي لا يدل على جواز القضاء في عامه حتى يكون مخالفاً لـمـا ذكروه هنا على أن عبارة الرملي بعد ما ذكره عنه؛ لكن هنا لما وجب المضي بـالإحـرام من الميقات تعين القضاء من القابل بخلاف المجاوزة بلا إحرام لتدارك ما فاته .اه.هكذا نقل عبارته السندي.(تقريرات الرافعی:۳/۱۶۵).

(۷) بـاب مـفـسـدات الحج: وكذا يفسد بالجماع .اه.المالكية قالوا: ويجب على من فسد حجه إتمامه فلو ترك إتمام الحج لظنه أنه خرج من الإحرام يبقىٰ على إحـرامه فلو أحرم في العام القابل إحراماً جديداً كان إحرامه لغواً ويتم إحرامه الذي أفسـده ......الثـانـى قـضـاء ه فـوراً متىٰ كـان قـادراً .اه. الـحنفية قالوا: ويقضيه من قابل.اه. الشافعية قالوا: ويجب قضاء الحج الذي أفسده بالجماع فوراً أي في العام

الـذي يليه مباشرة .اهـ. الحنابلة قالوا :وعلى الفاعل والمفعول القضاء فوراً في العام القابل.اهـ. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة :۱/۶۰۶، مطبوعه ديوبند وبيروت).

(۸) فإذا فسد الحج بالجماع يجب المضي في فاسده ويجب القضاء إتفاقاً على الفور من العام التالي وإن كان نسكه تطوعاً، لأنه يلزم بالشروع فيه فصار فرضاً بخلاف باقي العبادات . (الاستذكار لابن عبد البر: ۱۲/ ۲۸۸تحت الحديث ۸۲۳،باب هدى المحرم إذا أصاب أهله).

(۹) ومنها :وجوب المضي في الحجة الفاسدة ويعمل جميع ما يعمله في الحج الصحيح ...... لقول جماعة من الصحابة رضي الله عنهم (يمضيا في إحرامهما) ومنها :وجوب القضاء من عام قابل بإجماع الصحابة .اهـ. وهل يجب القضاء على الفور ؟ مقتضى كلام الأصحاب أنه يجب القضاء على الفور .اهـ. (البحر العميق: ۲/ ۸۷۸،الفصل الخامس في الجماع ودواعيه، ط:مكة).

(عبد ضعیف کا ناقص خیال ہے کہ یہاں علی الفور سے مراد علی الفور من العام التالی ہے جو الاستذکار وکتاب الفقہ کی مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے اور پھر عام تالی میں حج صحیح کا وہ اختلاف آئے گا؛ یعنی وجوب اداء علی الفور ہے یا علی التراخی ،اور شاید اسی کو علامہ شامی نے دوقول سمجھا ہے **مع تأمله ولعل الحال بخلافه** *.شامی زکریا:۳/۵۹۳ ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔*

(۱۰) قال ابن رشد:ومما يخص الحج الفاسد عند الجمهور دون سائر العبادات أنه يمضي فيه المفسد له ولا يقطعه وعليه دم ...... وقال القاري في شرح النقاية: أفسد حجه بالجماع ومضى في حجه لإ جماع الصحابة على ذلك......ووجب عليه المضي في فاسده والقضاء على الفور واتفقوا على ان عقد الإحرام لا يرتفع بالوطي، وقال داؤد الظاهري:يرتفع .فإن قال قائل: فلأي شيئى لم يأمروا المحرم إذا فسد حجه بالجماع أن ينشئى إحراماً ثانياً إذا كان الوقت متسعًا كان وطي في ليلة عرفة؟ فالجواب: قد انعقد الإجماع على ذالك ولا يجوز خرقه لعل ذٰلك سببه التغليظ لا غير .انتهىٰ (أوجزالمسالك:۷/۲۲۲المكتبة الإمدادية :مكة

المكرمة، ومطبوعه سهارن پور : ۵۵۳/۳،باب هدى المحرم إذا أصاب أهله).

اس بارے میں مفتیان دیو بند کی کیا رائے ہے؟ امید ہے کہ صحیح مسئلہ کو اس کے ماخذ کے ساتھ تحریر فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ محمد ابراہیم تری پوروی (۱۲/۷/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ مسئلے کا جو حکم معلم الحجاج میں درج ہے، وہی صحیح اور درست ہے مآخذ کے طور پر غنیۃ الناسک عالم گیری اور شامی وغیرہ کی جو عبارتیں آپ نے شامل استفتاء کی ہیں وہی کافی ہیں ؛البتہ شامی کی عبارت:"**ويقضي على الفور كما نقله بعض المحشين عن البحر العميق وقال الخير الرملي: ويقضي أي من قابل لوجوب المضي فلا يقضي إلاّ من قابل وسيأتي في مجاوزة الوقت بغير إحرام أنه لو عاد ثمّ أحرم بعمرة أوحجّة ثمّ أفسد تلك العمرة أوالحجة وقضى الحج في عامه، يسقط عنه الدم فهو صريح في جواز القضاء من عامه لتدارك ما فاته فليتأمل** :۵۹۳/۳"(۱) سے کسی قدر وہم ضرور ہوتا ہے؛ لیکن اسی عبارت پر علامہ رافعی کا حاشیہ، نیز دیگر فقہی نصوص کی موجودگی میں اس وہم کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا، مزید یہ کہ فتح القدیر:۴۰/۳ زکریا میں اس مسئلے سے متعلق کئی آثار بھی منقول ہیں۔

(۱)**روى بالزيادة عن جماعة من الصحابة سأل مجاهداً عن المحرم يواقع امرأته فقال: كان ذلك على عهد عمر بن الخطاب رضي الله عنه فقال: يقضيان حجهما، ثم يرجعان حلالين فاذا كان من قابل حجا وأهديا(۲).**

(۲)**روى الدار قطني عن ابن عمر قال: فيه بطل حجه قال له السائل فيقعد؟ قال: لا، بل يخرج مع الناس فيصنع ما يصنعون فإذا أدركه من قابل حج وأهدى الخ(۳).**

---

(۱) الدرمع الرد، باب الجنايات في الحج.

(۲) مصنف ابن أبي شيبة بمعناه ، باب في الرجل يواقع أهله وهو محرم، رقم الحديث: ۱۵۹۰۴

(۳) سنن الدار قطني: ۴۷۵/۳،م:مؤسسة الرسالة، بيروت رقم الحديث:۳۰۰۰۔

(۳) في موطأ مالك من بلاغاته عن علي وعمرو أبي هريرة نحوه إلا أن علياً قال فيه: يفترقان حتى يقضيا حجهما (انتهى) (۴).

نیز ''**زبدة المناسك**'' میں ہے: ''مسئلہ'' احرام والے نے وقوفِ عرفات سے پہلے ایک ہی مجلس میں دو چار دفعہ جماع کیا، ایک عورت سے یا دو تین عورتوں سے تو اس پر ایک ہی دم ہے اور اگر مختلف مجالس میں کیا تو ہر مجلس کے لیے جدا جدا کفارہ دینا ہوگا، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف (رحمۃ اللہ علیہما) کے نزدیک اور امام محمدؒ کے نزدیک ایک دم؛ بشرطیکہ پہلی مجلس کا کفارہ نہ دیا ہو اور اگر دوسری مجلس میں حج فاسد کے چھوڑنے کے ارادہ سے جماع کیا تو اس پر ایک دم ہے بالاتفاق دوسری بار سے اور کچھ لازم نہ ہوگا، باوجود اس بات کے کہ رفض کی نیت باطل ہوگئی اور احرام سے بغیر اعمال ادا کیے نہیں نکل سکتا بخلاف مامور بالرفض کے؛ جیسے محصر جو ذبح سے حلال ہو کر احرام چھوڑ چکا ہو۔ ص: ۳۹۵۔ (۵)

جہاں تک انوار مناسک میں ذکر کردہ حکم کی بات ہے تو اس سے متعلق مصنفِ کتاب سے براہِ راست معلوم کرلیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

صحتِ قربانی کے لیے مکانِ مضحی واضحیہ دونوں میں ایام نحر کا ہونا ضروری ہے

سوال: ﴿۴۷﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

مسئلہ: ''امریکہ'' میں رہنے والا کسی دوسرے ملک جیسے ہندوستان، برما وغیرہ میں رقم بھیج کر قربانی کرواتا ہے تو اس امریکی کی قربانی جائز ہوگی یا نہیں؟ اس لیے کہ یہاں (ہندوستان وغیرہ) جس دن عیدالاضحیٰ ہوتی ہے وہاں ابھی صبح صادق بھی نہیں ہوتی، اس سلسلے میں قواعد شرعیہ ونظائرِ فقہیہ کو

(۱) الموطأ للإمام مالك، رقم الحديث: ۸۴۴۔

(۲) زبدة المناسك مع عمدة المناسك از مولانا رشید احمد گنگوهیؒ م مکتبه اشرفیه ممبئی

سامنے رکھ کر تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔ بینوا بالدّلیل، توجروا عند الربّ الجلیل.

المستفتی: محمد رضوان مرادآبادی (۲۰۱۷/د ۱۴۳۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق:

قربانی کا سببِ وجوب ایامِ قربانی (دسویں ذی الحجہ کی صبحِ صادق سے بارہویں ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک) ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی شخص ایامِ قربانی کو اس حالت میں پائے کہ اس میں قربانی کے وجوب کی تمام شرطیں (آزاد ہونا، مسلمان ہونا، ایامِ قربانی میں مقیم ہونا اور ایامِ قربانی میں بہ قدرِ نصاب مال کا مالک ہونا) موجود ہوں؛ تو اس پر ایامِ نحر میں قربانی کرنا واجب ہے، ایامِ نحر سے قبل وبعد قربانی کرنا درست نہ ہوگا: **إن سبب وجوب الأضحية الوقت، وهو أيام النحر.** (فتح القدیر: ۹/۵۱۹)، **وفي البدائع: وأما وقت الوجوب فأيام النحر، فلا تجب قبل دخول الوقت كالصلاة والصوم ونحوهما، وأيام النحر ثلاثة.** (بدائع الصنائع: ۴/۱۹۸)

قربانی کے درست ہونے کے لیے مضحی (قربانی کرانے والے) اور اضحیہ (قربانی کے جانور) دونوں کے مقام پر ایامِ نحر کا موجود ہونا ضروری ہے، اول (مضحی) کے حق میں تو اس لیے کہ قربانی کا سببِ وجوب وقت (ایامِ نحر) ہے، جس کا (مضحی کے حق میں) پایا جانا ضروری ہے، ثانی (اضحیہ) کے حق میں اس لیے کہ جانور جس جگہ ہوگا واجب کی ادائیگی وہیں ہو رہی ہے؛ اس لیے سبب وجوب ایامِ نحر کا ہونا وہاں بھی ضروری ہے، ہاں! وقت کا لحاظ صرف اضحیہ میں کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جانور اگر دیہات میں ہے تو دسویں ذی الحجہ کو صبحِ صادق کے بعد قربانی کی جاسکتی ہے، جب کہ شہر میں نمازِ عید کے بعد ہی قربانی کرنا درست ہوگا: **وأما شرائط آدابها: فمنها الوقت في حق المصري بعد صلاة الإمام** (البحر الرائق: ۸/۳۱۷)۔ معلوم ہوا کہ سببِ وجوب میں دونوں (مضحی اور اضحیہ) کا اعتبار کیا جانا ضروری ہے، جبکہ وقتِ ادا میں صرف مکانِ اضحیہ کا اعتبار بھی کافی ہے: **وإنما يعتبر في هذا مكان الشاة لا مكان من عليه.** (بدائع: ۴/۲۱۳) **ويعتبر مكان المذبوح لا مكان المالك.** (خانیۃ: ۳/۳۴۵)؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ''امریکہ'' میں رہنے والے کسی شخص مسلم کی طرف سے ہندوستان، برما یا کسی بھی دوسرے ملک میں قربانی اسی وقت صحیح ہوگی؛

جب امریکہ میں رہنے والے کے حق میں سببِ وجوبِ قربانی (ایامِ نحر) پایا جائے اور مکانِ اضحیہ میں بھی ایامِ نحر موجود ہوں؛ لہٰذا اگر امریکہ میں رہنے والے کے حق میں سببِ وجوب (ایامِ نحر) نہ پایا جائے یا مکانِ اضحیہ میں ایامِ نحر موجود نہ ہوں تو اس کی جانب سے قربانی درست نہ ہوگی۔ حاصل یہ کہ جس طرح مکانِ اضحیہ میں ایامِ نحر کا موجود ہونا ضروری ہے؛ اسی طرح مکانِ مضحی میں بھی ایامِ نحر کا موجود ہونا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/۱۲/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام، وقار علی غفر لہ

کیا حضور ﷺ نے کبھی اپنے ہاتھ سے قربانی کی؟

کیا آپ ﷺ نے قربانی کا گوشت تناول فرمایا؟

سوال: ﴿۴۸﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) آں حضرت ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے قربانی کی ہے یا نہیں؟

(۲) قربانی کا گوشت آپ علیہ الصلاۃ والتسلیم نے کھایا ہے کہ نہیں؟

ان مذکورہ سوالات کے جوابات مدلل مع تعیینِ کتب وصفحات مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ ضمیر احمد مقام خیری ضلع لکھیم پور کھیری (۱۵۷۳/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) متعدد روایات میں خود رسول اللہ ﷺ کا قربانی کے جانور کا ذبح کرنا بالخصوص حج کے موقعہ پر ذبح کرنا صراحۃً مذکور ہے، مثلاً **عن أنس ضحی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بکبشین أملحین، الحدیث** (۱). **عن ابن عمر قال: کان النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم یذبح وینحر بالمصلی، رواہ البخاري** (۲)، **عن جابر قال: ذبح النبي صلی اللّٰہ علیہ**

(۱) أخرجہ البخاري، رقم: ۵۵۵۸۔

(۲) أخرجہ البخاري، باب الأضحی والمنحر بالمصلیٰ، رقم: ۵۵۵۲۔

وسلم يوم الذبح كبشين. الحديث(۱).

یہ تینوں روایتیں مشکوۃ باب الاضحیۃ میں موجود ہیں؛ جن سے آپ ﷺ کا بدستِ خود قربانی کرنا معلوم ہوتا ہے، ان کے علاوہ بعض ایسی بھی روایتیں ہیں، جن سے بموقعہ حج خود ذبح کرنا معلوم ہوتا ہے۔ عن جابر قال :ذبح النبي – صلى الله عليه وسلّم – عن عائشة بقرة يوم النحر (۲)، اور دوسری روایت میں عن نسائه بقرة في حجته آیا ہے؛ بلکہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے تریسٹھ اونٹ نحر فرمائے تھے(۳)۔

(۲) قربانی کے ایام ضیافت اللہ کے ایام ہیں (۴)، ضرور آپ ﷺ نے ہمیشہ اس ضیافت سے حصہ حاصل کیا ہوگا، حجۃ الوداع کے موقعہ پر صراحۃً اس کا ذکر بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے گوشت تناول فرمایا اور شوربا نوش فرمایا ثم أمر من كل بدنة ببضعة فجعلت في قدر فطبخت فأكلا من لحمها وشربا من مرقها الحديث، مشکوۃ:/ ۲۲۵(۵)۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳/۱۰/ ۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری۔

مدارس والوں کا مشترکہ قربانی کا نظم اور اس کے لیے حصے کی قیمت وصول کرنا کیسا ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دارالعلوم دیوبند اس بارے میں کہ

(۱) أخرجه أبو داؤد، باب ما يستحب من الضحايا ،رقم :۲۷۹۵۔

(۲) أخرجه مسلم،رقم الحديث:۱۳۲۱، باب الإشتراك في الهدي.

(۳) أخرجه مسلم في حديث طويل فيه ثم انصرف الىٰ المنحر فنحر ثلاثاً وستين بدنةً بيده ثم اعطى علياً فنحر ما غبر وأشركه في هديه (مشكوٰة المصابيح: ۲۲۵)

(۴) صوم الأيام المنهية إعراض عن ضيافة الله (شرح التلويح على التوضيح : ۱/۴۲۴ ط:مكتبه صبيح، مصر)،الإمساك أول يوم الأضحىٰ ليس بصوم بل شُرِعَ ليكون أول التناول من ضيافة اللّٰه (كشف الأسرار،شرح أصول البزدوي : ۳/۳۹۷،ط :دار الكتاب الإسلامي).

(۵) أخرجه مسلم في صحيحه ،باب حجة النبي صلى الله عليه وسلّم، رقم:۱۲۱۹۔

سوال: ﴿۴۹﴾ کئی چھوٹے بڑے شہروں میں بڑے جانوروں کی مشترکہ قربانی کا انتظام کرنے کے لیے مدارس کے مدرسین اور دینی اداروں کے متعلقہ افراد وغیرہ ذمہ داری لیتے ہیں، بقر عید سے بیس تا پچیس دن قبل ہی اشتہارات کے ذریعہ اعلان کرتے ہیں کہ بڑے جانوروں میں فی حصہ کی قیمت ۱۰۰۰/ ایک ہزار روپے طے کی گئی ہے، کوئی ۱۲۰۰/ تو کوئی ۹۵۰/ اس طرح کے اشتہارات بھی لگاتے ہیں .... جانوروں کو بغیر دیکھے، بغیر دام طے کیے اور بغیر قربانی دینے والوں کو دکھائے، مسلمانوں سے ان کے حصہ کی قربانی کا حصہ محفوظ؛ یعنی بک کرتے ہوئے قبل از وقت پیسے وصول کر لیتے ہیں، پھر تھوڑا سا گوشت (ایک حصہ) جس کے نام کی قربانی ہوئی، اس کے گھر روانہ کر دیتے ہیں، اس میں مزدوری کا خرچ بھی آتا ہے؛ جس کا ذکر نہیں ہوتا اور اس بات کی بھی اطلاع نہیں دی جاتی کہ کس دام میں جانور خریدا گیا، چمڑا بازار میں فروخت کر کے اس کی قیمت مدرسوں کے فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے، چمڑا کس دام میں فروخت ہوا یہ بھی کسی کو پتہ نہیں چلتا۔

پچھلے سال ایک حصہ کی قیمت ۶۰۰ تا ۷۰۰/ روپے تھی، اس سال جانور خریدے بغیر جانور کی قیمتوں کا انہیں کیسے پتہ چل گیا یا یہ لوگ خود دام بڑھا کر اشتہارات لگوا رہے ہیں، اس سے بھی عوام ناواقف ہیں، ڈر ہے کہ مسلمانوں کی قربانیاں رائیگاں نہ جائیں؛ کیوں کہ احکام شریعت کے تحت اگر کہیں بھی ایک بھی حصہ دار کو کوئی بھی شک وشبہ ہو تو تمام کی قربانی مشتبہ ہو جائے گی۔

اب آپ علمائے دین سے باادب درخواست ہے کہ اس تعلق سے ہمیں فوراً اس کا درست حل کیا ہے؟ اس سے مطلع فرمائیں کہ دین اسلام میں اس کے لیے کس حد تک گنجائش ہے کہ آیا اس طرح قربانی سے قربانی ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر اس میں خامیاں ہوں تو اس کی بھی نشاندہی فرمائیں، تاکہ ان خامیوں کو دور کیا جا سکے اور مسلمانوں کو صحیح راستے پر گامزن کیا جا سکے۔ والسلام

احقر: شبیر احمد عفی عنہ ابن محمد اسحاق مرحوم، وانمباڑی

نوٹ: اگر اردو اخبارات میں اس کا جواب شائع کرا دیں تو تمام امت مسلمہ کا فائدہ ہوگا۔

(۲۲۲۲/ د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

قربانی کا انتظام کرنے والوں کے پاس آپ اشکالات بھیج کر ان سے ان کا طریق کار معلوم

کرتے، جو طریق کار وہ لکھ کر دیتے، اسے یہاں بھیج کر اس کا حکم شرعی معلوم کر لیتے تو بات آسان تھی اور عمل کرنے والوں کو بھی مشکل نہ پیش آتی؛ بلکہ فتویٰ کی روشنی میں جو امور قابلِ اصلاح یا لائق ترمیم معلوم ہوتے، اس کی وہ اصلاح وترمیم کر لیتے۔

پھر بھی مذکورہ انتظام کے ذریعہ قربانی کے جواز کی جو واضح شکل ہے، وہ تحریر کردی جارہی ہے، تاکہ فی الجملہ آپ کا اشکال قربانی کی صحت کی طرف سے رفع ہوجائے۔

اگر قربانی کا انتظام کرنے والے بقرعید سے قبل جانوروں کی بازاری قیمت کا اندازہ کرکے تخمینہ سے ایک حصہ کی قیمت کا اندازہ مقرر کر لیتے ہوں اور اس کی خبر لوگوں کو کردیتے ہوں کہ اندازاً ایک حصہ اتنے میں پڑے گا، پھر لوگ اپنی اپنی طرف سے قربانی کرنے کے لیے منتظمین کو پیسہ دیتے ہوں اور منتظمین حصہ داروں کی طرف سے وکیل بن کر جانوروں کی خریداری کریں، پھر قربانی کردیں تو یہ قربانی درست اور شرعی اعتبار سے صحیح ہوجائے گی، ایک شرط ملحوظ رہنی ضروری ہے کہ جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت، (قیمت میں جانور کی اصل قیمت ذبح کرائی اور چارہ وغیرہ کا خرچ بھی شامل کرلیا جائے) کسی حصہ دار کی دی ہوئی رقم سے زائد نہ ہو(۱)، اخیر میں حساب کرنے کے بعد جو رقم بچے وہ رقم حصہ داروں کو واپس کردی جائے یا صراحۃً ان کی اجازت سے کسی مصرف میں خرچ کردی جائے؛ مثلاً اگر وہ اجازت دیں تو مدرسہ میں داخل کردی جائے۔ مذکورہ شکل میں منتظمین جانور کی خریداری اور پھر قربانی کا کام انجام دینے میں حصہ داروں کے وکیل ہوں گے، کسی کام کا وکیل انسان قابل اعتبار شخص کو بناتا ہے؛ لہٰذا جسے کسی کی وکالت پر اطمینان نہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ قربانی کرنے میں مسائل شرعیہ کی رعایت نہیں کریں گے تو انہیں خود اپنا انتظام کرنا چاہیے، دوسرے کو وکیل نہ بنانا چاہیے یا پھر وکیل سے ہر طرح کا معاملہ صاف صاف طے کرلینا چاہیے، اسی طرح گوشت اور کھال میں ہر حصہ دار کا حق ہے جو لینا چاہے اسے خود آکر اپنے حصے کا گوشت لینا چاہیے، پس صورت مسئولہ میں گوشت اور کھال کی بابت منتظمین اور حصہ داروں کے درمیان کیا معاملہ طے ہوتا ہے، ان سے دریافت کرکے لکھیں، نیز یہ امور نفس قربانی سے علاحدہ ہیں، خلاف شرع یا خلاف معاملہ کرنے کی صورت میں گناہ ہوگا اور بعض صورتوں میں گناہ اشد ہوگا اور بعض صورتوں میں گوشت

(۱) ولو لأحدهم أقلّ من سبع لم يجز عن أحد (كتاب الأضحية: الدر مع الرد: ۹/۴۵۷)

کا استعمال درست نہ ہوگا؛ لیکن فی نفسہٖ قربانی درست ہوجائے گی، جیسا کہ اوپر لکھا گیا؛ لہٰذا جنہیں گوشت لینا منظور ہو یا کھال کی بابت وہ کوئی اور تصرف کرنا چاہتے ہوں تو انہیں صاف صاف معاملہ منتظمین سے طے کرلینا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

نکاح،طلاق،حضانت
اوروراثت سے متعلق بعض مسائل

ٹیلی فون پر نکاح کا حکم

سوال: ﴿۵۰﴾ ٹیلی فون پر نکاح کے بارے میں ''فتاوی عثمانی'':۲/۳۰۴ پر حکم عدم جواز کا لکھا ہے؛ مگر ''خیر الفتاوی'':۴/۳۰۷ مطبوعہ مکتبۃ الحق ممبئی بعنوان ''فون پر ایجاب وقبول کا حکم، اور جواب مذکور پر موصول ہونے والی تحریر کا جواب'' میں ہے:

الجواب: دراصل فون دو طرح کے ہیں، ایک وہ کہ اس کی آواز صرف وہی شخص سن سکتا ہے جس نے فون اٹھایا ہوا ہو، دوسرا فون وہ ہے، جس کی آواز سب حاضرین کو سنائی دیتی ہے، پہلی قسم کے فون پر نکاح منعقد نہ ہوگا؛ کیوں کہ ایجاب وقبول کو معاً دونوں گواہوں کا سننا شرعاً ضروری ہے، اس فون پر معاً سننا نہ ہوگا؛ بلکہ علی التعاقب ہوگا، درمختار میں ہے: **وشرط حضور شاهدين حرّين أو حرٍّ وحرّتين مكلّفين سامعين قولهما معًا** (شامی:۲/۲۷۲)؛ چوں کہ عموماً فون ایسے ہی ہیں؛ اس لیے نکاح کے عدمِ انعقاد کا قول کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کے فون میں چوں کہ مذکورہ شرط پائی جائے گی؛ اس لیے نکاح منعقد ہوجائے گا۔ فون کے ذریعہ جو براہِ راست آواز آتی ہے، اسے رسول کے پیغامِ ایجاب یا خط کے مضمون کے اعادہ کی طرح قرار دیں گے''۔ اس بارے میں مفتیان دیوبند کی کیا رائے ہے؟ امید ہے کہ مدلل جواب تحریر فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

محمد ابراہیم تری پورہ (۱۱/۷د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعًا نکاح کے صحیح ہونے کے لیے ایجاب وقبول کی مجلس کے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ، دو شاہدوں (گواہوں) کی موجودگی بھی ضروری ہے(۱) اور ''شاہد'' ایسے شخص کو کہتے ہیں، جو مجلسِ نکاح میں بجسدہٖ موجود ہو، عاقدین کے کلام کو بلا کسی اشتباہ کے سن سکتا ہو؛ تا کہ بہ وقت ضرورت گواہی دے سکے (۲)؛ لہٰذا فون اگر چہ بعض صورتوں میں حاضرین کے لیے قابلِ سماعت ہو، پھر بھی شہادت کی شرط پوری کرنے کے لیے کافی نہیں؛ اس لیے کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ضرور رہتا ہے، فقہاء نے دیوار کے پیچھے سے کسی چیز کو سن کر اس سے متعلق گواہی دینے کو ناجائز لکھا ہے'' **ولو سمع من وراء الحجاب لا يسعه أن يشهد لاحتمال أن يكو ن غيره إذا النغمة تشبه النغمة** (۳)، نیز یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ دیگر معاملات میں تو اصل اباحت ہے؛ لیکن نکاح کے باب میں حظر (ممانعت) اصل ہے، مشہور قاعدہ ہے ''**الأصل في الأبضاع التّحريم**'' (۴)؛ لہٰذا ٹیلی فون (خواہ اس کی آواز حاضرین وگواہان کے لیے قابلِ سماعت ہو یا نہ ہو) پر نکاح جائز نہیں، اس کے بجائے توکیل کا طریقہ اپنانا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/۴/۳۲ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ،

---

(۱) وشرط حضور شاهدين — أي يشهد ان على العقد — حرّين أو حرّ وحرّتين، مكلّفين سامعين قولهما معاً (الدر مع الرد: ۴/۸).

(۲) الشّهادة: الإخبار بصحّة الشيء مشاهدةً وعياناً، يقال: شهد عند الحاكم لفلانٍ على فلانٍ بكذا شهادةً؛ فهو شاهدٌ (المغرب: ۱/۲۵۹،م: دار الكتاب العربيّ، باب الشين مع الهاء).

(۳) تبيين الحقائق، باب ما يشترط للشهادة: ۳/۲۱۳، المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر.

(۴) الأشباه والنظائر: ۱/۵۷، دار الكتب العلمية، بيروت.

نکاح میں کفاءت: مصلحت شرائط اور اس سے متعلق شبہات کے جوابات

سوال: ﴿۱۵﴾ان سوالوں کو پوچھنے کا میرا مقصد غیر برادری میں نکاح کرنے کا نہیں ہے، میں اسلام میں برادر واد قوم پرستی، اور کفو کی شرعی حیثیت جاننا چاہتا ہوں، کیا ایک برادری کے سارے لوگوں کا رہن سہن ایک جیسا ہوتا ہے؟

(۱)اور کیا اسلام رہن سہن کی بناء پر فرق کرتا ہے؟

(۲)اگر ولی غیر برادری میں نکاح کے لیے کسی بھی حال میں تیار نہ ہو، تب کیا نکاح شرعاً جائز نہیں ہے؟

(۳) کیا والدین کی ناراضگی سے، غیر برادری میں نکاح کرنے والوں کا نکاح نہیں ہوا ہے اور وہ زنا کر رہے ہیں؟

(۴) کیا لڑکی کے ولی زبردستی لڑکی کا نکاح کر سکتے ہیں اور کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

(۵)نکاح کے وقت لڑکی کی خاموشی کو صرف اقرار ہی کیوں سمجھا جائے، انکار کیوں نہیں؟ جب کہ اسلام میں لڑکی کو ایجاب منظور کرنے یا نہ کرنے کی قوت ہے؟

(۶) ''عورتوں کے نکاح ان کی پسند کے مردوں سے کرو''، کیا یہ حدیث غلط ہے؟

(۷) کیا مسلمانوں کے درمیان دوریاں بڑھانا ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے گلہ و شکوہ پیدا کرنا گناہ ہے؟ اگر ہاں تو کیا برادریاں حقیقت میں یہ کام انجام دے رہی ہیں؟

(۸) کفو، قوم اور برادری کی طرفداری اور مخالفت، قرآن عظیم اور حدیث میں کہاں کہاں کی گئی ہے، حوالے کے ساتھ تفصیل سے بتائیں؟

براہِ مہربانی سارے جوابات تفصیل سے دیں اگر پہلے کبھی ان سوالوں کا جواب دیا جا چکا ہے تو برائے مہربانی جواب نمبر مجھے بتا دیں۔ لیاقت حسین (۹۱۰/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اونچ نیچ کا گھٹیا تصور اسلام میں نہیں ہے، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰). سارے

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ حدیث میں ہے: ''تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے'' (۱)، فضیلت اور برتری کا معیار تقویٰ، دین اور حسنِ خلق ہے، محض خاندان یا پیشے کی بنیاد پر اپنے کو افضل و بہتر سمجھنا، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا؛ بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ کبر وغرور ہے، جو مذموم ہے (۲)، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إن اللّٰه قد أذهب عنكم عبية الجاهلية وفخرها بالآباء، مؤمن تقي أو فاجرٌ شقي، أنتم بنو آدم و آدم من تراب** (۳)، ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اسلام کی برکت سے جاہلیت کی اکڑ اور نسب پر فخر کو ختم کر دیا ہے، انسان متقی مومن ہے یا بدکار و بدنصیب تم لوگ آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ دوسری حدیث میں ہے **لا فضل لعربي على عجمي إلّا بالتقویٰ** (۴) کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں ہے؛ مگر تقوے سے، ایک حدیث میں ہے کہ **ليس لأحدٍ علىٰ أحد فضل إلّا بدينٍ أو تقویٰ** (۵) یعنی کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہے؛ مگر دین یا تقوی کی بنیاد پر۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی انسان کو دوسرے پر جو کچھ فضیلت یا شرف حاصل ہے، وہ تقویٰ اور حسنِ خلق کی بنا پر ہے؛ لہٰذا خاندانی برتری یا اونچ نیچ کا جاہلانہ تصور، اسلام کی تعلیمات کے

---

(۱) **عن ابن عمر: أنّ النّبي ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ قال: ــ ضمن حديث طويل ــ الناس بنو آدم وخلق اللّٰه آدم من التراب (أخرجه الترمذي: تفسير سورة الحجرات، رقم: ۳۲۷۰).**

(۲) کریم النفس، شریف العمل آباء واجداد کی اولاد میں ہونا خدا کی نعمت اور بندہ کی خوش نصیبی ہے، اس کا حق دل سے شکر کرنا ہے اور اس نعمت پر دل میں خوشی ہونا فرحِ شکر ہے جو جائز ہے، اسی طرح کسی ضرورت سے اس کا ذکر بھی تحدیثِ نعمت کی نیت سے جائز ہے؛ لیکن مبالغہ کے ساتھ ذکر کرنا اور اس پر فخر، کبر ہے، جس کے تین درجے ہیں: (الف) اگر دل سے خوش ہو کر اتراتا رہا اور شکر نہ ادا کیا تو یہ عُجب ہے، جو بہت بڑا گناہ ہے۔ (ب) اور اگر لوگوں میں اس کا اظہار اس لیے کیا کہ لوگ میری عزت کریں تو حُبّ جاہ ہے، جو عُجب سے بڑھ کر ہے۔ (ج) اور اگر لوگوں میں اس کا اظہار کر کے دوسروں کو اپنے سے حقیر و ذلیل بھی سمجھا تو یہ کبر ہے۔ پس ذکرِ نسب کا صرف ایک پہلو روا؛ بلکہ دین ہے اور اس کے تین پہلو، ناروا اور دنیا ہیں، حدیث: '' **أنا سيد ولد آدم ولا فخر** '' ہم کو یہی تعلیم دیتی ہے۔

(۳) **أخرجه أبو داؤد، رقم الحديث: ۵۱۱۶. باب في التفاخر بالأحساب.**

(۴) **أخرجه أحمد في مسنده في حديث طويل، رقم: ۲۲۹۷۷.**

(۵) **مسند أحمد، رقم: ۱۶۹۹۳.**

خلاف ہے؛ البتہ لڑکی کا نکاح کرتے وقت چند چیزوں میں برابری کا خیال کیا گیا ہے (۱) تا کہ زوجین میں توافق مزاج پیدا ہو سکے اور مصالحِ نکاح خوشگوار طور پر حاصل ہوں؛ چنانچہ قریش خاندان نبوت اور خاندان خلفائے راشدین، ایک دوسرے کے کفو ہیں، اس کفاءت کا اعتبار صرف نکاح میں کیا گیا ہے (۲) اور وہ بھی صرف لڑکی کے حق میں ـــــــ اسی طرح دینداری اور ذریعہ معاش یا پیشہ کے لحاظ سے کفاءت ضروری ہوتی ہے؛ کیوں کہ لڑکی کا نکاح جب ایسے شخص کے ساتھ ہو جائے، جو فسق وفجور یا ذریعہ معاش کے لحاظ سے (۳) لڑکی کے اولیاء کے لیے باعثِ عار ہو؛ ایسی صورت میں رفعِ عار کے لیے لڑکی کے اولیاء کو حق ہوتا ہے کہ دار القضاء یا شرعی پنچایت میں مرافعہ کر کے نکاح فسخ کرا دیں (۴) نیز اولیاء کو بھی ہدایت دی گئی ہے کہ لڑکی کا نکاح ہم پلہ گھرانہ میں کرو ایسے شخص کے ساتھ مت کرو، جہاں رہنے میں لڑکی عار محسوس کرے، اس حد تک شریعت نے کفاءت کا اعتبار کیا ہے، وہ بھی لڑکی کے حق میں؛ تا کہ مصالحِ نکاح پورے طور پر حاصل ہوں، ذریعہ معاش کا تعلق عرف ورواج سے ہے، کوئی ذریعہ معاش اور پیشہ اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور کوئی کمتر سمجھا جاتا ہے، جسے ہر شخص بداہۃً محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ تفصیل کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں:

(۱) نہیں! اسلام دینداری، حسنِ اخلاق اور تقویٰ کی بناء پر فرق کرتا ہے۔

(۲) جب ولی تیار نہیں تو پھر کون تیار ہے، اس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔

(۳) احناف کے یہاں نکاح ہو جاتا ہے؛ مگر اولیاء کو تفریق کرانے کا حق حاصل رہتا ہے، زوجین کی ملاقات زنا نہیں ہوگا (۵)۔ (اس کی مزید وضاحت حواشی کے اخیر میں ملاحظہ فرمائیں)

(۱) الکفاءۃ معتبرۃ من جانبہ أي الرّجل؛ لأنّ الشریفة تأبی أن تکون فراشاً للدنيء ولذا لاتعتبر من جانبها (الدر مع الرد: ۴/۲۰۶).

(۲) تعتبر الکفاءۃ للزوم النکاح ...... فقریش بعضهم أکفاء بعض، وبقیة العرب بعضهم أکفاء بعض (الدر مع الرد: ۴/۲۰۹).

(۳) وتعتبر في العرب والعجم دیانةً ومالاً وحرفةً (الدر مع الرد: ۴/۲۱۳).

(۴) فیفرّق بینهما بطلب الأولیاء (المصدر السابق).

(۵) فنفذ نکاح حرّة مکلّفة بلا رضا وليّ ...... وله أي للولي إذا کان عصبة الاعتراض في غیر الکفء (الدر مع الرد: ۴/۱۵۵).

(۴) بالغہ لڑکی کا نکاح زبردستی نہیں کرایا جاسکتا (۱)۔

(۵) حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إذنها صماتها** (۲) لڑکی کا خاموش رہنا اجازت ہے؛ لہٰذا ولی کے اجازت لینے کی صورت میں، صراحۃً اقرار کرنے سے شرم وحیا مانع بن سکتی ہے؛ اس لیے ہلکی آواز سے رودینے یا خاموش رہنے کو اجازت کے قائم مقام شریعت نے کردیا، غیر ولی کے استیذان کے وقت صراحۃً اقرار کرنا ضروری ہے (۳)۔

(۶) حدیث کا پورا متن مع حوالہ نقل کرتے تو جواب دیا جاتا۔

(۷) منشا واضح نہیں ہے، بات مجمل اور مبہم ہے۔

(۸) **وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** (الحجرات: ۱۳)

حدیث میں ہے: **تخيّروا لنطفكم وانكحوا الأكفاء**. (۴)، دوسری روایت میں ہے: **ثلاث لا تؤخر (وعَدّ منها) والأيم إن وجدت لها كفواً** (۵). فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/ ۵/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلندشہری، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

(۱) ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ (الدر مع الرد: ۴/۱۵۹).

(۲) أخرجه البخاري، رقم: ۶۹۷۱.

(۳) فإن استأذنها غير الأقرب كأجنبي أو وليّ بعيد، فلا عبرة لسكوتها بل لابُدّ من القول كالثيّب (الدر مع الرد: ۴/۱۶۴، باب الولي).

(۴) أخرجه ابن ماجة: ۱۹۶۸، باب الأكفاء.

(۵) أخرجه الترمذي، رقم: ۱۷۱، باب الوقت الأوّل من الفضل.

ولی کی اجازت کے بغیر بالغہ عورت کے غیر کفو میں نکاح کرنے سے اس کا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا یا نکاح تو منعقد ہوگا؛ لیکن اولیا کو حقِ اعتراض حاصل رہے گا، اس سے متعلق ایک اہم اور مفید حاشیہ۔

از: محمد اسد اللہ آسامی، متخصص تدریب افتاء دارالعلوم دیوبند

اگر بالغہ عورت ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کر لیتی ہے تو اس سلسلے میں ظاہر الروایۃ کا حکم یہی ہے کہ نکاح منعقد ہوجائے گا؛ البتہ ولی کو اعتراض کا حق حاصل رہے گا جیسا کہ الدر المختار میں ہے ''**فنفذ نكاح حرة مكلفة بلا رضا ولي، والأصل أن كل من تصرف في ماله تصرف في نفسه ومالا فلا، وله أى للولي إذا كان عصبةً ولو غير محرم كابن عم في الأصح خانية...... الاعتراض في غير الكفوء**'' (الدر مع =

....

= الرد: ۴/۱۵۶) یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ائمہ احناف کے درمیان اس مسئلے میں کچھ اختلاف تھا؛ لیکن بعد میں سب اس پر متفق ہو گئے کہ نکاح منعقد ہو جائے گا جیسا کہ ''تبیین الحقائق'' میں ہے نفذ نكاح حرة مكلفة بلا ولي وهذا عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ في ظاهر الرواية وكان أبو يوسف أولاً يقول: إنه لا ينعقد إلا بولي إذا كان لها ولي، ثم رجع وقال: إن كان الزوج كفواً لها جاز وإلا فلا، ثم رجع وقال: جاز سواء كان الزوج كفواً لها أو لم يكن، وعند محمد رحمه الله تعالىٰ: ينعقد موقوفاً على إجازة الولي سواء كان الزوج كفواً لها أو لم يكن ويروى رجوعه إلى قولهما" (تبيين الحقائق: ۲/۱۱۷ كتاب النكاح، باب الأولياء والأكفاء)؛ لیکن امام ابوحنیفہ سے ''حسن بن زیاد'' کی ایک روایت عدمِ انعقادِ نکاح کی بھی ہے اور متاخرین حنفیہ نے فسادِ زمانہ کی بناء پر اسی روایت پر فتویٰ دیا اور اس کو اقرب الی الاحتیاط قرار دیا، ردالمحتار میں ہے (قوله الاعتراض) أفاد أن العقد صحيح وتقدم أنها لو تزوجت غير كفو فالمختار للفتوى رواية الحسن أنه لا يصح العقد الخ (الدر مع الرد: ۴/۲۲۱ باب الكفاءة)
نیز اسی کے مطابق ماضی قریب کے مفتیان کرام نے بھی عدمِ انعقاد کا فتویٰ دیا، جیسا کہ فتاویٰ دار العلوم ۸/ ۲۰۹، نظام الفتاوی: ۳/ ۲۲۹ جزء اول، فتاویٰ محمودیہ: ۱۱/ ۴۹۸ وغیرہ میں مذکور ہے، اور ظاہر ہے کہ عدمِ انعقادِ نکاح حنفیہ کا اصل مذہب نہیں ہے؛ بل کہ مصلحۃً فسادِ زمانہ کی وجہ سے ظاہر الروایۃ کے خلاف فتویٰ دیا؛ اس لیے یہ فتویٰ مسلک حنفی کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے؛ چنانچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''متاخرین کا فتویٰ کہ نکاح منعقد نہیں ہوگا معلل بعلتِ فسادِ زمان ہے، جو خود بتاتا ہے کہ وہ ایک زجر وانتظام کا فتویٰ ہے نہ یہ کہ حلت وحرمت کی بنیاد اس پر قائم کی جائے'' (کفایت المفتی: ۵/۲۰۶)
بہرحال آج کل کے جو حالات ہیں کہ شہروں، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بے شمار نکاح ہو رہے ہیں، نہ کفاءت کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ ہی ولی کی اجازت کی پرواہ کی جاتی ہے، مزید یہ کہ آج خاندانی بندشیں کمزور پڑ گئیں ہیں اور کفو اور غیر کفو میں شادی کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے تو اگر ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ نہ دیا جائے تو ہزاروں لوگوں کے زنا میں مبتلا ہونے کا حکم لگانا پڑے گا اور یہ ایک سخت حکم ہے، مذہب میں گنجائش ہونے کے باوجود ابتلائے عام کی صورت میں ایسا حکم لگانا مناسب نہیں، اسی مصلحت کے پیش نظر یہ فتویٰ دیا جاتا ہے کہ اگر کوئی بالغہ ولی کی مرضی کے بغیر، غیر کفو میں نکاح کر لیتی ہے تو اس نکاح کو تسلیم کیا جائے گا اور اس نکاح کے نتیجے میں دونوں (لڑکا اور لڑکی) جو کچھ کریں گے، وہ بدکاری نہیں ہوگی؛ بل کہ جائز اور مباح ہوگا؛ البتہ اگر ولی کو یہ پسند نہیں تو وہ شرعی پنچایت یا دار القضاء میں مرافعہ کر کے فسخِ نکاح کی درخواست کر سکتا ہے، نیز مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' میں بھی اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، چناں چہ اس میں ہے ''درج ذیل صورتوں میں عدمِ کفاءت کی بنیاد پر تفریق کا حق حاصل ہوگا'' (الف) بالغہ اپنا نکاح ولی کی رضا کے بغیر غیر کفو میں کر لے تو ولی عصبہ کو حق تفریق حاصل ہوگا، (دفعہ: ۳۲۴، ص: ۲۳۹) نیز قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ نے بھی ظاہر الروایۃ کے مطابق فتویٰ دینے کو راجح قرار دیا؛ چنانچہ کتاب الفسخ والتفریق مؤلفہ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے حاشیے پر لکھتے ہیں: نکاح غیر کفو =

نکاح، کفاءت، ہبہ، فرائض وغیرہ کے چند مسائل

مکرمی ومحترمی زید مجدہ .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاج گرامی بعافیت ہو!

سوال: ﴿۵۲﴾ یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' نے عائلی قوانین کا ایک دفعہ وار مجموعہ مرتب کیا ہے، جو یقیناً آزاد ہندوستان میں شریعتِ اسلامی کی توضیح وتشریح کے سلسلہ میں ایک اہم ترین خدمت ہے، اس مجموعہ کی بعض قانون داں حضرات کے ساتھ خواندگی عمل میں آئی تو بعض باتیں قابلِ وضاحت محسوس ہوئیں، اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ ''نکاح باطل'' اور ''نکاح فاسد'' کی تعریف کا ہے، نیز یہ کہ نکاح فاسد کی صورت میں جب تک عورت مرد کے احتباس میں رہے گی یا جب تک وہ عدت گزارے گی، ان دنوں کا نفقہ واجب ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں سوالنامہ پہلے اِرسال کیا جا چکا ہے۔

اب چند اور قابل غور سوالات آپ کی خدمت میں ارسال ہیں اور آپ سے گزارش ہے کہ تھوڑا سا وقت فارغ کر کے ضرور ان کا جواب مرحمت فرمائیں، نیز ۳۰/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۰ھ تک جواب بھی

= میں منعقد ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلے میں ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ نکاح منعقد ہو جائے گا؛ البتہ ولی کو حقِ اعتراض ہوگا، حسن بن زیاد کی روایت یہ ہے کہ نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا، جس پر اس زمانے کے عام علما نے فسادِ زماں کو سامنے رکھتے ہوئے فتوی دیا ہے، مصنف علام (مولانا عبد الصمد رحمانیؒ) نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، اس حقیر کو اس رائے سے اختلاف ہے، میرے نزدیک ظاہر الروایۃ پر ہی عمل ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ شرائط انعقادِ نکاح میں سے کوئی شرط مفقود نہیں ہے اور آج کے موجودہ حالات میں بھی، جب کہ خاندانی، بندھنیں کمزور پڑ گئی ہیں اور غیر کفو اور کفو میں شادی کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے، ایسی حالت کا بھی تقاضہ ہے کہ جو نکاح ہو چکا اسے منعقد تسلیم کیا جائے اور اگر کسی کو ضرر پہونچتا ہے تو اس کو قاضی کے سامنے اعتراض پیش کرنے کا حق دے کر اس ضرر کو دور کرنے کا راستہ نکالا جائے، (۱۲۰)

آخر میں عرض یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے بھی بعض جگہوں پر نکاح کو تسلیم کرتے ہوئے ولی کو حقِ اعتراض دیا ہے، شاید یہ فتوی مذکورہ بالا مصلحت کے پیشِ نظر ہی تھا، ملاحظہ فرمائیں: امداد الفتاوی: ۲/ ۱۸۹ کا ۲۸۱ سوال وجواب، سوال: بیوہ ثیبہ بلا اذن ولی کے نکاح کرلے تو درست ہے یا نہیں؟ الجواب: اگر وہ بیوہ بالغہ حرہ ہے تو اس کا نکاح بلا اذن ولی جائز ہے؛ لیکن اگر غیر کفو سے یا مہر مثل سے کم پر کرلیا تو ولی کو تعرض پہنچتا ہے، **فنفذ نكاح حرة مكلفة بلا رضا ولي وله الاعتراض في غير الكفو، درمختار**، (امداد: ۲/ ۱۰)۔

بھیج دیں؛ تاکہ اس سلسلہ میں منعقد ہونے والی غور وفکر کی نشست میں آپ کی تحریر سے استفادہ کیا جاسکے۔

(۱) اگر ایک شخص نے نکاح کا ایجاب کیا اور دوسرے فریق کے قبول کرنے سے پہلے خود ایجاب کرنے والا مجلس سے اٹھ گیا، یا اس نے ایسا کام کیا، جس سے اعراض ظاہر ہوتا ہو، تو ایجاب باقی رہے گا یا ختم ہو جائے گا؟

(۲) لڑکی سے نکاح کی اجازت لی گئی، لڑکے نے لڑکی کے وکیل سے ایجاب کیا؛ مگر وکیل نے ایسا عمل کیا، جو اس کے اعراض کو ظاہر کرتا ہو، اس طرح ایجاب باطل ہو گیا، تو کیا لڑکی کی اجازت و توکیل باقی رہے گی؟ اور دوبارہ لڑکا ایجاب کرے تو لڑکی کے وکیل کا قبول کرنا معتبر ہوگا؟

(۳) ''متارکہ'' کی حقیقت کیا ہے؟ متارکہ کے لیے ترکِ وطی کا عزم کافی ہے یا اس کا اظہار بھی ضروری ہوگا؟

(۴) لڑکے اور لڑکی نے نابالغی میں نکاح کیا اور اس سے پہلے کہ ولی اجازت دے یا رد کرے دونوں بالغ ہو گئے، تو کیا ان کا ایجاب وقبول درست سمجھا جائے گا؟ یا دوبارہ ایجاب وقبول کرنا ہوگا؟ یا ابھی اس نکاح کے نافذ ہونے کے لیے ولی کی اجازت ضروری ہوگی؟

(۵) ایک مسئلہ یہ لکھا گیا ہے کہ اگر ولی قریب کے رہتے ہوئے ولیٔ بعید نے نکاح کر دیا تو ولیٔ قریب کی اجازت کے بعد ہی نکاح نافذ ہوگا، اور اگر اس درمیان عاقدین بالغ ہو جائیں، تو خود ان کی اجازت سے نکاح نافذ ہو جائے گا، اب سوال یہ ہے کہ نکاح کے ایجاب وقبول کی طرح عاقدین کے لیے اس اجازت کا **"تکلّم باللّسان"** ہی ضروری ہوگا، یا قلم کے ذریعہ رضامندی کا اظہار، یا رجعت کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ایسا عمل؛ جو میاں بیوی ہی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جائز ہے، بھی کافی ہوگا؟

(۶) فقہاء نے عدمِ کفاءت کی بناء پر اولیاء کو مطالبۂ تفریق کا حق، ولادت اور حمل ظاہر ہونے تک دیا ہے، جب کہ بعض دفعہ بیماری کی وجہ سے سالہا سال استقرارِ حمل کی نوبت نہیں آتی ہے؛ اس لیے کیا اس کے لیے کوئی اور مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟ نیز کیا اس سلسلہ میں وطی تک کی مدت مقرر کی جاسکتی ہے؟

(۷) فقہاء نے لکھا ہے کہ: اگر مکان موہوب، واہب کے سامان سے مشغول ہوتو ہبہ مکمل نہیں ہوگا، سوال یہ ہے کہ اگر واہب نے مکان میں کسی کرایہ دار کو رکھا تھا، تو کیا یہ بھی اس مکان کو مشغول کرنا سمجھا جائے گا ؟ جبکہ ایسا ہوتا ہے کہ ملکیت بدل جاتی ہے اور کرایہ دار باقی رہتا ہے، اور وہ نئے مالک مکان کا کرایہ دار قرار پاتا ہے۔

(۸) فقہاء نے عصبہ کی تعریف یہ کی ہے کہ اس رشتہ میں عورت کا واسطہ نہ ہو؛ جبکہ تقریباً سارے ہی رشتوں میں عورت کا واسطہ ہوتا ہے؛ جیسے باپ اور بیٹے میں بھی باپ کی بیوی واسطہ ہوتی ہے؛ لہذا عصبہ کی ایسی تعریف کی جائے کہ فقہاء کا منشاء بھی واضح ہوجائے اور بادی النظر میں جو شبہ پیدا ہوتا ہے، وہ بھی نہ پیدا ہو۔

امید کہ ان سوالات کے جواب، بہ عجلت ممکنہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے دفتر پر ارسال کریں گے، یہ انشاء اللہ ہندوستان میں شریعت اسلامی کے تحفظ کے سلسلہ میں آپ کا بڑا تعاون ہوگا اور باعثِ اجر ہوگا۔ والسلام

خالد سیف اللہ رحمانی (رکن بورڈ) آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

۷/ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ، ۲۵/ نومبر ۲۰۰۹ء (۸/ د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ایجاب کرنے والا اگر دوسرے فریق کے قبول کرنے سے پہلے مجلس سے اٹھ جائے یا ایسا عمل کرلے، جس سے اعراض ظاہر ہوتا ہو، تو ایجاب ختم ہوجائے گا۔ "**وما لم يقبل بطل الإيجاب إن رجع الموجب قبل القبول، أو قام أحدهما وإن لم يذهب عن مجلسه**" (الدرالمختار)، **وفي الشامي: قال في البحر: "والحاصل أن الإيجاب يبطل بما يدل على الإعراض**" (الدر مع الرد: ۴۶/۷، كتاب البيوع)، **وفي الهندية: "ومنها أن يكون الإيجاب والقبول في مجلس واحد، حتّٰى لو اختلف المجلس بأن كانا حاضرين، فأوجب أحدهما، فقام الآخر عن المجلس قبل القبول، أو اشتغل بعمل يوجب اختلاف المجلس لاينعقد**" (۲۶۹/۱، كتاب النكاح).

(۲) جی ہاں! لڑکی کی اجازت اور توکیل باقی رہے گی، اگر لڑکا دوبارہ ایجاب کرتا ہے تو لڑکی

کے وکیل کا قبول کرنا معتبر ہوگا؛ کیوں کہ لڑکی نے نکاح کا وکیل بنایا ہے؛ لہٰذا جب تک نکاح نہ ہوجائے وکالت باقی رہے گی، الا یہ کہ وہ لڑکی خود وکالت کو ختم کردے۔ ''وینعزل الوکیل بلا عزل بنهاية الشيء المؤكّل فيه كَأنْ وَكَّلَه بقبض دَينٍ فقبضه بنفسه، أو وكله بنكاح فزوجه الوكيل'' (الدر مع الرد)۔''وفي الشامي: قوله فزوجه الوكيل:أشار بهذا وبما قبله إلىٰ أن نهاية المؤكَّل فيه إما أن تكون من جهة الموكِّل أو من جهة الوكيل وينعزل الوكيل بها'' (الدر مع الرد: ۲۸۱/۸، باب عزل الوكيل).

(۳) نکاحِ صحیح میں جوطلاق ہے، نکاحِ فاسد میں اسی کو متارکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وفي مجموع النوازل: ''الطلاق في النكاح الفاسد يكون متاركةً'' (الفتاوى الهندية: ۳۳۰/۱، كتاب النكاح)۔ متارکت کے لیے اظہار ضروری ہے، ترکِ وطی کا عزم کافی نہیں؛ البتہ بعض حضرات نے غیر مدخول بہا سے متارکت کے لیے ترک وطی کے عزم کو بھی کافی قرار دیا ہے۔ ''والتفريق في النكاح الفاسد إما بتفريق القاضي أو بمتاركة الزوج .... ولا تتحقق المتاركة إلا بالقول إن كانت مدخولاً بها (كقوله: تركتكِ أو تركتُها) ...... أما في غير المدخول بها فيتحقق المتاركة بالقول وبالترك عند بعضهم ...... (وهو تركها على قصد أن لا يعود إليها)''(مجمع الأنهر: ۵۲۳/۱، دارالكتب العلمية: بيروت)۔

(۴) اگر وہ دونوں (لڑکا، لڑکی) بالغ ہوجانے کے بعد اس نکاح کی اجازت دے دیتے ہیں تو نکاح نافذ ہوجائے گا، نکاح کے نفاذ کے لیے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہوگی۔ وفي الخانية: ''إذا تزوج الصغير أوالصغيرة بغير إذن الولي فبلغا، لم يجز نكاحهما حتى يجيزا بعد البلوغ'' (فتاوی تاتارخانیہ: ۱۴/۳، ط: قدیمی کتب خانہ کراچی)۔

(۵) نکاح موقوف علی الاجازت میں مجیز کی اجازت بمعنی رضا کافی ہے، خواہ قول سے ہو، یا تحریر سے، یا عمل سے؛ جیسا کہ نکاحِ فضولی میں۔ قال في الدر: ''كنكاح الفضولي .... توقف عقوده كلها إن لها مجيز حالة العقد، قال الشامي: فسر المجيز في النهاية بقابلٍ يقبل الإيجاب سواء كان فضولياً أووكيلاً أو أصيلاً، وقال

فيها في فصل بيع الفضولي لو باع الصبى ...... أو تزوج ...... توقف علىٰ إجازة الولي فلو بلغ هو فأجاز نفذ ...... قال في الفتح: وهذا يوجب أن يفسر المجيز هنا بمن يقدر على إمضاء العقد لا بالقابل مطلقاً'' (الدر مع الرد: ۴/۲۲۵). وقال في الدر: ''فلو زوج الأبعد حال قيام الأقرب توقف على إجازته ...... قال الشامي: فلا يكون سكوته إجازةً لنكاح الأبعد وإن كان حاضراً في مجلس العقد مالم يرض صريحاً أو دلالةً ۴/۱۹۹. قال في الدر في نكاح الفضولى: فأجاز بالقول قال الشامي: كرضيت وقبلت....... وبالفعل كبعث المهر .... وكتقبيلها بشهوة وجماعها؛ لكن يكره تحريماً لقرب نفوذ العقد من المحرم قلت: فلو بعث المهر أولاً لم يكره التقبيل والجماع لحصول الإجازة قبله ...... ومنه الكتابة (الدر مع الرد: ۵/۶۷۲).

عبارات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ مثلِ نکاحِ فضولی، قول، عمل اور کتابت ہر طرح اجازت، بعد بلوغ صورتِ ہذا میں معتبر ہوگی؛ البتہ از دواجی رابطے سے اظہار قبولیت مکروہ ہے۔

(۵) اس صورت میں بھی اولیاء کا حق اعتراض ختم نہیں ہوگا، یا تو اپنی رضامندی صراحۃً یا دلالۃً ظاہر کردیں ورنہ تاوقتیکہ استقرار حمل نہ ہو، انھیں حق اعتراض باقی رہے گا۔ '' أما سكوت الولي عن المطالبة بالتفريق لا يكون رضاً وإن طال ذٰلك حتى تلد منه'' (خلاصة الفتاوى: ۲/۱۴). قال في البحر: " لايكون سكوت الولي رضاً ...... أطلقه فشمل ما إذا ولدت فله حق الفسخ بعد الولادة؛ كما في مبسوط شيخ الإسلام .... لكن قيده الشارحون بعدم الولادة، فلو ولدت فليس له حق الفسخ ...... وينبغي أن يكون الحبل الظاهر كالولادة، وشمل ما إذا طالت المدة كما في الخلاصة '' (البحر الرائق: ۳/۲۲۸). قال الشامي: ''مالم تلد منه لئلا يضيع الولد ـــ أي بالتفريق بين أبويه فإن بقاء هما مجتمعين على تربيته أحفظ له بلا شبهة ـــ وينبغي إلحاق الحبل الظاهر به '' (الدر مع الرد: ۴/۱۵۶).

(۷) کرایہ دار کا ہونا مشغول بتصرف الواہب سمجھا جائے گا، جو موہوب لہ کے لیے مالکانہ

تصرف سے مانع ہے؛ کیوں کہ کرایہ داری منتقل ہونے سے شئی موہوب پر من کل الوجوہ مالکانہ تصرف حاصل نہیں ہوتا جو کہ ہبہ کے محوز مفرغ ہونے کے منافی ہے۔ قال في الدر: ''وتصح بقبول... ....وتصح بقبض بلا إذنٍ في المجلس وبعده به والتمكّن من القبض كالقبض..... وتتم الهبة بالقبض الكامل ولو الموهوب شاغلاً لملك الواهب لا مشغولاً به ...... وفي الأشباه هبة المشغول لا تجوز''(الدر مع الرد: ۴۹۲/۸)۔

(۸) عصبہ کی تعریف فقہاء نے بالعموم یہ فرمائی ہے: ''وهو كل ذكر لم يدخل في نسبته إلى الميت أنثى'' اگر ترجمہ اس طرح کیا جائے تو اشکال رفع ہو جائے گا، ہر وہ مرد ہے جس کی میت سے قرابت میں صرف عورت (۱) واسطہ نہ ہو یا ہر وہ مرد جس کا ذکر کرنے میں صرف عورت کا واسطہ نہ پڑے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند یکم/محرم الحرام/۱۴۳۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

مسلم خاتون کے لیے غیر مسلم سے شادی کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں

سوال: «۵۳» ایک غیر مسلم سے شادی کر کے میں نے بہت بھاری غلطی کی ہے، تاہم وہ مجھے روزانہ کی نماز، ذکر اور دیگر اسلامی ضروریات سے نہیں روکتا ہے، ہمارے لیے اس نے ایک

(۱) مثلاً: حقیقی بھائی، اس کا میت سے تعلق ماں اور باپ دونوں کے واسطے سے ہے؛ لہٰذا یہ عصبہ ہوگا اور اخیافی بھائی یہ عصبہ نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس کا میت سے تعلق صرف ماں (مؤنث) کے واسطے سے ہے، تو فقہاء کی تعریف: ''كل ذكر لم يدخل في نسبته إلى الميت أنثى'' میں علامہ شامی نے لفظ ''فقط'' کا اضافہ کر دیا، جس سے سارے اشکالات رفع ہو گئے۔ قال العلامة الشامي: أما الأخ لأب وأم فإنه عصبة بنفسه مع أن الأم داخلة في نسبتة وأجيب بأنّ المراد من لا ينتسب بالأنثىٰ فقط (الدر مع الرد: ۵۱۷/۱۰)، اسی لیے مذکورہ جواب میں صرف کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔

الگ گھر بھی خریدا ہے؛ تا کہ مجھے اس کے والدین کے ساتھ نہ رہنا پڑے؛ چونکہ اس کے والدین غیر مسلم ہیں اور وہ جانتا ہے کہ مذہب پر عمل کرنے میں مجھے دقت پیش آئے گی؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود اس پر عمل نہیں کر رہا ہے، کیا کوئی دعا، وظیفہ ہے؛ جسے پڑھ کر اس کو اسلام کی طرف مائل کروں؟ میں چاہتی ہوں کہ وہ اچھا باعمل مسلمان بن جائے، میں مایوس ہوں؛ اس لیے کہ میں نہیں چاہتی ہوں کہ وہ جہنم میں جائے، میں جانتی ہوں کہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کے لیے دعا کرنے میں روزانہ تہجد میں اٹھتی ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کروں؟ میں ہمیشہ اللہ سے دعا کرتی ہوں اور روتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ معاف کر دیتا ہے، چاہے ہمارا گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ بشرطیکہ ہم توبہ کریں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے، آن لائن مجھے جو کوئی دعا عمل ملتا ہے یا کوئی اس بارے میں بتاتا ہے تو میں اسے کرتی ہوں۔ براہِ کرم میری رہنمائی فرمائیں۔

(۵۸۲/د ۱۴۳۲)

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی غیر مسلم کی ہدایت وایمان کی دعا کرنا، اس کے ایمان کے لیے محنت کرنا اور دل وجان سے خواہش مند ہونا، کہ یہ اسلام قبول کر لے؛ تا کہ جہنم کے دائمی عذاب سے محفوظ ہو سکے بہت اچھی بات ہے؛ بلکہ تمام ہی غیر مسلموں کے لیے ہدایت وایمان کی دعا کرنی چاہیے اور اپنی حد تک انھیں اچھی باتیں بتلاتے رہنا، ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کے معنی سمجھاتے رہنا چاہیے، نیز قول کے ساتھ اپنے عمل سے بھی انھیں دعوتِ ایمان دینی چاہیے، اس معنی کر آپ بھی اللہ تعالیٰ کے رو برو رو کر دعائیں کر سکتی ہیں، اللہ کی مرضی ہوگی تو اسے ہدایت دیدیں گے، لیکن اگر اسے ایمان کی توفیق نہیں ہوتی تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے: اِنَّكَ لَاتَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءَ (سورۃ القصص: ۵٦). حضرت محمد ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے محمد ﷺ! آپ جسے چاہیں ہدایت پر نہیں لا سکتے، اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

لیکن یہاں ایک دوسرا اہم اور نازک معاملہ ہے؛ جس کی طرف آپ نے شاید توجہ نہیں دی، یا سوال میں اس کے ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، وہ یہ کہ غیر مسلم کے ساتھ شادی کرنا اور ازدواجی تعلق قائم کرنا کیسا ہے؟ اور خود آپ کے حق میں اس کا برا انجام کیا ہوگا؟ اس میں اسلامی

قانون کی کیسی خلاف ورزی پائی جاتی ہے؟ نیز اس کا نتیجہ آخرت میں کیا سامنے آئے گا، ان باتوں کو سوچے بغیر آپ نے نکاح کا اقدام کرلیا؟ قرآن پاک کا صاف اور کھلا حکم یہ ہے: ''وَلَاتُنْكِحُوْا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا'' (سورۃ البقرۃ: ۲۲۱) مشرک مردوں سے نکاح مت کرو، تاوقتیکہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں، معلوم ہوا کہ صدق دل سے اسلام قبول کرنے سے پہلے، کسی غیر مسلم کا نکاح مسلمان خاتون کے ساتھ جائز نہیں، نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا، ازدواجی تعلق حرام کاری کے زمرہ میں داخل ہوتا ہے، ایمان جیسی قیمتی دولت کو جنسی خواہش کے بھینٹ چڑھا دینا اور غیر مسلم کی ہمہ وقت کی صحبت ومعیت اختیار کرکے اپنے دین وایمان کو خطرہ میں ڈالنا کس قدر سنگین جرم ہے، کہ ایسی بدکاری کی حالت میں نفس ایمان کا سلامت رہ جانا بھی دشوار ہے، اسی حالت میں موت آجانے کی صورت میں آخرت میں جو انجام ہوگا، اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، ایک مسلمان بندی اپنے خالق ومالک کے روبرو کس طرح کھڑی ہوگی اور اپنے اعمال وایمان کا کیا جواب اس کے پاس ہوگا؟ حضرت محمد ﷺ جن کے طفیل ہمیں دین وایمان کی دولت ملی، انھوں نے ایک ایک امتی کے لیے کیسی کیسی دعائیں کیں، مسلمان بندی ان کو کیا منھ دکھائے گی؟ اپنے دین وایمان کو غارت کرنے کا کیا جواز وہ پیش کرسکے گی؟ ان باتوں کو آپ سوچیں، ان شاء اللہ ایمان کی چنگاری میں سوزش اور گرمی پیدا ہوگی، اسی سوزشِ دل کے ساتھ اللہ کے سامنے روئیں، پچھلے گناہوں کی معافی مانگیں اور ہمتِ ایمانی سے کام لے کر پہلے نمبر پر آپ اپنے دین وایمان کو درست کرنے اور جنسی تعلق کو حلال وپاکیزہ بنانے کی فکر کریں؛ جس کا متعین طریقہ آپ کے حق میں یہ ہے کہ اس غیر مسلم سے آپ ازدواجی تعلق فوراً منقطع کرلیں، اپنی رہائش کا علاحدہ بندوبست کریں: ''وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا. وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (سورۃ الطلاق: ۲-۳) جو اللہ کا ڈر دل میں پیدا کرتا (اور حرام کام سے بچتا ہے) اللہ تعالیٰ تنگیوں سے نکلنے کے راستے اس کے لیے کھول دیتے ہیں اور اسے ایسے طریقے پر رزق عطا فرماتے ہیں، جس کا اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ کے لیے سب سے اہم اور ضروری فرض یہی ہے کہ بلا شرط اور بلا کسی تاویل کے غیر مسلم سے تعلق منقطع کرلیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں، اس کی رحمتوں سے ناامید نہ ہوں، آپ کے اس اقدام کے نتیجے میں غیر مسلم کی طرف سے کسی قسم کی وعدوعید کی بات آتی ہے، تو اسے لکھ کر پھر حکم معلوم کرلیں؛ لیکن فی

الوقت بالکلیہ تعلق کے انقطاع میں ادنیٰ تامل اور تاخیر کو ہرگز روا نہ رکھیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/۶/۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیان دار الافتاء دارالعلوم دیوبند

والدین کی مخالفت کے باوجود نومسلم سے نکاح کا حکم

السلام علیکم ....

سوال: ﴿۵۴﴾ میں ایک سوفٹ ویر انجینئر ہوں اور انڈیا میں کام کر رہا ہوں، یہ نوکری کرنے سے پہلے میں بہت مذہبی تھا اور بہت ہی پابندی سے نماز پڑھتا تھا، میری پریشانی یہ ہے کہ، میں ایک ہندو لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہوں، میرے تمام اہل خانہ ہماری شادی کے خلاف ہیں؛ لیکن لڑکی مسلمان ہو چکی ہے اور اس نے مندر میں بتوں کی پوجا کرنی بھی چھوڑ دی ہے، میں کیا کروں؟ میں نے اس کے ساتھ بہت سارے گناہ بھی کیے ہیں اور میں اس پر نادم بھی ہوں، مجھے بتائیں کہ میں اپنا ایمان کیسے مضبوط کر سکتا ہوں؟ (۶۶۷/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

ہندو لڑکی مسلمان ہو چکی ہے اور آپ کو اس کے ایمان و اسلام پر پورا اطمینان ہے کہ صدق دل سے اس نے اسلام قبول کیا ہے، تو اگرچہ اس سے نکاح کرنے کی شرعاً گنجائش ہے؛ یعنی نکاح کرلیں گے تو نکاح درست ہو جائے گا؛ لیکن آپ کے والدین اگر آپ کے دینی یا دنیوی، مالی، یا ایمانی ضرر کے پیش نظر منع کر رہے ہیں، تو والدین کا کہنا ماننا، آپ کے ذمہ لازم ہوگا اور اگر کسی قسم کے دینی یا دنیوی نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو بھی بہتر ہے کہ آپ والدین کا کہنا مانیں، ایسے موقعہ پر ان کی اطاعت مستحب ہے؛ لیکن پھر بھی اگر آپ نکاح والدین کی مرضی کے خلاف کر لیتے ہیں تو نکاح درست ہو جائے گا؛ مگر پہلی صورت یعنی اگر دینی یا دنیوی ضرر کے اندیشے کے پیش نظر والدین منع کرتے ہوں، تو ترک اطاعت کا گناہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴/ ۵/ ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ

شوہر اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں

سوال: ﴿۵۵﴾ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ چار میں سے تین مذہب کا فیصلہ یہ ہے کہ بیوی کو گھریلو کام کرنا، نیز بچوں کی ضروری دیکھ بھال کرنا (دودھ پلانا، کپڑے پہنانا، نہلانا، ڈائپر وغیرہ تبدیل کرنا) ضروری نہیں؛ بلکہ یہ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ نوکرانی رکھے یا یہ سب کام خود ہی کرے، بیوی کو ان معاملات میں شوہر کی اطاعت کرنا ضروری نہیں ہے، اس بارے میں قرآن وحدیث کے مطابق صحیح حکم کیا ہے؟

کیا یہ سب شوہر پر واجب ہے یا سنت؟ اس صورت میں کیا حکم ہے، اگر کوئی نوکرانی دستیاب نہ ہو یا وسعت نہ ہو؟ کیا شوہر کو یہ سب خود کرنا چاہیے؟ کیا یہ ہمیشہ شوہر کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے کپڑے، بستر دھوئے، اس کے کمرے، ٹوائلٹ کو صاف کرے اور اس کے لیے کھانا پکائے، جب ضروری ہو؟

ان سب میں سے کتنا بیوی پر واجب ہے، اس کے ماں ہونے کے ناطے اور گھر کی نگہبان ہونے کے ناطے؟ یہ اس کے بھی بچے ہیں، وہ کمرے میں رہتی ہے، بیت الخلاء کو استعمال کرتی ہے، بستر پر سوتی ہے، برتن میں کھانا کھاتی ہے؟ کیا ان ضروری کاموں میں حصہ بٹانا (اور بچہ کی دیکھ ریکھ کرنا) شوہر کے ساتھ اس پر ضروری ہے یا مستحب ہے؟ کیا شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کا تعاون کیا جائے؟ والسلام (۲۰۶۲/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

دین اسلام نے عورت اور مرد کے حقوق متعین کرنے میں جس درجہ عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا ہے، اس کی نظیر دوسرے ادیان میں نہیں ملتی، دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جاسکتی تھی، وہ اسلام نے قائم کردی ہے؛ لیکن اسلام اُس مساوات کا قطعاً قائل نہیں ہے، جو قانونِ فطرت اور دینِ شریعت کے خلاف ہو، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے ہیں ویسے ہی عورت کے بھی ہیں: ’’وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ‘‘ (بقرۃ:۲۲۸) ترجمہ: اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے، دستور کے موافق۔ تاہم مرد کو عورت پر فضیلت حاصل

ہے، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (السابق) ترجمہ: اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے، چنانچہ عورت اور مرد میں فاضل ومفضول کا فطری تعلق تسلیم کر کے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسبِ ذیل طریقہ پر کی ہے۔

خاندان میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے؛ یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے، اخلاق و معاملات کا نگراں ہے، اس کے بیوی و بچوں پر اس کی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے)، اور مرد پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمے داری ہے: الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ علی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ. (مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس فضیلت کی بناء پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے اور اس بناء پر کہ وہ ان پر مہر ونفقہ کی صورت میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں) نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''الرجل راع علی أهله وهو مسئول (۱)، ترجمہ: مرد اپنے بیوی بچوں کا نگراں ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل کے سلسلے میں وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اسی طرح دینِ اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے؛ یعنی کسبِ مال کی ذمے داری اگر شوہر پر ہے تو اس مال سے گھر کا انتظام وانصرام عورت کی ذمے داری ہے۔ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''المرأة راعية علی أهل بيت زوجها وهي مسئولة'' (۲)، ترجمہ: عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور وہی اپنی نگرانی میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔

اس مدلل تمہید کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نان ونفقہ، کسبِ معاش اور گھر سے باہر کی ذمے داری مرد پر اور اندرونِ خانہ امور کی انجام دہی، عورت کے ذمے ہے، آپ ﷺ نے بھی حضرت ''فاطمہ'' رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بعد حضرت ''علی'' رضی اللہ عنہ اور حضرت ''فاطمہ'' رضی اللہ عنہا کے مابین تقسیمِ کار اس طرح فرمایا تھا: حكم النبي ــ صلى الله عليه وسلّم ــ بين ''علي بن أبي طالب'' وبين زوجته ''فاطمة''، حين اشتكيا إليه الخدمة، فحكم على ''علي'' بالخدمة الظاهرة وحكم على ''فاطمة'' بالخدمة الباطنة ــ خدمة البيت ــ وقال ابن

(۱) البخاری، کتاب النکاح، رقم: ۱۳۸ے.

(۲) البخاری، کتاب النکاح، رقم: ۱۳۸ے۱.

حبیب: الخدمة الباطنة: العجین، والطبخ، والفرش، وکنس البیت، واستقاء الماء، وعمل البیت کله (من معین الشمائل: ۴۷)، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانا بنانے، گھر کی صفائی ستھرائی اور دوسرے گھریلو کام، حضرت فاطمہؓ کے ذمے تھے اور باہری کام حضرت علیؓ کے ذمے تھے؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام گھریلو کام عورت کے سر ڈال کر اس کا بالکل تعاون نہ کیا جائے؛ بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس کا تعاون کیا جائے، جیسا کہ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی: **عن الأسود قال: سألت عائشة: ما کان النبي ــ صلی اللّٰه علیه وسلّم ــ یصنع في بیته؟ قالت: کان في مهنة أهله؛تعني خدمة أهله**(۱). یعنی آپ ﷺ اپنے گھر والوں کے کام میں ہوتے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ عورت کے کیے ہوئے کام پر تعریفی جملے کہے جائیں، اس کا شکریہ ادا کیا جائے، اس کو گھریلو کام کا مثلِ نوکرانی ذمے دار نہ سمجھا جائے؛ بلکہ اس کو اس کی طرف سے احسان وتبرع تصور کیا جائے، اور عورت کی خاندانی حیثیت کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ اگر عورت ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے کہ اس کے یہاں کھانا وغیرہ نوکرانیاں بناتی ہیں، یا کسی معقول عذر کی بناء پر عورت انکار کرتی ہے، تو شوہر اس کے لیے کھانے وغیرہ کا انتظام کرائے اور اگر عورت کا خاندانی معیار اس قدر بلند نہیں؛ بلکہ اس کے یہاں گھر کی عورتیں ہی کھانا بناتی ہیں، جیسا کہ عموماً متوسط گھرانوں میں ہوتا ہے، تو کھانا عورت کو ہی بنانا چاہیے۔ شامی میں ہے: **امتنعت المرأة من الطحن والخبز إن کانت ممن لا تخدم أو کان بها علة، فعلیه أن یأتیها بطعام مهیَّأ وإلا بأن کانت ممن تخدم نفسها، وتقدر علی ذٰلك لا یجب علیه ولا یجوز لها أخذ الأجر ة علی ذلك لوجوبه علیها دیانةً ولو شریفةً**. (الدر مع الرد: ۲۹۰/۵،۲۹۱، ط: زکریا)، ترجمہ: اگر عورت آٹا پیسنے اور پکانے سے انکار کرے اور وہ ان عورتوں میں سے ہو، جو خود کام نہیں کرتیں، یا اس کو کوئی عذر ہے، تو شوہر اس کے لیے تیار شدہ کھانے کا انتظام کرے اور اگر وہ ان عورتوں میں سے ہو، جو خود ہی کام کرتی ہیں اور وہ اس کام پر قادر بھی ہے، تو شوہر پر تیار شدہ کھانے کا انتظام واجب نہیں، نیز بیوی کے لیے اس کام پر اجرت لینا بھی جائز نہیں، دیانۃً اس پر اس کام کے واجب ہونے کی وجہ سے اگرچہ وہ شریف خاندان کی ہو۔

(۱) البخاری، باب من کان في حاجة أهله، رقم: ٦٧٦.

واضح رہے کہ دینِ اسلام نے عورت کو ایسے تمام فرائض سے بھی سبکدوش کر دیا ہے جو بیرونِ خانہ کے امور سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً: اس پر نمازِ جمعہ واجب نہیں، عیدین واجب نہیں، جہاد فرض نہیں، جنازوں میں شرکت ضروری نہیں، کسبِ معاش واجب نہیں، اور خود اپنا نان ونفقہ، اسی طرح اولاد کا نان ونفقہ واجب نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ قانونِ اسلامی میں عورت کے لیے پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے، جیسا کہ آیتِ کریمہ ''وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ '' کا صاف منشا ہے؛ اس لیے عورت کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ گھر کی ملکہ ونگراں اور خانگی نظام میں شریک وسہیم ہونے کی حیثیت سے گھریلو کام کو بحسن وخوبی انجام دے، البتہ مثلِ خادمہ ونوکرانی کے اس پر واجب نہیں کہ پورے خاندان (نند، دیور، جیٹھ وغیرہ) کی خدمت کرے، ان کے کپڑے دھوئے اور ان کی دوسری ضروریات کو پورا کرے؛ تاہم وہ شوہر کی خوشنودی، رضائے الٰہی اور تعاونِ باہمی کے تحت ساس، سسر کا کام اور ان کی خدمت کرے، تو یہ اس کی خوش اخلاقی اور اس کی طرف سے احسان تصور کیا جائے، جس پر دوسری جانب سے اس کی دل جوئی اور قدر شناسی بھی ہونی چاہیے اور اس کے مساوی تبرع اور حسنِ سلوک کا معاملہ ہونا چاہیے، البتہ شوہر کی خدمت، اپنے نابالغ بچوں کی پرورش ودیکھ ریکھ، سامان ومکان کی نگرانی، صفائی ستھرائی اور دوسرے گھریلو کام دیانۃً، وشرافۃً اور اخلاقاً اس کے ذمے ہیں؛ کیوں کہ اگر مرد ان تمام کاموں میں مصروف ہوگا تو گھریلو کام کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ'' (القرآن) پر عمل کرنا بڑا مشکل ہوگا، تو یہ تو ہوسکتا ہے کہ مرد اپنا ذاتی کام خود کرے اور کرنا بھی چاہیے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کیا کرتے تھے، اسی طرح عورت کو بھی اپنا ذاتی کام خود کرنا چاہیے؛ البتہ مرد پر عورت کے کپڑے دھونا، اس کے کمرے وٹوائلٹ کی صفائی کرنا اور اس کے لیے کھانا بنانا قطعاً واجب نہیں، ہاں بیماری آزاری میں ضرورت پڑ جائے تو اخلاقاً انجام دینا حق رفاقت کا تقاضہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ وہ گھریلو کام، جو عموماً عورتوں کے ذمے ہوا کرتے ہیں یا عورتیں کرتی ہیں، عورت کو بحیثیت عورت کے انھیں انجام دینے چاہیے، اس پر واجب ہے، جیسا کہ حضرت ''فاطمہ'' رضی اللہ عنہا نے باوجود امام الانبیاء کی صاحب زادی ہونے اور دنیا کی افضل ترین خاتون ہونے کے تمام گھریلو کام کیے۔ **فجعل (النبيّ ـ صلّى الله عليه وسلّم ـ) أعمال الخارج على**

"علي" رضي الله عنه، والدّاخل على "فاطمة" رضي الله عنها مع أنها سيدة نساء العٰلمين. (الدر مع الرد: ۲۹۱/۵)، نیز جس طرح شوہر باہر کے واجب اور غیر واجب ہر طرح کے کام کرتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی اندرونی کام کو انجام دینا چاہیے؛ کیونکہ واجب وغیر واجب میں زیادہ تفریق خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے منافی ہے۔"لوجوبه عليها ديانةً ولو شريفةً" البتہ اگر وہ انکار کرتی ہے یا اس کو کوئی عذر معقول ہے، تو اس پر جبر نہ کیا جائے: ولكنها لا تجبر عليها إن أبت. (الدر مع الرد: ۲۹۲/۵) لیکن بلا عذر عورت کے انکار کی صورت میں شوہر کے لیے بھی جائز ہوگا کہ حقوقِ غیر واجبہ(۱) سے دست کشی کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/محرم الحرام ۳۳ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

شادی میں مہر کیوں دیا جاتا ہے؟

ایک غیر مسلم کے سوال کا جواب

سوال: ﴿۵۶﴾ السلام علیکم

ایک غیر مسلم نے سوال کیا کہ لڑکی کو مہر کیوں دیا جاتا ہے؟ اس کا سب سے اچھا جواب کیا ہے؟

رفیع بنگلور (۱۸۷۴/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(الف) اس کا سب سے اچھا اور بے غبار جواب یہ ہے کہ، ہم اپنے خالق و مالک کے احکام کے پابند ہیں، اس نے جس طرح ہمیں عبادت کا طریقہ بتلایا، جس کے مطابق ہم عبادت کرتے ہیں؛ اسی طرح معاملات، معاشرت، نکاح وطلاق کے احکام بھی بتلائے، جن کی ہم پابندی کرتے ہیں،

(۱) مثلاً عورت کے بیمار ہونے کے وقت دوا وغیرہ کا انتظام کرنا، ڈاکٹر کی اجرت ادا کرنا، تفکہاً کھانے پینے کا سامان لاکر دینا وغیرہ وغیرہ .... لاالدواء للمرض ولا أجرة الطبيب ولاالفصّاد ولا الحجام ... . فكل من الدواء والتفكه لا يلزمه (الدّر مع الرّد: ۲۹۱/۵، باب النفقة)

نکاح کے سلسلے میں اس نے حکم دیا کہ محرمات کے علاوہ بقیہ عورتوں سے تم نکاح کر سکتے ہو اور جس سے نکاح کرواسے بہ طورِ مہر ایک رقم بھی ادا کرو، جیسا کہ أُحِلَّ لَكُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ، الآية: (ترجمہ) (محرمات کے علاوہ) باقی عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں، بہ شرطیکہ تم ان کو طلب کرواپنے مال کے بدلے (النساء: ۲۴) میں اس کی صراحت ہے، ہم اس پر عمل کرتے ہیں، حاصل یہ ہوا کہ ہمارے خالق و مالک کا حکم ہے؛ اس لیے ہم مہر ادا کرتے ہیں۔

(ب) اللہ تعالیٰ کے ہر ہر حکم میں بے شمار حکمتیں ہیں، ان حکمتوں کی جستجو کرنا نہ ہمارا کام ہے نہ منصب، جب کہ ملکی قانون جس کے بنانے میں ہمارا یا ہم جیسے لوگوں کا بڑا دخل ہے، ان میں سے چند کی حکمتیں بھی ہم نہیں جانتے، اور نہ ہر ہر قانون کی وجہ، اور حکمت تلاش کرنے کی فکر میں پڑتے ہیں، پھر قانونِ الٰہی کی وجہ، اور حکمت تلاش کرنا ہمیں کیسے زیب دے گا؟ اور خاص طور پر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کو کما حقہ خالق و مالک بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اگر مسلمان کو کسی عالم سے کسی حکمِ شرعی کی کوئی حکمت معلوم بھی ہو جائے تو اسے بھی ہر کس و ناکس کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ اگر آپ نے کسی ایسے شخص سے حکمت اور وجہ بتلا دی تو یہ اپنی ناقص عقل سے فوراً اسے فیل یا پاس کرنے کی کوشش کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے قوانین اس سے برتر اور اعلیٰ ہیں، تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۱۱/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

ایک جواب دو جواب تین جواب سے کتنی طلاق پڑے گی؟

دو متضاد فتووں کے درمیان محاکمہ

سوال: ﴿۵۷﴾ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے جواب میں: کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ سے حالتِ غصہ میں کہا: ''ایک جواب دو جواب تین جواب''، اس

صورت میں زید کی بیوی پر کتنی طلاق واقع ہوئی ؟

استفتاء مذکور کے جواب میں ایک مفتی صاحب نے کہا ہے کہ: ''طلاقِ بائن واقع ہوئی، تین طلاق واقع نہیں ہوئی؛ کیوں کہ خاوند مذکور کے ایک جواب کہنے سے جب اس کی زوجہ پر طلاق بائن واقع ہوگئی اور وہ شوہر پر حرام ہوگئی اس کی بیوی نہیں رہی، تو پھر وہ محل طلاق بھی نہیں رہی؛ لہٰذا دو جواب اور تین جواب لغو قرار پائیں گے'' نیز انہوں نے شامی وغیرہ کی اس عبارت سے بھی استدلال کیا ہے''**لایلحق البائن البائن**''.

دوسرے مفتی صاحب نے کہا ہے کہ: ''تینوں طلاق واقع ہونگی'' اور انہوں نے شامی:۲/۴۷۱ کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے: **إذا أمكن جعله خبراً عن الأوّل** اور جب دوسری بائن کو خبر بنانا ممکن نہ ہو تو انشاءِ جدید پر محمول ہوگا اور بائن بائن کے ساتھ لاحق ہوگا **فعلم أنّ قولهم "إذا أمكن" إحتراز عما لم يُمْكِنُ جعله خبراً كما أبنتك بأخرىٰ** اور کہا ہے کہ تین جواب کو ایک جواب کی خبر اور تاکید نہیں بنا سکتے، تو لامحالہ انشاء پر محمول ہوگا اور اس پر محمول کرنے کی صورت میں تین طلاق واقع ہوگی۔

تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ صورت مستفسرہ میں زید کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہوگی یا تین؟ دونوں حضرات میں کس کا قول واستدلال صحیح ہے؟ کیا ''مطلقہ مذکورہ'' بدون حلالہ شرعیہ کے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی؟ جواب باصواب مع عبارات فقہیہ عنایت فرمادیں۔

محمد شمشیر احمد المظاہری

خادم الحدیث النبوی والقضاء دار العلوم لطفی کٹیہار (بہار) ۱۴۲۹/۲/۸ھ (۲۸۵/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

دوسرے مفتی صاحب کی بات درست ہے چونکہ دوسری اور تیسری مرتبہ جواب کہنے میں قائل نے دو اور تین کا عدد شامل کردیا ہے؛ اس لیے ''دو جواب'' ''تین جواب'' کا جملہ انشاء پر محمول ہوگا، خبر قرار دینا درست نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دار العلوم دیوبند ۱۹/صفر/۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلندشہری

باسمہٖ تعالیٰ:

گرامی قدر عالی جناب حضرت مولانا ومفتی زین الاسلام صاحب مدظلہ... مفتی دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ مزاجِ اقدس بعافیت ہو.................................

عرض ہے کہ استفتاء ''ایک جواب دو جواب تین جواب'' میں مقامی دو مفتیوں نے دو مختلف فتویٰ دیا تھا، ان میں سے ایک نے طلاق بائن اور دوسرے نے تین طلاق کے وقوع کا اور دونوں حضرات نے جو کچھ استدلال کیا تھا، ان کے استدلال کے ساتھ استفتاء لکھ کر اس کی ایک کاپی ''دار الافتاء مظاہر علوم سہارن پور'' اور ایک کاپی ''دار الافتاء دار العلوم دیوبند'' ارسال کی گئی تھی، آپ نے چند مصححین حضرات کی تصحیح کے ساتھ جواب دیا ہے، کہ دوسرے مفتی صاحب کی بات درست ہے، یعنی تین طلاق واقع ہوگی؛ جب کہ'' دار الافتاء مظاہر علوم'' سے جواب آیا ہے کہ طلاق بائن واقع ہوگی؛ یعنی اول مفتی صاحب کا جواب صحیح ہے، جب مرکزی دونوں دار الافتاء کے جواب میں اس نوع کا تعارض ہوگا تو پھر دفعِ تعارض کی کیا صورت ہوگی؟

(۱) نیز جب ایک جواب سے ایک طلاق، دو جواب سے دو طلاق کل ملا کر تین طلاق واقع ہوگئی؛ جیسا کہ شامی میں ہے: **قوله أنتِ طالق لا، بل ثنتين إليٰ قوله يقع ثلث** تو پھر تین جواب کے جملہ کو انشاءِ جدید پر محمول کرنا کس طرح صحیح ہوگا؟ کیا عدد طلاق تین سے بھی زیادہ ہے؟

دار الافتاء مظاہر علوم (۱) اور دار الافتاء دار العلوم دیوبند کے فتوی کی فوٹو اسٹیٹ کاپی سوال کے

---

(۱) الجواب حامداً و مصلياً:

صورتِ مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگی؛ کیوں کہ سوال میں مذکور لفظ عرفاً کنایہ ہے طلاق سے اور چونکہ حالتِ غضب ہے اس لیے نیت کی بھی ضرورت نہیں اور تین واقع نہ ہوئی؛ کیوں کہ درمختار میں موجود ہے: **لايلحق البائن البائن (قوله لا يلحق البائن البائن)المراد بالبائن الذي لا يلحق هو ما كان بلفظ الكناية الخ** (الدر مع الرد: ۲/ ۴۷۰) جب تین طلاق واقع نہیں ہوئی تو پھر حلالہ کی ضرورت نہیں، نکاح کافی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

حررہ العبد شعیب احمد بستوی غفرلہ ۲۹/۲/۲۷ھ

الجواب صحیح: محمد طاہر عفا اللہ عنہ، مقصود احمد مظاہر علوم سہار نپور ۲۹/۲/۲۷

ساتھ منسلک ہے امید ہے کہ دفع تعارض کرتے ہوئے تشفی بخش مدلل جواب دے کر خاوند مذکور کی پریشانی کو دور فرمائیں گے۔

کتبہ محمد شمشیر احمد المظاہری

خادم الحدیث النبوی والقضاء دار العلوم لطفی کٹہار (بہار) (۴۳۱/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

جب خبر قرار دینا ممکن نہ ہو تو انشاء پر محمول ہوگا؛ یعنی تیسرا کلمہ انشاء کا جملہ ہوگا گو مفیدِ زیادتی عددِ طلاق نہ ہو۔

اصل مسئلہ کی توضیح یہ ہے کہ اگر آپ کے یہاں عرف میں ''جواب'' کا لفظ طلاق کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے اور جواب بول کر طلاق مراد لی جاتی ہے، تب تو یہ الفاظ، صریح طلاق کے حکم میں ہو کر وقوعِ طلاق ثلاث کو متضمن ہوں گے، جیسا کہ صاحب احسن الفتاوی نے اس کو صریح کہا ہے (ان کے یہاں عرف میں) (۱۹۲/۵ احسن الفتاوی)۔

اور اگر طلاق کی جگہ پر یہ لفظ نہیں بولا جاتا ہے، تو طلاق سے کنایہ ہو کر بسببِ حالتِ غصہ بدون احتیاج الی نیۃ الزوج، طلاق بائنہ کے وقوع کا حکم اس پر عائد ہوگا اور آگے ''دو جواب'' ''تین جواب'' کے الفاظ کو انشاءِ جدید پر محمول کیا جائے گا؛ کیوں کہ جواب کا لفظ عدد کے ساتھ مقرون ہے، اگر بدونِ عدد کے ہوتا تو خبر قرار دیا جانا ممکن ہوتا اور تاکید پر محمول ہو کر **البائن لا یلحق البائن** کے ضابطہ کے تحت داخل ہو جاتا، جس کی وجہ، سے ایک بائنہ سے زاید طلاق کا حکم نہ لگایا جاتا؛ مگر عدد کے ساتھ مقرون ہونے کی وجہ، سے انشاءِ جدید پر محمول ہو کر، مزید دو طلاق بائنہ کے وقوع کا موجب ہوگا اور مجموعہ طلاق ثلاث کے وقوع کا حکم لگ جائے گا۔ علامہ شامی فرماتے ہیں: **إن الوقوع إنما هو بلفظ صالح له وهو أخرىٰ** (الدر مع الرد: ۵۴۴/۴)۔ **قال في الدر: بخلاف أبنتك بأخرىٰ أي لو أبانها أولاً، ثمّ قال في العدة أبنتك بأخرىٰ وقع؛ لأنّ لفظ "أخرىٰ" مناف لإمكان الإخبار بالثّاني عن الأوّل** (۵۴۵/۴)۔ صورتِ مسئولہ میں دو جواب تین جواب کے الفاظ میں دو تین کے کلمات اخبار عن الاول کے منافی ہیں۔ **قال في "الدرر" كما نقله الشامي أقول وهذا يدل قطعاًعلىٰ أنّه إذا أبانها، ثمّ قال في العدة أنت طالق ثلاثاً**

يقع الثلاث؛ لأنّ الحرمة الغليظة إذا ثبتت بمجرد النية بلا ذكر الثلاث، لعدم ثبوتها في المحل، فلأن تثبت إذا صرح بالثلاث أولی (۵۴۶/۴).

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تین طلاق کے وقوع کا فتویٰ جو یہاں سے دیا گیا ہے وہی ہمارے نزدیک درست وصحیح ہے۔ رہا اقوال وفتاویٰ میں تعارض تو یہ کوئی عیب نہیں ہے، سنتِ قدیمہ ہے **کما لا يخفى وفوق كل ذي علم عليم** اپنے یہاں کے اربابِ افتاء سے مشورہ کرلیں وہ جس فتوے کو راجح سمجھیں اس پر عمل کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/۳/۲۹ھ

الجواب صحیح: محمود حسن بلندشہری غفرلہ

ایک مجلس کی تین طلاق سے تین ہی طلاق پڑے گی

سوال: ﴿۶۰﴾ دریافت طلب امر یہ ہے کہ، اگر کسی نے ایک مجلس ہی میں ایک ساتھ تین طلاق دی ہے، تو کتنی واقع ہوگی؟ کیا ''حنفیہ'' کے علاوہ دیگر مذاہبِ ثلاثہ میں سے کسی میں اس سے ایک طلاق ہوتی ہے؟ ڈاکٹر ''ذاکر نائک'' ایک طلاق کا فتویٰ دیتے ہیں، اسی طرح علامہ ''ابن تیمیہ'' کی رائے بھی یہی تھی۔ ازراہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔ والسلام

انیس الرحمٰن دھوبڑی (آسام) (۳۸۱/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب واللہ الموفق للصواب:

تین طلاق ایک مجلس میں ایک ساتھ دی گئی ہوں یا علحدہ علحدہ؛ بہرحال تین ہی واقع ہوتی ہیں، حنفیہ کے نزدیک بھی اور بقیہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی، ائمہ اربعہ رحمہم اللہ اس پر متفق ہیں کسی کا اختلاف نہیں ہے (۱) اور یہ بات کتاب وسنت، اجماعِ امت اور قیاس، چاروں شرعی دلیلوں سے ثابت ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ**

(۱) ذهب جماهير العلماء من التابعين ومن بعدهم منهم: الأوزاعي والنخعي والثوري وأبو حنيفة والشافعي وأصحابه وأحمد وأصحابه .... علىٰ أن من طلّق امرأته ثلاثاً وقعن ولكنه يأثم (عمدة القاري: ۲۳۳/۲۰، كتاب الطّلاق، باب من أجاز الطلاق الثلاث، ط: امين بيروت).

تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ. (سورۂ بقرہ:۲۲۹)،طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو روک لینا ہے معروف طریقے سے یا آزاد کر دینا ہے اچھے طریقے سے۔ گویا دو طلاقوں کے بعد مرد کو دو اختیار ہیں، اگر وہ اس کو پھر بھی بیوی بنانا چاہتا ہے، تو معروف طریقے سے روک لے (معروف طریقے کی تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے) اور اگر یہ نہ چاہے تو اسے جانے دے؛ لیکن اگر مرد نے تیسری طلاق دے دی، تو ارشاد باری تعالیٰ ہے:فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ . (سورۂ بقرہ:۲۳۰) کہ اگر تیسری طلاق بھی دے دی تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے خاوند سے نکاح کر لے۔ اس آیت پاک کی دلالت عام ہے ایک مجلس میں تین طلاقیں دے یا الگ الگ مجلسوں میں تین طلاقیں دے، ایک لفظ سے تین دے یا الگ الگ الفاظ سے تین دے بہر صورت تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

اور حدیث شریف میں ہے:**عن محمود بن لبيد رضي الله عنه قال:أخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم عن رجلٍ طلّق امرأته ثلاث تطليقاتٍ جميعاً، فقام غضباناً، ثمّ قال:أيلعب بكتاب الله وأنا بين أظهركم حتّىٰ قام رجلٌ وقال: يارسول الله! ألا أقتله؟** (۱)، اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ میں تین طلاقیں دینا، خدا تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کھیلنا اور آں حضرت ﷺ کو سخت ناراض کرنا ہے، اگر تین طلاقیں تین واقع نہ ہوتی تو آپ ﷺ اتنے ناراض نہ ہوتے اور اسے استہزاء بالکتاب نہ فرماتے؛ اس لیے کہ ایک طلاق پر آپ ﷺ نے ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا اور نہ اسے استہزاء بالکتاب قرار دیا ہے، اور جب آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ اس نے تین طلاق اکٹھی دی ہیں، تو آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے تین مت کہو؛ بلکہ آپ ﷺ نے تین طلاقوں کو تین ہی برقرار رکھا ہے اور اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور استہزاء بالکتاب قرار دیا ہے، جمہور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین، تبع تابعین نیز ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق تین ہی واقع ہوتی ہے (۲)؛ اسی طرح سعودی حکومت نے حرمین شریفین اور ملک کے دوسرے نامور

(۱) نسائي:۳۴۰۱، كتاب الطّلاق، باب الثّلاث المجموعة وما فيه من التغليظ.
(۲) راجع حاشيه: نمبر:۱

علماءکرام پر مشتمل ایک تحقیقاتی مجلس قائم کی تھی جن میں شیخ ''عبداللہ بن باز''، ''عبداللہ بن سلیمان بن منیع''، ''محمد بن عودہ عثمان الصالح'' اور دیگر علماء عرب بھی شریک تھے،اس کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش کیا گیااور قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ طے پایا کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں بھی تین ہی ہیں(۱) اور حضرت علامہ'' ابن تیمیہ'' رحمہ اللہ کی رائے (زیر بحث مسئلہ میں) قرآن وحدیث اور اجماعِ امت کے خلاف ہے،جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے،اور رہے ڈاکٹر''ذاکر نائک'' تو فقہ وفتاویٰ ان کا میدان ہی نہیں اور نہ ہی ان کے پاس اس کی مطلوبہ لیاقت ہے، پھر جب کہ وہ قرآن وحدیث اور اجماعِ امت کی مخالفت کریں تو ان کی بات کیسے معتبر ہوگی۔(طلاق ثلاثہ) سے متعلق مزید تفصیل کے لیے ''**عمدة الأثاث فی الطلقات الثلاث**''کا مطالعہ مفید ہوگا(۲). فقط واللہ اعلم

نیز فتاوی رحیمیہ جلد:۸، خیر الفتاوی:۵،مطالعہ غیر مقلدیت جلد دوم اور احسن الفتاوی جلد:۵ میں بھی مسئلہ ہذا کو مدلل اور مفصل بیان کیا گیا ہے۔

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۲/۱۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ،محمود حسن غفرلہ بلند شہری،فخر الاسلام عفی عنہ

جبراً طلاق کی تحریر لکھوا کر پڑھوانے سے کیا طلاق ہو جائے گی؟

سوال:﴿۶۱﴾کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کی بابت کہ مولینا................ایک جگہ تقریر کے لیے گئے تھے،وہاں سے واپسی کے لیے اسٹیشن گئے اور وہاں پر وہ اکیلے تھے کچھ............ لوگوں نے منصوبہ بند طریقہ سے ان کو گھیر کر اور منہ پر ہاتھ رکھ کر،ان کو اپنی گاڑی میں ڈال کر، بہت دور اپنے کسی مقام پر لے گئے اور ان کو زدوکوب کیا،پھر ان سے زبردستی تحریر لکھوائی،جس کو وہ لوگ بولتے رہے اور مولینا موصوف نے اس کو لکھا؛جس میں یہ لکھوایا گیا کہ اگر میں نے اس واقعہ پر قانونی کارروائی کی یا اڑیسہ میں یا بنگال میں تقریر کرنے کے لیے آیا،تو میری بیوی کو تین طلاق ہو جائے گی

---

(۱) یہ رسالہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے نیز احسن الفتاوی میں بھی شامل ہے۔

(۲) عمدة الأثاث في الطّلقات الثلاث، مؤلفه حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب.

، پھر ان لوگوں نے اس آواز کو ریکارڈ کرلیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں اگر موصوف اڑیسہ، یا بنگال تقریر کرنے گئے یا وہ قانونی کارروائی کریں، تو کیا ان کی بیوی کو طلاق ہوگی؟

(مولانا) نذر محمد قاسمی مظفر نگر (۸۶۴/ب ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

زبردستی؛ یعنی جبر واکراہ کے ساتھ طلاق کی تحریر لکھنے سے شرعاً طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔ **قال الشامي وفي البحر: أنّ المراد الإكراه على التلفظ بالطّلاق فلو أكره على أن يكتب طَلاَقَ امرأته، فكتب لا تطلق** (الدر مع الرد: ۴/۴۴۰)، اسی طرح اپنی بیوی کو لکھی ہوئی طلاق کی تحریر پڑھنے سے بھی اس کی بیوی پر طلاق واقع نہ ہوگی؛ کیوں کہ تحریر پڑھنے میں طلاق کا قصد نہیں ہوتا ہے، صرف تحریر شدہ الفاظ کی حکایت اور نقل ہوتی ہے، طلاق دینے کا ہرگز ارادہ نہیں ہوتا؛ چنانچہ الاشباہ میں جزئیہ موجود ہے: **ولو كتبت "امرأتي طالق" أو أنتِ طالق وقالت له اقرأ على فقرأ عليها لم يقع عليها لعدم قصده باللفظ** (الأشباه والنظائر: ۹۱، النوع الأوّل، مطبوعه کراچی).

ان عبارات سے صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوئی کہ صورتِ مذکورہ میں، اگر مولانا موصوف "اڑیسہ" یا "بنگال" تقریر کرنے گئے یا کوئی قانونی کارروائی کی، تو اس سے ان کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۱ھ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ،
زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

یمین (تعلیق) مؤبد مع الإيلاء کی ایک شکل

سوال: ﴿۶۲﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بابت:

زید نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر ہم تمہارے جسم سے تعلق رکھیں گے، تو تم کو تینوں طلاق پڑ جائے گی ـــ تعلق سے مراد زید کی جماع ہے ـــ اگر تعلق رکھنے سے طلاق مغلظہ واقع ہوجائے گی اور بیوی بغیر حلالہ کے حلال نہ ہوگی، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ حلالہ سے بچنے کے لیے اگر

فقہاء کرام نے کوئی صورت ذکر فرمائی ہے، تو مفصل جواب عنایت فرما کر احسانِ عظیم فرمائیں۔

والسلام

نثار احمد بھاگلپوری دریاپور شاہ کنڈھ (۱۶۲۲/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ میں جسم سے تعلق رکھنے سے زید کی مراد جماع ہے، تو یہ جملہ یمین (۱) مؤبد کے ساتھ ساتھ ایلاء (۲) کو بھی متضمن ہوگا؛ لہٰذا اگر زید نے بیوی سے جماع کرلیا، تو مطابق یمین اس پر تین طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر جماع نہیں کیا، یہاں تک کہ وقت یمین سے چار ماہ گذر گئے تو بہ تقاضائے ایلاء اس پر ایک طلاق بائنہ واقع ہوجائے گی (۳) اور عورت بعد عدت آزاد ہوجائے گی، زید سے یا جس دوسرے مرد سے نکاح کرنا چاہے کرسکتی ہے؛ لیکن زید کے حق میں یمین سابق باقی ہے (۴)؛ لہٰذا اگر بعد نکاح زید ہمبستری کرتا ہے تو مطابق یمین بیوی پر تین طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر ہمبستری نہیں کرتا ہے تو بتقاضائے ایلاء، چار ماہ بعد عورت پھر بائنہ ہوجائے گی **هکذا إلیٰ أن یقع الثلاث** (۵) صورتِ مسئولہ میں زید کے لیے ایک مرتبہ اس منکوحہ سے جماع کرنے کے بعد دوبارہ جماع کی بدون حلالہ شرعیہ کوئی صورت نہیں ہے (۶). فقط واللہ اعلم

---

(۱) قال في الفتح: هو أن يصرح بلفظ الأبد أو يطلق فيقول لا أقربك (الدر مع الرد: ۵/۶۶).

(۲) الإيلاء: هو الحلف علیٰ ترك قربانها، والمولی هو الذي لا يمكنه قربان امرأته إلا بشيء مُشق يلزمه (الدر مع الرد: ۵/۵۸).

(۳) فإن قربها في المدة حنث ففی الحلف بالله وجبت الكفارة وفی غيره وجب الجزاء وسقط الإيلاء .... وإلّا يقربها بانت بواحدة بمضيّها. (الدر مع الرد: ۵/۶۵)

(۴) وسقط الحلف لو كان موقتاً لا لو كان مؤبداً (حوالہ بالا)۔

(۵) فلو نكحها ثانياً وثالثاً ومضت المدتان بلا فيء أي قربان، بانت بأخريين والمدة من وقت التزوج (حوالہ بالا)۔

(۶) اگر تین طلاق پڑنے کی صورت میں زوج آخر کے بعد نکاح کرے گا تو ایلاء کا اثر ختم ہوجائے گا۔ قال في الدر: فإن نكحها بعد زوج آخر لم تطلق لانتهاء هذا الملك...... وقال الشامي: ولو تزوّجها بعد زوج آخر في الإيلاء المؤبد لا يعود الإيلاء (الدر مع الرد: ۵/۶۶).

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۹/۲۹ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہ

بر بنائے شقاق فسخِ نکاح
اور دار القضاء ہریانہ کے ایک فیصلے کے چند تسامحات

مکرمی جناب مفتیان کرام!...السلام علیکم

سوال: ﴿۶۱﴾......(ا) بعد سلام گزارش ہے کہ میرا نکاح جون ۲۰۰۵ میں ''گل سینا بنت محمد علی شیر گرام بڑھی'' سے ہوا تھا، لڑکی دو بار میرے یہاں رہ کر گئی ہے، اس کے بعد ماں باپ نے لڑکی کو نہیں بھیجا؛ جس کی وجہ سے یہ مقدمہ دار القضاء میں چلا گیا، وہاں سے جو فیصلہ(۱) آیا ہے وہ یہ ہے کہ نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ کیا مذہبِ اسلام میں بغیر طلاق دئے نکاح ٹوٹ جاتا ہے یا یہ فیصلہ غلط ہے؟

---

(۱) بعدالت دار القضاء جنوبی دہلی (آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) مین بازار اوکھلا گاؤں جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
مقدمہ ۱۴/۴/۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء (متدائرہ دار القضاء ہریانہ، بوڑیہ)
گل سینا بنت علی شیر مقام بڑہی، ڈاکخانہ سبیل پور ضلع یمنا نگر مدعیہ
بنام
محمد سالم ولد محمد صدیق مقام طاہر پور ڈاکخانہ طاہر پور ضلع یمنا نگر مدعا علیہ
فیصلہ

مقدمہ ہذا بتاریخ ۲۹/۱۰/۱۴۳۱ھ مطابق ۹/۱۰/۲۰۱۰ء کو مدعیہ نے مدعا علیہ سے اپنا نکاح فسخ کرانے کے لیے دار القضاء ہریانہ، بوڑیہ میں دائر کرایا، مدعا علیہ نے اپنا بیان تحریری دار القضاء میں داخل کیا، اس کے بعد فریقین مع گواہان دار القضاء میں حاضر ہوئے، ان کے بیانات قلمبند کیے گئے اور تکمیل کی کارروائی کے بعد مسل قاضی شریعت صاحب کی رپورٹ کے ساتھ دار القضاء جنوبی دہلی پہنچی اور مسل میرے سامنے فیصلہ کے لیے پیش ہوئی۔

مدعیہ کی عرضی دعوی اور اس کے بیان عند القضاء کا خلاصہ یہ ہے کہ مدعیہ کی شادی محمد سالم (مدعا علیہ) سے ۲/ جون ۲۰۰۵ء کو ہوئی، اس کے بعد شادی میں رخصت ہو کر سسرال گئی اور ایک مہینہ وہاں رہی، وہاں میاں بیوی کے تعلقات ایک دن بھی خوشگوار نہیں رہے، شروع دن سے ہی مدعا علیہ کہنے لگا کہ تو میری پسند کی نہیں ہے، لنگڑی ہے، میں دوسری شادی کروں گا، میں نے ان باتوں کی اطلاع اس کے گھر والوں کو دی، انہوں نے =

= مدعا علیہ کو نہ سمجھایا اور نہ تنبیہ کی، اس نے ایک مرتبہ مجھے کسی بات پر تھپڑ مارا، پھر میں ایک مہینہ کے بعد میکہ چلی آئی، اور ایک سال تک یہیں رہی، اس ایک سال میں مدعا علیہ نے کچھ کھانے کا خرچ نہیں دیا، ایک سال کے بعد پنچایت ہوئی اور لوگوں کے کہنے پر میں رخصت ہو کر سسرال گئی، دو مہینے وہاں رہی، اس درمیان مدعا علیہ اپنا گھر چھوڑ کر ''مسر والا'' رہا، اس درمیان جو خرچ ہوا وہ ہمارے ماں باپ نے برداشت کیا، یہاں تک کہ انہوں نے اناج بھی پہنچایا، ان (مدعا علیہ) کا کہنا تھا کہ تو مجھ کو پسند نہیں ہے، لکڑی چن کر اپنا گزار کر، اس کے بعد میں اپنے گھر آ گئی تقریباً ساڑھے تین سال سے میں اپنے میکہ میں ہوں، اس درمیان اس نے کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں دیا، کماتا ہے، لیکن خرچ نہیں دیا، اور نہ مدعا علیہ اور نہ اس کے گھر والے کبھی رخصت کرانے کے لیے آئے، میرے والدین غریب ہیں میں ان پر بوجھ بنی ہوئی ہوں وہ میرا خرچ برداشت نہیں کر سکتے، میں جوان عمر ہوں میری عمر ۲۲/سال ہے، مجھے فتنہ کا شدید اندیشہ ہے وہ خرچ نہیں دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ پچاس ہزار روپے دو تو طلاق دوں گا ورنہ سامان بھی نہیں دوں گا اور نہ طلاق دوں گا، میرا نکاح مدعا علیہ سے فسخ کر دیا جائے، تاکہ میں اپنی دوسری شادی کر کے عافیت کی زندگی گزار سکوں، اس درمیان مدعا علیہ نے دوسری شادی کر لی اور اس کے بچے بھی ہو گئے۔

مدعا علیہ کے بیان تحریری اور اس کے بیان عند القضاء کا خلاصہ یہ ہے کہ مدعا علیہ کی شادی ''گل سینا'' سے ہوئی، شادی کے بعد رخصت ہو کر میرے یہاں آئی ایک مہینہ میں، میں نے اس کو لنگڑی نہیں کہا، اس کے لنگڑی ہونے کا مجھے پہلے سے علم تھا، اگر اس پر مجھے اعتراض ہوتا تو شادی سے پہلے ہی ہو جاتا، وہ رخصت ہو کر گئی تو آٹھ دس مہینہ اپنے ماں کے یہاں رہی، پھر میرے یہاں دو مہینے رہی اس وقت میں نے دوسری شادی کو سوچا بھی نہیں تھا، میرے گھر والوں کو کس بات کی اطلاع دی جب کوئی بات نہیں ہوئی اور نہیں تھپڑ مارا، یہ سراسر جھوٹ ہے، مجھ پر الزام لگایا گیا ہے، اس درمیان کوئی پنچایت نہیں ہوئی، میری شادی دونوں بار کی رخصت کے موقع کی درخواست وحاضری رجسٹر مسر والا سے معلوم کر سکتے ہیں کہ بندہ گھر پر رہا یا مدرسہ میں؟ اس درمیان کا خرچ میرے گھر والوں نے اور میں نے خود برداشت کیا ہے، میں سسرال جاتا تھا تو خرچ دے کر آتا تھا، اس ساڑھے تین سال کے عرصہ میں میں اور میری ماں کئی بار گئی جب کوئی راستہ نہیں دیا تب پہلے نمبر پر ۴/آدمی اس کے یہاں گئے (یامین ولد سادھو، یاسین ولد جمالو، برکت ولد سردار، شکورا سرپنچ طاہر پور کلاں) دوسری بار پھر ان کو خبر کرنے کے بعد پنچایت میں ۲۰/آدمی گئے، اس وقت وہ اپنا گھر چھوڑ کر گھر سے چلے گئے تھے، سب آدمی شام تک انتظار کر کے واپس لوٹ گئے، اس کے بعد پھر پنچایت کی تاریخ رکھی اور پھر ۲۰/۲۵/آدمی پنچایت میں گئے، پنچایت ہوئی، اس میں احقر بھی موجود تھا، پنچایت والوں نے میرے سے معافی بھی منگوائی، میں نے معافی مانگی، پھر بھی انہوں نے بھیجنے سے انکار کر دیا، کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، گاؤں کے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم زبردستی اٹھا کر بھیج دیں اس سے ہم نے جواب دے دیا، میں نے ان کا تین سال انتظار کرنے کے بعد دسمبر ۲۰۰۹ء میں شادی کی ہے اور بچہ بھی ہے، میں نے اس کو تنہائی کی زندگی جینے پر مجبور نہیں کیا، اگر اس کو فتنے کا ڈر ہے، وہ =

= اب بھی اپنے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے، تو میں ابھی بھی لانے، ساتھ رکھنے، خرچ دینے کے لیے تیار ہوں؛ لیکن میرے یہاں آئے تب، میں دونوں بیویوں کو برابر کا حق دوں گا۔

فریقین اس پر متفق ہیں کہ ان کا نکاح ہوا، نکاح کے بعد مدعیہ مدعا علیہ کے یہاں رخصت ہو کر گئی، تو وہ مدعا علیہ کے یہاں ایک مہینہ رہی پھر وہ اپنے میکہ چلی گئی اور تقریباً ایک سال کے بعد وہ مدعا علیہ کے یہاں رخصت ہو کر آئی اور وہ دو مہینے سسرال میں رہی، ساڑھے تین سال سے مسلسل اپنے میکہ میں ہے، مدعا علیہ نے دوسری شادی کر لی ہے اور اس کے یہاں بچہ بھی ہے۔

یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ مدعیہ کو اس کے میکہ میں رہنے کے دوران مدعا علیہ نے نفقہ دیا ہے یا نہیں؟ اور وہ اس عرصہ میں مدعا علیہ سے نفقہ پانے کی مستحق بھی ہے یا نہیں؟

مدعا علیہ کا کہنا ہے کہ میں سسرال جاتا تھا تو خرچ دے کر آتا تھا، اور مدعیہ کا کہنا ہے کہ ساڑھے تین سال سے اپنے میکہ میں ہوں، اس درمیان مدعا علیہ نے کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں دیا، کماتا ہے؛ لیکن خرچ نہیں دیا، فریقین نے جو چار گواہ پیش کیے ہیں، ان میں سے کسی نے یہ بیان نہیں کیا ہے کہ مدعا علیہ نے مدعیہ کو اس کے میکہ میں رہتے ہوئے خرچ دیا ہے، اس کے برخلاف سلیم ولد دنو، یاسین ولد جمال الدین اور شکورا ولد فتح دین یہ تینوں گواہ اس پر متفق ہیں کہ تین سال سے مدعا علیہ نے مدعیہ کو کوئی خرچ نہیں دیا ہے۔

مدعا علیہ کا دعویٰ ہے کہ اس ساڑھے تین سال کے عرصہ میں، وہ اور اس کی ماں کئی بار مدعیہ کو رخصت کرانے گئے، وہ نہیں آئی، تو پہلے نمبر پر چار آدمی اس کے یہاں گئے، دوسری بار تقریباً بیس آدمی گئے، اس کے بعد بیس پچیس آدمی گئے، پنچایت ہوئی، پنچایت والوں نے میرے سے معافی منگوائی، میں نے معافی مانگی اس کے بعد بھی انہوں نے بھیجنے سے انکار کر دیا، مدعیہ نے مدعا علیہ کے اس دعوی سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ تقریبا ساڑھے تین سال سے میں اپنے میکہ میں ہوں اس درمیان نہ مدعا علیہ اور نہ اس کے گھر والے کبھی رخصت کرانے کے لیے آئے، اس سلسلہ میں ''سلیم ولد دنو'' کا بیان ہے کہ دو چار لوگ لڑکی کے یہاں اکٹھے ہوئے تو لڑکے کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اپنے ماما کو ساتھ لے کر آؤ تو ہم لڑکی کو رخصت کریں گے، مدعا علیہ نہ اپنے ماما کو لایا اور نہ رخصت ہو کر گئی۔

گواہ ''عالم دین ولد کالا خاں'' کا بیان ہے کہ لڑکے کا ماما شادی کرانے کا ذمہ دار تھا، اس نے بیچ میں پڑ کر رخصتی کرادی، پھر آپس میں اختلاف ہو گیا، لڑکا (مدعا علیہ) یہ کہتا تھا کہ تو میری پسند کی نہیں ہے، میں تجھ کو رکھنا نہیں چاہتا، اس کے بعد لڑکے کے ماما کو بلایا گیا کہ بولو کیسے کریں، تو اس نے کہا کہ میں نے لڑکے کو سمجھایا؛ لیکن وہ میرے قابو میں نہیں ہے، اگر وہ خود تیار ہو تو بھیج دو؛ ورنہ میرے کہنے سے باہر ہے، پھر اس کے بعد لڑکا آیا تو لڑکی والوں نے کہا کہ جب تک تیرا ماما نہیں آئے گا تب تک ہم لڑکی نہیں بھیجتے، مدعا علیہ کا ماما نہیں گیا تو لڑکی نہیں گئی۔

گواہ ''یاسین'' کا بیان ہے کہ مدعا علیہ کی شادی مینا (مدعیہ) سے چار سال پہلے ہوئی، شادی کے بعد =

....

= دومرتبہ پنچایت ہوئی، پنچایت میں یہ بات ہوئی کہ جو غلطی ہوئی لڑکے سے وہ معافی مانگے، لڑکے نے معافی مانگی، پنچایت میں یہ بات آئی کہ لڑکا کہتا ہے کہ تو (مدعیہ) کالی ہے میں آپ کو رکھنا نہیں چاہتا، تو لنگڑی ہے، لوگوں کے کہنے سے مدعا علیہ نے معافی مانگی؛ لیکن لڑکی رخصت ہوکر نہیں آئی، لڑکا اپنی بیوی کو رخصت کرانے کو تیار ہے، اگر لڑکا پریشان کرے تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں۔

اور گواہ ''شکورا'' کا بیان ہے کہ مدعا علیہ کی شادی مدعیہ سے ہوئی، ہم لوگوں نے کوشش کی کہ رخصتی ہوجائے؛ لیکن لڑکی والوں نے رخصتی نہیں کی، ایک مرتبہ اکیلا گیا ایک مرتبہ بیس پچیس آدمی لے کر گیے، پنچایت میں ہم لوگوں نے منت بھی کی، ذمہ داری بھی لی جب اس (مدعا علیہ) پر اس بات کا الزام لگایا گیا کہ، تو نے لڑکی کو کالی یا لنگڑی کہا تو اس نے اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے معافی مانگ لی۔

چاروں گواہ اس بات پر متفق ہیں کہ مدعا علیہ نے مدعیہ کی رخصتی کا مطالبہ کیا اور وہ مدعیہ کو رخصت کرانے کے لیے گیا، لیکن مدعیہ رخصت ہوکر نہیں آئی، مؤخر الذکر دو گواہ اس پر بھی متفق ہیں کہ فریقین کے معاملہ میں پنچایت ہوئی اور مدعا علیہ نے معافی مانگی اور انہوں نے مدعا علیہ کی ذمہ داری بھی لی۔

اگر شوہر بیوی کی رخصتی کا مطالبہ کرے اور وہ رخصت ہوکر جانے سے منع کردے تو اس کے لیے نفقہ نہیں ہوتا ہے؛ اس لیے کہ تسلیم نفس کے واجب ہونے کی حالت میں تسلیم نفس معدوم ہے۔ (جو نفقہ واجب ہونے کی شرط ہے)۔ جب نفقہ واجب ہونے کی شرط نہیں پائی گئی تو نفقہ واجب نہیں ہوگا؛ اسی لیے ناشزہ کا نفقہ واجب نہیں ہوتا اور یہ ناشزہ ہے؛ چنانچہ ''بدائع الصنائع''میں ہے: **فإن طالبها بالنقلة فامتنعت ...... فلانفقة لها لانعدام التسليم حال وجو ب التسليم فلم يوجد شرط الو جوب فلا تجب ،ولهذا لم تجب النفقة للناشزة وهذه ناشزة . (بدائع الصنائع: ۴/۱۹)**

اصطلاحِ شرع میں ''ناشزہ'' اس بیوی کو کہا جاتا ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے نکل جانے والی اور شوہر سے اپنے آپ کو روکنے والی ہو ''**لا تجب النفقة للناشزة .... وهي في الشرع كما قال الإمام الخصاف: الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه. (البحر الرائق: ۴/۱۷۹)**،

شوہر کے گھر سے نکلنے سے مراد بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مکان کے علاوہ، کسی اور مکان میں ہونا ہے؛ تا کہ ابتداءً اس کے مکان میں آنے سے منع کرنے اور اس کے پاس منتقل ہونے کے بعد اس کے مکان سے نکل جانے کو شامل ہوجائے ''**والمراد بالخروج كونها في غير منزله بغير إذنه ليشمل ما إذاامتنعت عن المجيء إلى منزله ابتداءً .... وما إذا خرجت من منزله بعد الانتقال إليه (البحر الرّائق: ۴/۱۷۹)**'' پس جب مدعا علیہ نے مدعیہ کی رخصتی کا مطالبہ کیا اور وہ اسے رخصت کرانے کے لیے گیا، اس کی ذمہ داری لینے کی بات بھی پیش کی گئی؛ لیکن وہ رخصت ہوکر نہیں آئی تو وہ ناشزہ ہوئی اور وہ مدعا علیہ سے نفقہ پانے کی مستحق نہیں رہی۔

اگر بالفرض اس کا نفقہ مدعا علیہ پر واجب تھا جو اس نے ادا نہیں کیا، پھر بھی مدعا علیہ کے اسے نفقہ نہ دینے =

....

= کی وجہ سے اس کا نکاح مدعا علیہ سے بوجہ عدم انفاق فسخ نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے کہ مدعا علیہ اس کا خرچ اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے تیار ہے؛ کیوں کہ اگر شوہر اپنی بیوی کا نفقہ ادا نہ کرے تو اسے حکم دیا جاتا ہے کہ نفقہ دے یا طلاق دے، اس کے بعد بھی اگر شوہر نفقہ نہ دے تو حاکم بغیر انتظار کے اس کی بیوی پر طلاق واقع کر دے، جیسا کہ درج ذیل عبارت میں مذکور ہے: ''**المتعنت الممتنع عن الانفاق ففي مجموع الأمير ما نصه: إن منعها نفقة الحال فلها القيام فإن لم يثبت عسره أنفق أو طلق وإلا طلق عليه قال محشيه قوله وإلا طلق أي طلق عليه الحاكم من غير تلوم (الحيلة الناجزة: ۱۴۳**، اور **كتاب الفسخ والتفريق :۸۹)**

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ مدعیہ ساڑھے تین سال سے مسلسل اپنے میکہ میں ہے، مدعا علیہ اسے رخصت کرانے کے لیے گیا تو اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے ماما کو بلا کر لائے، اسے لائے بغیر مدعیہ کو رخصت نہیں کیا جائے گا اس سلسلہ میں پنچایت ہوئی، پنچایت میں مدعا علیہ نے معافی مانگی، اس کی طرف سے اس کے گاؤں کے سرپنچ ''شکورا'' اور اس کے ماموں زاد بھائی ''یاسین'' نے ذمہ داری بھی لی؛ لیکن مدعیہ کی رخصتی عمل میں نہیں آئی، ان حالات سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ فریقین کے مابین شقاق اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ اس کے دور ہونے کی امید نہیں ہے ان کے مابین اللہ تعالی کا حکم معاشرت بالمعروف فوت اور امساک بالمعروف متعذر ہو چکا ہے، وہ حدود اللہ پر قائم نہیں ہیں، ان کے مابین اصلاح حال کی کوشش بھی ناکام ہو چکی ہے، خود مدعا علیہ اس کے آنے سے مایوس ہو چکا ہے اس مایوسی کی وجہ سے اس نے دوسری شادی کی ہے، جیسا کہ اس کے بیان سے واضح ہے ''میں نے ان کا تین سال انتظار کرنے کے بعد دسمبر ۲۰۰۹ء میں شادی کی ہے'' آئندہ بھی ان کا حدود اللہ کو قائم رکھتے ہوئے، ازدواجی زندگی گزارنا ممکن نظر نہیں آرہا ہے، جب امساک بالمعروف فوت ہو جائے تو شوہر کی ذمہ داری تسریح بالاحسان ہے، اگر شوہر اس سے گریز کرے تو قاضی شوہر کے قائم مقام ہو کر زوجین کے مابین تفریق کر دے، مزید وضاحت کے لیے مجموعہ قوانین اسلامی کی درج ذیل دفعہ ۸۲ اور اس کی تشریح نقل کی جاتی ہے۔

(دفعہ ۸۲)

اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو جائے کہ دونوں کا اللہ کے حدود کو قائم رکھتے ہوئے، ازدواجی زندگی گزارنا ممکن نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں:

(الف) قاضی حکمین مقرر کرے گا تا کہ اصلاح کی صورت نکل سکے۔

(ب) اگر تحکیم کے باوجود اصلاحِ حال یا باہمی رضامندی سے علیحدگی کی کوئی صورت نہیں نکل سکے، تو قاضی بر بنائے شقاق، زوجہ کے مطالبہ کی صورت میں تفریق کر دے گا۔

(تشریح)

اگر زوجین میں اختلاف وشقاق پیدا ہو جائے؛ یعنی کسی وجہ سے زوجین کے درمیان ایسی شدید نفرت =

(۲) دوسری بات: لڑکی کے پاس ہمارے تقریباً ایک لاکھ کے زیورات ہیں، نکاح ٹوٹ جانے کے بعد یہ واپس کرنا چاہیے یا نہیں؟ کیوں کہ دار القضاء نے خالی نکاح فسخ کر دیا، نہ ہی ہمارے

= پیدا ہو جائے کہ حسنِ معاشرت کی گنجائش باقی نہ رہے اور اللہ کے حدود پر قائم رہنا مشکل ہو جائے تو ایسی صورت میں ابتداءً اصلاح کی کوشش کی جائے گی اور اس کے لیے حکمین مقرر کیے جائیں گے، حکمین کی کوشش ہوگی کہ یہ منافرت دور ہو جائے یا دونوں کی رضامندی سے علیحدگی ہو جائے؛ لیکن اگر اس کوشش میں بھی ناکامی ہو تو قاضی کے ذریعہ تفریق کر دی جائے گی، واضح رہے کہ اللہ تعالی کا حکم معاشرت بالمعروف کا ہے، اس کے لیے دونوں طرف سے محبت ضروری ہے، معاشرت بالمعروف کے امکانات اس وقت ختم ہو جائیں گے جب زوجین ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں یا زوجین میں سے ایک نفرت کرنے لگے تو بھی شقاق قرار دیا جائے گا، کہ دونوں کی رضا، معاشرت بالمعروف کے لیے ضروری ہے، اور ایک کی طرف سے بھی رضا کا فقدان معاشرت بالمعروف کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے، پس دونوں ہی ایک دوسرے سے نفرت کریں یا کسی بھی وجہ سے عورت شدید نفرت میں مبتلا ہو تو قاضی کو چاہیے کہ حکمین مقرر کرے، جو اصلاح حال کی صورت نکالیں اور اگر باوجود ان کوششوں کے اصلاح حال ممکن نہ ہو اور نکاح اپنے مقاصد سے خالی ہو جائے یعنی امساک بالمعروف سخت دشوار ہو جائے تو شوہر کی ذمہ داری تسریح بالاحسان ہے؛ لیکن اگر شوہر اس سے گریز کرے تو قاضی نیابۃً عن الزوج تفریق کر دے گا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ۲۰۱، ۲۰۲)

بہر حال مندرجہ بالا بیانات و بحث سے عند القضاء یہ ثابت ہے کہ فریقین کا نکاح ہوا، مدعیہ ساڑھے تین سال سے مسلسل اپنے میکہ میں ہے اس عرصہ میں مدعا علیہ نے اسے نفقہ نہیں دیا ہے عدم انفاق کی وجہ سے اس کا نکاح مدعا علیہ سے فسخ نہیں کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ وہ ناشزہ ہونے کی وجہ سے مستحق نفقہ نہیں ہے اور مدعا علیہ اس کا نفقہ دینے اور اس کے حقوق ادا کرنے کے لیے تیار ہے، ان کے مابین شدید نفرت و شقاق موجود ہے، پنچایت وغیرہ کے ذریعہ اصلاح حال کی کوششیں بھی کامیاب نہیں ہو سکی، امساک بالمعروف متعذر اور معاشرت بالمعروف فوت ہو چکا ہے اور مدعا علیہ نے تسریح بالاحسان پر بھی عمل نہیں کیا ہے، مدعیہ ضرر و حرج میں مبتلا ہے وہ جوان عمر ہے فتنہ کا زمانہ ہے، تجرد کی زندگی گزارنے میں اس کے معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، ضرر کو رفع اور حرج کو دفع کرنا، نیز فتنہ کا دروازہ بند کرنا فرائض قضاء میں داخل ہے؛ لہٰذا مندرجہ بالا بیانات و بحث کی روشنی میں میں درج ذیل حکم دیتا ہوں۔

(حکم)

میں نے مدعیہ ''گل سینا بنت علی شیر'' کا عقد نکاح مدعا علیہ ''محمد سالم ولد محمد صدیق'' سے بربنائے شقاق وتعذر امساک بالمعروف دفعاً للحرج ورفعاً للضرر، سداً لباب الفتن فسخ کر دیا، اب مدعیہ مدعا علیہ کی بیوی نہیں رہی، وہ عدت گزار کر اپنے نفس کی مجاز ہے۔

محمد ریاض ارمان القاسمی ۴/۴/۱۴۳۲ھ (قاضی شریعت)

زیورات لوٹانے کا حکم دیا اور نہ ہی جو لڑکی کے باپ نے ہم سے پیسے لے رکھے ہیں، وہ واپس کرنے کے لیے کہا، کیا یہ فیصلہ صحیح ہے؟

(۳) اس فائل کے مطابق یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟ اس میں کوئی کمزوری اگر ہے اور ایسے نکاح نہ ٹوٹتا ہو، تو تفصیل دے کر احقر پر احسان فرمائیں۔ شکریہ

محمد سالم ولد صدیق احمد

گرام و پوسٹ: طاہر پور کلاں تحصیل دچھرولی

ضلع یمنا نگر ہریانہ۔ پن نمبر (۱۳۵۱۰۳)

بسم الرحمٰن الرحیم ....

الجواب وباللہ التوفیق: حامدا ومصلیا ومسلما: (۱) فقہ حنفی کے مطابق شقاق کی وجہ سے زوج کی رضامندی کے بغیر، اگر چہ فسخ نکاح نہیں ہوسکتا؛ لیکن امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک کسی بھی طرح نباہ نہ ہونے، نیز شوہر کے طلاق پر عدمِ آمادگی کی صورت میں، شوہر کی اجازت کے بغیر بھی طلاق واقع کی جاسکتی ہے، چنانچہ ''**کتاب الفسخ والتفریق**'' مولفہ حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانیؒ اور ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' مرتّبہ مسلم پرسنل لاء بورڈ میں، اسی مذہبِ مالکی کے مطابق حنفی قاضی کو بھی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے؛ لیکن بہر حال حنفی قاضی کو امام مالک کے مسلک کی شرائط وتفصیلات کی پابندی اور انھیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے (۱) وہ شرائط وتفصیلات ''**کتاب الفسخ والتفریق**''، میں کسی قدر تفصیل سے مذکور ہیں، نیز ''مجموعہ قوانین اسلامی'' میں بھی بعض شرطوں کا اجمالاً ذکر ہے۔

جہاں تک منسلکہ (مقدمہ گل سینا بنت علی شیر، یمنا نگر بنام ''محمد سالم ولد محمد صدیق'' یمنا نگر، دائر کردہ دار القضاء ہریانہ (مسلم پرسنل لاء بورڈ) فیصل کردہ بتاریخ ۴/۴/۱۴۳۲ھ مطابق ۱۰/۳/۲۰۱۱ء)

(۱) بہر حال زن وشوہر کے شقاق کی صورت میں، جب عورت قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کرلے اور جائز شکایت کی بناپر، شوہر سے تنگ آکر تفریق کا مطالبہ کرے، تو حنفی قاضی معاملہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر ان ابتدائی کارروائی کے بعد، جن کا ذکر امام رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے تحت تیرہویں بنیاد میں ہو چکا ہے یا اختیار حکمین کے ذریعہ شقاق کے معاملہ کو، ان کی تفصیل کے مطابق ختم کرادے اور حکمین کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو اچھی طرح سمجھادے۔ (کتاب الفسخ والتفریق از مولانا عبدالصمد رحمانیؒ: ۱۵۶ ط: مکتبہ امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ)۔

فیصلے کی بات ہے تو، اس کی پوری مسل ہمارے سامنے نہیں ہے، مقدمے کی کارروائی اور فیصلے کی جو تفصیلات آپ نے بھیجی ہیں، ان میں بہ ظاہر کچھ خامیاں ہیں۔ اس لیے کہ بعض ضروری امور (مثلاً قاضی کی طرف سے ابتداءً اصلاحِ حال کی کوشش، جس کا ذکر "کتاب الفسخ و التفریق" میں ہے، قاضی کا دو حکموں کو مقرر کرنا، پھر حکمین کی طرف سے مصالحت کی سعی اور سعی کی ناکامی کی صورت میں، عورت کی طرف سے مطالبۂ تفریق، جس کا ذکر مجموعۂ قوانین اسلامی میں بھی ہے) کا (منسلکہ کاغذات میں) کوئی ذکر نہیں ہے؛ اس لیے جب تک یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو جائے کہ شرائط کی تکمیل ہوئی یا نہیں ہوئی، ہم فیصلے کی صحت وعدمِ صحت سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے؛ لہٰذا آپ فیصلہ ہٰذا کا مرافعہ، عالی قدر صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ حضرت مولانا ''محمد رابع حسنی ندوی'' صاحب، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کی خدمت میں کریں، اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو مرکزی دارالقضاء، کو فیصلۂ مذکور پر نظرِ ثانی کی ہدایت فرما دیں گے۔

(۲،۳) اگر آپ نے وہ زیورات اور پیسے اپنی بیوی کو، بہ طور ہدیہ یا مہر کے بدلے میں دیے تھے، تو یہ چیزیں اس لڑکی کی ہو گئیں، نکاح فسخ ہو یا نہ ہو، بہرصورت یہ چیزیں واپس نہیں لی جاسکتیں، ہاں اگر زیورات یا پیسے دیتے وقت کچھ اور کہہ کر دیا تھا اور اس پر شرعی گواہ بھی ہوں تو اس کی وضاحت کی جائے؛ البتہ اگر خلع کے وقت معافیٔ مہر یا اس جیسی کوئی مالی شرط لگادی جاتی، تو اس کے مطابق عمل ہوتا۔

لڑکی کے باپ نے جو پیسے لیے اس کی کیا نوعیت تھی؟ کیوں پیسہ لیا تھا؟ سائل نے یہ واضح نہیں کیا؛ اس لیے یہ جزء قابلِ تنقیح تھا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۲/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام، قار علی غفرلہ،

احد الزوجین کے مسلمان ہونے کی صورت میں وراثت اور بچوں کی حضانت کا مسئلہ

حضرت مفتی صاحب! .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

سوال: ﴿۶۲﴾ ہم لوگ ''ملیشیا'' میں ایک اسلامی تنظیم میں کام کر رہے ہیں، ہم لوگوں کا مقصد

غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان دعوت کا کام کرنا اور اسلام کے تئیں لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے۔

حالیہ کچھ دنوں سے کچھ اسلامی قوانین کے پہلوؤں پر ایک بڑا تنازع چل رہا ہے، غیر مسلم تنظیمیں جیسے ''بارکونس'' اور دیگر ہندو اور عیسائی تنظیمیں اس تنازع کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

متنازعہ مسائل یہ ہیں:

(۱) جب کوئی غیر مسلم جو گھر کا ہیڈ ہو (شوہر، باپ) اسلام قبول کرلے اور اس کی بیوی، بچے اپنے پرانے مذہب پر برقرار رہیں، تو اس کی بیوی اور بچے انسانی حقوق کی بنیاد پر اس کے تمام مالی تعاون پر جائز دعوی کر سکتے ہیں، اور اس کے ریٹائر ہونے پر اس کی پنشن اور دیگر مالی منافع (بخشش وغیرہ) اس کے اثاثے اور اس کی جائداد پر بھی اس کی بیوی اور بچے دعوی کر سکتے ہیں، اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

(۲) گھر کے ہیڈ کے اسلام قبول کرنے کے بعد، اس کی بیوی اسلام قبول کرنے سے منع کرتی ہے، اس پر وہ اپنے چھوٹے بچوں کو اپنے ہاں رکھ لیتا ہے اور ان کو مسلمان بناتا ہے، بیوی اپنے شوہر کے خلاف عدالت میں یہ اپیل کرتے ہوئے مقدمہ دائر کرتی ہے کہ، شوہر کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے؛ چونکہ مجھے بھی اپنے بچوں پر حق حاصل ہے، تمام غیر مسلم تنظیمیں قبولیت اسلام کو چیلنج کرنے کی وجہ سے اس کی حمایت کر رہی ہیں۔

کیا باپ کا اپنے بچوں کو مسلمان بنانا جائز ہے؟ کیا ماں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق ہے؟ ان کے مطابق انسانی حقوق کی بنیاد پر بیوی کو بھی اپنے بچوں کے مذہب کے سلسلے میں فیصلہ کرنے کا یکساں حق حاصل ہے، مذہب اسلام اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟

(۳) غیر مسلم گھرانے میں ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے؛ لیکن کچھ وجوہات کی بناء پر وہ اپنے اسلام کے بارے میں اپنے افرادِ خانہ کو نہیں بتاتا ہے مثلاً: اپنی فیملی اور اپنے احباب کی طرف سے نفرت کے خوف سے یا عدم تحفظ کی وجہ سے؛ لیکن جب اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے افرادِ خانہ اپنے رسم و رواج کے مطابق دفن کرنا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف اسلامی تنظیم جس نے اسے مسلمان بنایا، مداخلت کرتے ہوئے نعش پر اپنا دعوی پیش کرتی ہے، اس سے ایک بڑا تنازع پیدا ہو جاتا ہے اور معاملہ کورٹ تک جا سکتا ہے، کیا نومسلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تبدیلیٔ مذہب

کے بارے میں اپنے افرادِ خانہ کو بتادے؟

(۴) غیر مسلمین اور کچھ مسلمانوں کا یہ اعتراض: ''اسلام کہتا ہے کہ جنگ میں معصوم لوگوں مثلاً: عورت، بچے، بوڑھے اور عام شہریوں کو قتل نہ کیا جائے؛ لیکن آج کل مسلمانوں کے ذریعہ اپنے دشمنوں پر ہورہے حملوں جیسے: خودکش بمباری، گاڑیوں میں آتش گیر مادوں سے دھماکے، توپ وغیرہ کے ذریعہ حملے، اس سے زیادہ تر معصوم لوگ ہی شکار ہوتے ہیں، کیا یہ غلط نہیں ہے؟

میں نے اپنی تھوڑی بہت معلومات کے مطابق جواب دیا: ''جنگ کی تکنیک اب بدل گئی ہے، آپ ﷺ کے زمانہ میں اور اب سے کچھ صدی قبل تک شہر سے بہت دور کھلے میدان میں جنگ لڑی جاتی تھی اور یہ جنگ صرف فوجوں کے درمیان ہی ہوتی تھی؛ اس لیے کوئی شہری نہیں مارا جاتا تھا، فاتح افواج کو معصوم لوگوں کو قتل کرنے اور شہر میں داخل ہونے پر لوگوں کو لوٹنے سے منع کیا جاتا تھا؛ لیکن اب جنگ کی صورت یکسر بدل گئی ہے، یہ شہروں میں ہونے لگی ہے، مسلم فوجوں کو تلاش کرنے کے نام پر آبادی والے شہری علاقوں میں آسمان سے گولہ باری اور بمباری کی جارہی ہے، جس کا عام شہری شکار ہوتے ہیں، ''عراق''، ''افغانستان'' اور ''فلسطین'' میں ''امریکہ'' اور اس کے اتحادیوں کی اندھادھند بمباری سے، سینکڑوں ہزاروں شہری ہلاک ہوگئے، مسلمان اپنے تحفظ اور دفاع میں کوئی متبادل راہ نہ پاکر، اپنے دشمنوں کو ٹارگیٹ بناتے ہیں، جو شہریوں کے درمیان میں رہتے ہیں؛ لہٰذا معصوم شہریوں کا شکار ہونا ناگزیر ہے''۔

مگر سوال کرنے والے اس بات پر مصر ہوتے ہیں کہ بہر حال اسلام معصوم لوگوں کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دیتا؛ اس لیے یہ سب حملے غیر اسلامی ہیں، مذہب اسلام میں لوگوں کے اس الزام کا کیا جواب ہے؟

حضرت مفتی صاحب! براہِ کرم ان سوالوں کے جوابات عنایت فرمائیں، ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے، اس طرح کے سوالات سے اس ملک کا ماحول ٹینشن میں بدلتا جارہا ہے، ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کی طرف سے فتویٰ ملنے پر ہم اسے مقامی اخبارات اور اپنی ویب سائٹ میں چھاپیں گے۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تقریباً دو ماہ قبل دارالعلوم دیوبند میں ایک کانفرس منعقد کی گئی تھی؛ جس میں بہت سے علماء شریک ہوئے تھے اور سیمنار کے آخیر میں ''اعلامیہ دیوبند'' کے نام سے ایک

اعلامیہ بھی پاس ہوا تھا، ہم آپ کے شکرگذار ہوں گے، اگر آپ ہمیں اس کی ایک نقل کاپی ارسال فرمادیں، خواہ یہ عربی میں یا اردو میں، ہم یہاں اس کا ترجمہ کرالیں گے، براہِ کرم اس جانب توجہ فرمائیں۔ آپ کے جواب کے منتظر: ڈاکٹر محمد امیر ابن م حسین

صدر محمد سفیان ابن شذالی، خزانچی پیراک اسلامک انفارمیشن سینٹر، پیراک ملیشیا (۱۸۱۷/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(ا) الف: اسلامی قانون کی رو سے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ اختلاف دین کے ساتھ وراثت جاری نہ ہوگی (۱) لہٰذا کسی شخص (شوہر یا باپ) کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں نہ یہ نو مسلم (باپ یا شوہر) اپنی کافرہ بیوی، بیٹی یا اولاد کا وارث ہو سکے گا اور نہ ہی کافرہ بیوی اور اولاد نومسلم باپ یا شوہر کے وارث قرار پائیں گے، اسامہ بن زیدؓ کی روایت ہے جسے بخاری، ترمذی، ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم.** (۲) یعنی نہ کوئی کافر مسلمان کا وراث ہوگا نہ ہی کوئی مسلم کسی کافر کا وارث بنے گا۔

اور حضرت جابرؓ کی روایت جسے عمرو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے واسطہ سے ابن عمرؓ سے نقل کیا گیا ہے مسند احمد، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی نے اسے روایت کیا ہے: **لا یتوارث أهل ملّتین شتیٰ.** (۳) دو مختلف مذہب والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

مذکورہ احادیث اور اس کے علاوہ دیگر قرآنی وحدیثی دلائل کی بنیاد پر، جمہور فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ اختلافِ دین کے ساتھ وراثت جاری نہیں ہوگی۔

لہٰذا مذکورہ قانون کے خلاف، اگر کسی اسلامی عدالت میں کوئی شخص وراثت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ شرعاً مسموع نہ ہوگا، مرحوم (خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کے دوسرے ہم مذہب ورثاء کے موجود ہونے کی صورت میں یہی لوگ وارث قرار دیئے جائیں گے۔

(ب) رہا پنشن یا دیگر مالی منافع جو حکومت کی طرف سے بطور عطیہ دیئے جاتے ہیں؛ چونکہ وہ میت کا ترکہ نہیں ہوتا؛ بلکہ حکومت کا عطیہ ہوتا ہے، لہٰذا حکومت جس کے لیے منظور کرے گی، اسے

(۱) موانعه أربعة منها: اختلاف الدين إسلاماً وكفراً (الدر مع الرد: ۱۰/۵۰۵، كتاب الفرائض).

(۲) أخرجه البخاري، باب لايرث المسلم الكافر الخ رقم: ۶۷۶۴.

(۳) أخرجه أبوداؤد رقم/۲۹۱۱، باب هل يرث المسلم الكافر؟

لینے کا حق ہوگا، خواہ میت کا ہم مذہب ہو یا اس کے برخلاف ہو۔(۱)

(۲) الف: باپ مسلمان ہوگیا مگر بیوی نے اسلام قبول نہیں کیا، تو ناسمجھ لڑکے، لڑکی کی پرورش کا حق ماں کو اس وقت تک حاصل رہے گا کہ بچے سمجھدار ہوجائیں؛ جس کی عمر تقریباً سات (۷) سال ہے، سات سال کے بعد بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، انہیں ان کا مسلمان باپ زبردستی بھی لے سکتا ہے۔

قال في الدرالمختار: والحاضنة الذمية ولو مجوسية كمسلمة مالم يعقل ديناً ينبغي تقديره بسبع سنين لصحة إسلامه حينئذٍ.(۲)

پرورش کرنے والی (خواہ ماں ہو) اگر غیر مسلمہ ہے، تو بھی اسے مسلم کی طرح بچہ کی پرورش کا حق حاصل ہے، جب تک کہ بچہ میں دین کی سمجھ نہ پیدا ہوجائے، جس کی مدت تقریباً سات سال مقرر کی گئی ہے؛ کیوں کہ اس عمر میں بچہ کے اندر دین کی سمجھ پیدا ہوجاتی ہے؛ اسی وجہ سے مذکورہ عمر (سات سال) میں بچہ کا اسلام لانا بھی معتبر ہوجاتا ہے۔

اور اگر سات سال کی عمر سے پہلے ہی یہ ڈر پیدا ہورہا ہو کہ بچہ کفریہ باتوں سے مانوس ومتاثر ہوجائے گا تو اگرچہ اس کے اندر ابھی دین کا پورا شعور نہ پیدا ہوا ہو، اسے کافر ماں سے لے لیا جائے گا اور باپ کی تحویل میں دیدیا جائے گا، تاکہ باپ ہی اس کی تعلیم وتربیت کا پورا بندوبست کرے۔

نیز جس عمر تک بچہ ماں کی پرورش میں رہے گا، اس میں کافرہ ماں کو پابند کیا جائے گا کہ بچہ کو شراب نہ پلائے، خنزیر کا گوشت نہ کھلائے۔

قال الشامي: وزاده أي (أن يخاف) في الهداية، فظاهره أنه إذاخيف أن يألف الكفر، نزع منها وإن لم يعقل ديناً (بحر). قال الطحطاوي: ولم يمثلو الِآلِفِ الكفر والظاهر أن يفسر سببه بنحو أخذه لمعابدهم. وفي الفتح: وتمنع أن تغذيه الخمر ولحم الخنزيروإن خيف، ضم إلى ناس من المسلمين.(۳)

---

(۱) **التركة: ما بقي بعد الميت من ماله صافياً عن تعلق حق الغير بعينه (دليل الورَّاث على هامش السراجي: ۳)** یعنی ترکہ شرعاً اس مال کو کہا جاتا ہے جو بوقت وفات میت کا مملوک تھا اور پنشن وغیرہ میں میت کی ملک ثابت نہیں ہوتی۔

(۲) **الدر مع الرد: ۵/ ۲۶۵، باب الحضانة.**

(۳) **المصدر السّابق.**

اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ جب بچہ پر کفریہ باتوں سے مانوس ہونے کا ڈر ہو، تو بچہ کو ماں سے لے لیا جائے گا۔ امام ''طحطاوی'' نے فرمایا کہ کفریہ باتوں سے مانوس ہونے کا مطلب یہ ہے، کہ ان کی عبادت کے طریقوں کو اختیار کرنے لگا ہو، جب اس قسم کا خوف پیدا ہونے لگے تو بچہ کو مسلمانوں کے ماحول وتربیت میں رکھا جانا ضروری ہوگا۔

(ب) ماں باپ میں سے کسی ایک کے مسلمان ہونے کی صورت میں جو مسلمان ہوگا، بچہ مذہب کے اعتبار سے اسی کا تابع قرار دیا جائے گا۔ **قال في الدر: والولد يتبع خير الأبوين ديناً إن اتحدت الدار ولو حكماً. (۱)**

ماں باپ میں سے جس کا دین بہتر ہوگا، بچہ اسی کے تابع مانا جائے گا، اگر بچہ اور اس کے مسلمان ہونے والے ماں یا باپ کا ملک ایک ہی ہے، اگر چہ حکماً ہی صحیح، اور یہ حکم اس اصول پر مبنی ہے، جس کا بیان حدیث ذیل میں فرمایا گیا ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم: مامن مولود إلاّ يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أو ينصّرانه أو يمجّسانه. متفق عليه. (۲)

قال الشامي: يظهر لي الحكم بالإسلام للحديث الصحيح ''كل مولود يولد علـى الفطرة حتى يكون أبواه هما اللذان يهوّدانه أو ينصّرانه'' فإنّهم قالوا: إنه جعل اتفاقهما ناقلاً له عن الفطرة فإذا لم يتفقا بقي علىٰ أصل الفطرة .... وهنا ليس له أبوان متفقان فيبقى على الفطرة. (۳)

کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ فطرۃ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے (تعلیم وتربیت کے ذریعہ) یہودی بنادیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہے۔ (بخاری ومسلم)

علامہ شامی نے فرمایا کہ بچہ کے اسلام کا حکم مذکور حدیث صحیح کی بنا پر ہے؛ کیوں کہ شراحِ حدیث نے تشریح کی ہے کہ ماں باپ کے متفقہ طور پر فطرت سے ہٹانے کی بات حدیث میں کہی گئی ہے۔

---

(۱) الدر مع الرد: ۳۷۰/۴، باب نكاح الكافر.

(۲) أخرجه البخاري، باب إذا أسلم الصّبي فمات هل .... الخ رقم: ۱۳۵۸.

(۳) الدر مع الرد: ۳۷۱/۴، باب نكاح الكافر.

جب بچہ کے ماں باپ دونوں متفق نہیں ہیں، تو بچہ فطرت (یعنی دین اسلام) پر برقرار سمجھا جائے گا اور اپنے باپ کے تابع ہوگا، جو دین اسلام کا اختیار کرنے والا ہے اور باپ کے تابع ہو کر اس کو مسلمان قرار دیا جانا، اس کے بلوغ تک ہے یا وہ دین اسلام کو سمجھ کر خود اختیار کرلے ورنہ بالغ ہونے کے بعد اس کی تبعیت ختم ہوگئی، اس وقت باختیار خود وہ جس دین کو اختیار کرے گا وہی اس کا اختیار کردہ دین مانا جائے گا۔ في الشامي: **ويستوي فيما قلناأن يكون عاقلاً أوغير عاقلٍ؛ لأنه قبل البلوغ تبع لأبويه في الدّين مالم يصف الإسلام. آه، فأفاد أن التبعية لا تنقطع إلا بالبلوغ أو بالإسلام بنفسه.** (۱)

بچہ مسلمان باپ یا ماں کے تابع ہو کر مسلمان قرار دیا جائے گا خواہ بچہ سمجھدار ہو یا ناسمجھ ہو دونوں صورت میں یہی حکم ہے؛ کیوں کہ بلوغ سے پہلے دین کے معاملہ میں وہ خیر الابوین کے تابع ہے جب تک کہ از خود اسلام کو قبول نہ کرے، تو اس سے معلوم ہوا کہ تبعیت یا تو بلوغ کی وجہ سے ختم ہوگی یا خود اسلام اختیار کر لینے کی وجہ سے ختم ہوگئی۔

(۳) بہتر تو یہی ہے کہ وہ شخص اپنے افراد خانہ کو بتلا دے، تا کہ اسلام کے تعلق سے اس کے معاملات ان لوگوں سے جدا ہو جائیں؛ لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے یا ناقابلِ تحمل پریشانیوں کے خطرہ سے وہ اظہار نہیں کر سکتا، تو مناسب ہے کہ کوئی وصیت نامہ روبرو گواہان ایسا تحریر کردے جس میں اپنے اسلام کی بابت کھلی وضاحت کرتے ہوئے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری مسلم تنظیم کے سپرد کردے، کہ وہ اسلامی طریقے پر میری تجہیز و تکفین کریں، تا کہ بعد انتقال اس وصیت نامہ کی بنیاد پر مسلم تنظیم کو اختیار مل جائے جسے عدالت بھی تسلیم کرے گی۔

(ویسے اس سلسلہ میں کسی قانونی مشیر سے مزید مشورہ کرلیں) زین الاسلام قاسمی الہ آبادی

(۴) یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اسلام کسی بے گناہ کی جان لینے اور بلاوجہ شرعی جانی و مالی نقصان پہنچانے کی اجازت قطعاً نہیں دیتا، اسلام کی نظر میں بے قصور کسی کی جان لینا یا اسے جانی و مالی نقصان پہنچانا سخت ترین گناہ ہے اسلام کی نظر میں یہ جرم عظیم ہے۔

عن عبداللّٰه بن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: مَن قتل

(۱) المصدر السابق.

معاهداً لم يرح رائحة الجنّة وإن ريحها توجد من مسيرة أربعين خريفاً. (رواه البخاري). (۱)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی معاہد (جس سے معاہدۂ امن ہو چکا ہو) کو قتل کیا، تو اسے جنت کی خوشبو بھی نہ ملے گی اور یقیناً جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے، اسلام معصوم و بے گناہ لوگوں کے قتل کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

دارالعلوم دیوبند کی کانفرنس میں جو اعلامیہ جاری ہوا اس کی کاپی منسلک ہے (۲)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۱۰/۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

---

(۱) أخرجه البخاري بتغيّر يسير رقم: ۳۱۶۶، كتاب الجزية.

(۲) **اعلامیہ**

جاری کردہ بموقعہ

دہشت گردی مخالف کل ہند کانفرنس

منعقدہ دارالعلوم دیوبند بتاریخ ۲۵/فروری ۲۰۰۸ء مطابق ۱۷/صفر ۱۴۲۹ھ

زیر اہتمام: رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

اسلام ساری انسانیت کے لیے دینِ رحمت ہے، وہ دائمی امن وسلامتی اور لازوال سکون واطمینان کا سرچشمہ ہے، اس نے پوری انسانی برادری کو بلاتفریق قوم و مذہب اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے، اس کا دامنِ رحمت سارے عالم انسانیت کو محیط ہے، اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے ساتھ اخوت ومساوات، رحم وکرم، ہمدردی ورواداری، خدمت وخیر خواہی، عدل وانصاف اور پرامن بقائے باہم کی تعلیم دی ہے۔ اسلام ہر قسم کے تشدد اور دہشت گردی کا شدید مخالف ہے، اس نے ظلم وتعدی، زور زبردستی، فتنہ وفساد، قتل وخوں ریزی، بدامنی وشر انگیزی کو سخت گناہ اور بھیانک جرم قرار دیا ہے۔

رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی، ملت کے تمام مکاتب فکر کے نمائندوں کی یہ دہشت گردی مخالف کل ہند کانفرنس ہر قسم کے تشدد اور دہشت پسندی کی سخت الفاظ میں مذمت کرتی ہے اور اس المناک عالمی اور ملکی صورت حال پر گہری فکر وتشویش اور غم وغصے کا اظہار کرتی ہے کہ دنیا کی اکثر حکومتیں مغرب کی ظالم وجابر اور سامراجی حکومتوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اور ان کو راضی رکھنے کے واحد مقصد سے اپنے شہریوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ ایسا رویہ اپناتی جارہی ہیں جسے کسی بھی دلیل سے جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا =

....

= ہمارے لیے یہ بات اور بھی زیادہ باعث تشویش ہے کہ ہمارے ملک کی داخلہ اور خارجہ پالیسی بھی ان طاقتوں کے زیر اثر آتی جارہی ہے جن کے ظلم و بربریت اور سرکاری دہشت گردی نے نہ صرف فلسطین، اور عراق و افغانستان بلکہ بوسنیا اور جنوبی امریکہ کے متعدد ممالک میں بھی معلوم انسانی تاریخ کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ جب کہ ہمارا یہ عظیم ملک غیر جانبداری بلکہ اخلاقی و روحانی قدروں کے حوالے سے دنیا میں جانا جاتا رہا ہے۔ اور اب تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہندوستانی مسلمان، خاص کر دینی مدارس سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جو جرائم سے دور اور پاک صاف زندگی کے سلسلے میں عدیم المثال ریکارڈ رکھتا ہے ہر وقت اس دہشت میں مبتلا رہتا ہے کہ انتظامیہ کے ہاتھ اس کے گریبان تک کب پہنچ جائیں اور نہ جانے کتنے لوگ آج جیلوں میں بند، ناحق طرح طرح کی کربناک اذیتیں برداشت کرنے پر مجبور ہیں جب کہ واقعتاً دہشت گردی پھیلانے والے، تھانوں کو لوٹنے والے، برسرعام پولیس افسران کو قتل کرنے والے، آتشیں اسلحوں کی نمائش کرنے والے عناصر آزاد گھوم رہے ہیں اور ان کے اس دہشت گردانہ عمل پر بندش لگانے کی کوئی معقول و مؤثر تدبیر اختیار نہیں کی جارہی ہے جس نے حکومت کے سیکولر کردار پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے، جو بلا شبہ ملک وقوم کے لیے انتہائی خطرناک امر ہے ———— اس لیے یہ کل مسلکی متحدہ دہشت گردی مخالف کانفرنس اس رویہ کی پُر زور مذمت کرتی ہے اور سرکاری اہل کاروں کی اس جانب داری پر انتہائی تشویش کا اظہار کرتی ہے اور یہ اعلان کرتی ہے کہ ملک میں قانون و انصاف اور سیکولر نظام کی بالا دستی باقی رکھنے کے لیے اپنی متحدہ جدو جہد جاری رکھے گی۔

یہ کانفرنس حکومت ہند سے پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ مدارس اسلامیہ اور مسلمانوں کی کردار کشی کرنے والوں کو لگام دی جائے، نیز انتظامی مشینری کو پابند کیا جائے کہ ملک کے امن عام کو تباہ کرنے والے کسی بھی واقعہ کے رونما ہونے پر غیر جانبداری کے ساتھ تحقیقات کی جائیں اور جرم ثابت ہونے پر مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے، نیز کسی خاص فرقے کے لوگوں پر بغیر کسی ٹھوس بنیاد کے شک وشبہ کا اظہار نہ کیا جائے، الغرض سرکاری ایجنسیاں ہر قسم کے تعصب و امتیاز سے بالاتر ہو کر اپنا فرض منصبی ادا کریں تا کہ ملک میں حقیقی امن وسلامتی برقرار رہے۔

دہشت گردی مخالف یہ کل ہند کانفرنس اپنے وطن عزیز کے تمام ارباب دانش، اہل قلم اور میڈیا کے ذمے داران سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ملکی و بین الاقوامی مسائل کا آزادانہ و دیانت دارانہ تجزیہ کریں اور کسی خاص تعصب کا شکار ہو کر مسائل کو ایک خاص رنگ دینے کی کوشش سے گریز کریں۔

اسی کے ساتھ تمام اسلامی مکاتب فکر کے نمائندوں کی یہ دہشت گردی مخالف کل ہند کانفرنس تمام مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی اب تک کی روش کے مطابق آئندہ بھی اپنا دوستانہ اور انسانیت کے احترام پر مبنی اپنا کردار نمایاں رکھیں، حالات کی سنگینی کا بھرپور ادراک کریں، مکمل بیدار مغزی کا ثبوت دیں تا کہ ان میں سے کسی کو بھی اسلام مخالف یا ملک دشمن طاقتیں اپنا آلہ کار نہ بنا سکیں، اپنے ملک سے وفاداری برقرار =

زندگی میں تقسیم جائداد

محترم مفتی صاحب زید مجدکم العالی..السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

از راہ کرم درج ذیل مسائل سے متعلق حکم شرعی بتلا کر ممنون مشکور فرمائیں۔

سوال: ﴿۶۳﴾......(۱) لوگ شادی کے موقع پر منڈھے کا کھانا دیتے ہیں، تو منڈھے کا کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟

(۲) دکان میں تصویر لگانا منع ہے؛ لیکن تیل، کریم وغیرہ پر تصویر لگی رہتی ہے، ان کا کیا حکم ہے؟

(۳) احاطۂ مسجد میں شہتوت اور امرود کے درخت لگے ہوئے ہیں، سبھی لوگ کھاتے ہیں، یہ کھانا کیسا ہے؟

(۴) ہم پانچ بھائی ہیں، والد صاحب نے ہمارے مکانات تقسیم کر دیے تھے، چار بھائیوں نے تو اپنے اپنے مکان پر قبضہ کر لیا تھا، ایک بھائی کے حصہ میں کرایہ دار رہ رہا تھا، اس کا کرایہ والد صاحب لیتے تھے، اس وجہ سے ایک بھائی ''یادِ الٰہی'' مکان میں رہتا رہا، جس سے وہ اپنے مکان پر

= رکھتے ہوئے عزت وسربلندی کے ساتھ رہیں، اپنی قیادت پر بھر پور اعتماد رکھیں، مدارس اسلامیہ کو اپنی متاع عزیز سمجھتے ہوئے ہر حال میں ان کا ساتھ دیں، اور پوری ہمت اور عزم وحوصلے کے ساتھ شریعت وقانون کی مخالفت سے بچتے ہوئے وطن عزیز میں زندگی گذاریں اور یاد رکھیں کہ اصل مسئلہ ہمارے ایمان اور اعمال کا ہے۔

لہٰذا اعمال صالحہ سے آباد زندگی گذانے کی جانب سب سے زیادہ توجہ مرکوز کریں کیوں کہ حالات کے بننے بگڑنے کا اصل تعلق اعمال کے بننے بگڑنے سے ہے۔

تجویز نمبر:۲: دہشت گردی کے خلاف صوبائی اجتماعات کی ضرورت

دہشت گردی مخالف کانفرنس اس جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتی ہے کہ جس طرح دارالعلوم دیوبند نے حالات کے تقاضے کا احساس کرتے ہوئے اس عظیم الشان کانفرنس کا اہتمام کیا ہے اسی طرح اس موضوع پر صوبائی اجتماعات کا انعقاد بھی کیا جائے۔ اس وقت دہشت گردی کے تعلق سے جو صورتِ حال پورے ملک میں جاری ہے اس کا تقاضہ ہے کہ دہشت گردی کی مخالفت اور مسلمانوں کے ساتھ انتظامی مشینری کے امتیازی رویہ کی مذمت کے لیے مسلسل اور مربوط کوششیں کی جائیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر صوبے کے مرکزی مقام پر اسی نوعیت کی کانفرنسوں کا اہتمام کیا جائے۔ کانفرنس دارالعلوم دیوبند سے گذارش کرتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں بھی رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔

قابض نہ ہوسکا، اب ۱۰ر سال کے بعد مکان خالی ہوا ہے، جس سے اس کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے؛ اس لیے کہ والد صاحب نے اس مکان پر ۳ر لاکھ روپے لگا دیے ہیں کہ اگر مکان لینا ہے تو تین لاکھ روپے دینے ہوں گے، کیا یہ جائز ہے؟ والد صاحب نے مکانات کے چھ حصے کیے ہیں، ایک اپنا اور پانچ لڑکوں کا، والد صاحب کے پاس دکان میں تقریباً پانچ لاکھ کے کپڑے ہیں اور تین لاکھ روپے ادھار میں پڑے ہیں اور گھر کا سامان بھی انہی کے پاس ہے، جس میں تقریباً ڈھائی کلو چاندی ''اماں'' کے پاس ہے، چار بھینسیں ہیں، جن کی قیمت اسی ہزار روپے ہیں، تقریباً پچاس کوئنٹل اناج ہیں، جب ہمیں الگ کیے، ساٹھ کلو اناج دیا تھا، اب یہ جو سامان والد صاحب کے پاس ہے، جو ایک ہی لڑکے کو دینا چاہتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟ فقط والسلام (۱۲۴۳/ د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) شادی بیاہ میں منڈھے کا کھانا دینا غلط طور پر رائج ہے، اس رسم کو ترک کرنا چاہیے، یہ رسوم مروجہ قبیحہ کے قبیل سے ہے۔

(۲) فوٹو لگانا منع ہے؛ لیکن اس قسم کی فوٹو جو اخبارات یا ڈبوں وغیرہ پر بنے ہوتے ہیں، ان سے بچنا متعذر اور دشوار ہے اور مقصود ان تصویروں کا لگانا نہیں ہوتا، بلکہ تبعاً وضمناً آجاتی ہیں؛ اس لیے اکرام کے طور پر ان کو نہ رکھا جائے تو رکھنے میں مضائقہ نہیں ہے، دکان پر اسے رکھ سکتے ہیں (۱).

(۳) مسجد میں درخت اگر کسی نے عام لوگوں کے فائدہ کے لیے لگایا ہے، تو ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور پھل لینے کی اجازت ہوگی اور اگر عام لوگوں کی منفعت کے لیے نہیں لگایا ہے؛ بلکہ مسجد کے نفع کے لیے لگایا گیا ہے تو پھلوں کو فروخت کرکے، اس کی آمدنی مسجد میں لگائی جائے گی۔ **في الدر المختار: غرس في المسجد أشجاراً تُثْمِر إن غرس للسبيل فلكل مسلم الأكل وإلّا فتباع لمصالح المسجد** (الدر مع الرد: ۶/ ۶۴۸)۔

(۴) آپ کے والد باحیات ہیں تو اپنے مکانات دکانوں، ان کی آمدنی، کھیت اور اس کی پیداوار، نیز نقد روپے، سونا چاندی وغیرہ چیزیں جو ان کی ملکیت میں ہیں، ان سب کے تنہا وہ مالک

---

(۱) (الف) ولو كانت الصورة صغيرةً كالتي على الدرهم أو كانت في اليد أو مستترةً أو مهانةً مع أنّ الصّلاة بذٰلك لا تحرم، بل ولا تكره (الدر مع الرد، كتاب الصلاة: ۲/ ۴۱۷).
(ب) الضّرورات تُبيح المحظورات (الأشباه والنّظائر).

ہیں، ابھی ان چیزوں میں ان کے بیٹوں کا کوئی حق یا حصہ نہیں ہے اور کسی بیٹے کو اس کے مطالبہ کرنے کا بھی حق نہیں ہے، لڑکوں کا حق والد کے انتقال کے بعد ہوتا ہے، والد اپنی زندگی میں خود مالک ومختار ہیں، فروخت کرنے یا کسی کو دینے کا انہیں اختیار ہے؛ البتہ اپنی زندگی میں اپنے لڑکوں کو اگر کوئی مکان جائداد یا نقد ہبہ کرتے ہیں، تو ان کے لیے مستحب ہے کہ سب لڑکے لڑکیوں کو برابر برابر دیکر قبضہ دخل دیں، جب والد نے چار بھائیوں کو ایک ایک مکان دیکر قبضہ کرادیا، تو وہ لڑکے ان مکانات کے مالک ہوگئے (۲)، البتہ پانچویں لڑکے کو قبضہ نہیں کرایا اور نہ ہی خود اس سے بے دخل ہوئے، تو والد صاحب کے ذمہ ضروری ہے کہ اس قدر وقیمت کا مکان پانچویں لڑکے کو بھی دیکر قبضہ دخل کراکے، خود بے دخل ہوجائیں، کرایہ پر چلنے والا مکان جو دیا تھا اس کی موجودہ قیمت اگر ان مکانات میں سے کسی ایک مکان کے برابر ہے جو دوسرے بھائیوں کو دیا ہے، تو والد صاحب کا تین لاکھ روپے کا مطالبہ پانچویں لڑکے سے کرنا زیادتی ہے، اور اگر اس کی قیمت زائد ہے تو زیادتی کے بقدر روپے پانچویں لڑکے سے مانگنے کا ان کو اختیار ہے تاکہ سب لڑکوں کے درمیان برابری ہوجائے، اسی طرح ان مکانات کے علاوہ دیگر آمدنی یا مکان جائداد کسی ایک لڑکے کو دینا اور دوسرے لڑکوں کو بلا کسی وجہ کے محروم کردینا ناجائز ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/ ۷/ ۲۹ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلندشہری،
فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ،

اسلام میں متبنّٰی کا حکم

حضرت مفتی صاحب!...سلام مسنون

سوال: ﴿۶۴﴾ آپ سے التجا ہے کہ اب سے تقریباً ۲۰ رسال قبل میں نے ایک لڑکی کو اپنی بہن بنایا تھا، جس کا نام ''مسرّت پروین'' ہے، اور اس کے شوہر کا نام ''محمد اسلام'' ہے، اس بہن نے تقریباً ۱۲ رسال پہلے مجھ کو خدا کا واسطہ دے کر، میرے چھوٹے لڑکے کو جس کا نام ''محمد شعیب'' ہے

(۱) ويتمّ الهبة بالقبض الكامل (الدر مع الرد،: ۴۹۳/۸).

اپنے گھر ''سہارن پور'' لے جانے پر اصرار کیا اور پھر ہمارا احسان مانتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی، اب تقریباً ۱۲؍سال گذر گئے اور ہمارا بیٹا اس کے ہی پاس ہے اور وہ ہم کو دینے کے لیے تیار نہیں ہے، براہِ کرم اس سلسلے میں شرعی راہنمائی فرمائیں۔ والسلام محمد لیاقت علی ہریدواری (۱۱۷۸/ د ۱۴۲۹ھ)

باسمہٖ تعالیٰ:

الجواب وباللہ التوفیق:

اسلام میں متبنّٰی بنانے کی رسم، غیر معتبر اور کالعدم ہے (۱) ''لیاقت علی'' نے اپنے بیٹے ''محمد شعیب'' نامی کو ''مسرت پروین زوجہ محمد اسلام'' کو دیدیا تھا، اور ان دونوں نے محمد شعیب کو اپنا بیٹا بنالیا، اس طرح بیٹا بنالینے سے حقیقۃً وہ بیٹا نہیں ہوتا اور نہ ہی حقیقی بیٹے کے احکام اس پر جاری ہوں گے، محمد شعیب مسرت پروین زوجہ محمد اسلام کے لیے مثل اجنبی کے ہے، مسرت پروین کو محمد شعیب سے بعد البلوغ پردہ کرنا لازم وواجب ہے، منہ بولا بیٹا بنانا شرعًا غیر معتبر ہے، ''محمد شعیب'' اپنے حقیقی باپ ''لیاقت علی'' کا ہی بیٹا رہے گا، باپ بیٹے کے حقوق اسی سے وابستہ رہیں گے، بیٹے ''محمد شعیب'' کو اپنی نسبت اپنے حقیقی باپ ''لیاقت علی'' کی طرف کرنا واجب ہے، غیر باپ کی طرف کرنا جائز نہیں ہے، لیاقت علی اپنے بیٹے محمد شعیب کو اپنے پاس رکھنے اور اس کی شادی بیاہ تعلیم وتربیت کرنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں اور یہی باپ بیٹے ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۷/ ۲۹ھ
الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

(۱) وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَ كُمْ أَبْنَاءَ كُمْ (الأحزاب: ۴).

بیع،اجارہ اور وقف کے بعض مسائل

نقد خرید کر اُدھار بیچنے کا ایک معاملہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

سوال: ﴿۶۵﴾ مسلمانوں کی ایک کمپنی ہے جس میں سارے حصے دار مسلمان ہیں، اس کمپنی کا نام ''گرین رے'' ہے، اس میں کاروبار کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ، خریدار نقدی سونا چاندی کمپنی سے خریدتا ہے اور پھر دوسری مجلس میں، اپنی مرضی سے اسی سونا چاندی کو تین گنا زیادہ قیمت میں، اس کمپنی میں ادھار میں فروخت کر دیتا ہے، اسے اختیار ہے چاہے فروخت کرے یا نہ کرے اور اگر فروخت کر دیتا ہے ادھار رقم ادائیگی کی مدت بھی طے کر لیتا ہے، پھر زرِ ثمن، یعنی ادھار رقم جو کمپنی کے ذمہ ہے مدت پوری ہونے پر بائع یعنی کمپنی کے ہاتھ ادھار فروخت کرنے والے اپنی پوری رقم پر قبضہ کر لیتا ہے، پھر اس کے بعد اس کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ اس رقم کے عوض کمپنی سے سونا چاندی خرید سکتا ہے مثلاً: زید نے ایک لاکھ روپے کے عوض کمپنی سے سونا چاندی خریدا، پھر اسی سونا چاندی کو دوسری مجلس میں تین لاکھ کے عوض اسی کمپنی کے ہاتھ ادھار فروخت کیا، اس طور سے کہ کمپنی انہیں چھ سال کے بعد تین لاکھ روپے دیدے گی۔

مفتی صاحب برائے مہربانی جلد سے جلد اس مسئلہ کا جواب عنایت فرمائیں کہ ایسا کاروبار شرعاً درست ہے یا نہیں؟ (۱۶۴۹/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

دو شرطوں کے ساتھ مذکورہ صورت جائز ہے (۱) نقد معاملہ کرتے وقت بطور شرط یہ طے نہ ہو کہ

بعد میں بائع زائد رقم میں اسے ادھار خریدے گا (۱)۔ (۲) سونا چاندی (مبیع) پر قبضہ کرنے کے بعد دوسری بیع کی جائے (۲)۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/ ۱۱/ ۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

بینک کے توسط سے گاڑی وغیرہ خریدنے کا جائز طریقہ

سوال: ﴿۲۶﴾ میرا سوال ''سوال نمبر: ۲۷۵۵/ اور ۵۲۴۸'' کے بارے میں ہے، ان کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایسا شخص جو کہ ۱۸۰۰۰۰/ روپیہ ماہانہ کمارہا ہو، اس کے پاس کوئی گھر ہی نہ ہو اور اس کو گھر یا کار خریدنے کی شدید ضرورت ہو، کیا ایسا ممکن ہے؟ آپ نے اس کو یہ حل پیش کیا ہے: آپ کے الفاظ درج ذیل ہیں: ''اور اگر آپ لون کا معاملہ اس طرح کریں کہ نقد روپیہ بینک سے لینے کے بجائے بینک سے کہیں وہ کار یا مکان خرید کر آپ کو دیدے اور اپنا سود اس کی قیمت میں شامل کرلے، مجموعی رقم (اصل قیمت مع سود) مکان یا کار کی قیمت ہوجائے، جس پر آپ بینک سے خریداری کرلیں پھر قسط وار ادائیگی کردیں، اس صورت میں آپ کی انکم ٹیکس والی رقم بھی بچ جائے گی اور بینک کو سود دینے کا گناہ بھی نہ ہوگا''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جو کہ کار یا مکان لون لینا چاہتا ہے، وہ بینک والوں سے یہ کہہ سکتا ہے کہ سود کی رقم کو اصل رقم میں شامل کردو، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ جب کہ ہم جانتے ہیں کار کی قیمت تین لاکھ بیس ہزار (فرض کرتے ہوئے) اور بینک چار لاکھ بیس ہزار لے رہا ہے (سود کے

(۱) في الدر المختار: لا (يصح البيع) بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما، وفي الشّامية: ومنه (أي ما يفسد من البيوع بسبب الشرط النافع للبائع) لو شرط البائع أن يهبه المشتري شيئاً أو يقرضه أو يسكن الدار شهراً (الدر مع الرد: ۷/ ۲۸۳، باب في الشرط الفاسد).

(۲) عن ابن عباس :أن رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال: من ابتاع طعاماً فلا يبيعه حتى يستوفيه، قال ابن عباس: وأحسب كل شيء مثله (أخرجه مسلم، باب بطلان البيع قبل القبض، رقم: ۱۵۲۵).

ساتھ)، تو آپ اس کو کیسے اجازت دے سکتے ہیں کہ سود کی رقم کو کار یا مکان کی اصل رقم میں شامل کر دے؟ اس کا مطلب ہے کہ کوئی بھی کار یا مکان لون لے سکتا ہے اور بینک سے معاہدہ کر سکتا ہے کہ سود کو اصل رقم میں شامل کر دے، آخر کار بینک کو سود ملے گا یا ہم سود ادا کریں گے؛ جیسا کہ ہم بیوقوف نہیں ہیں کہ ہم کار کی اصل قیمت ہی نہ جان سکیں، ایک شخص جو کہ ۱۸۰۰۰۰/روپیہ ہر مہینہ کما رہا ہے وہ کرایہ پر مکان لے سکتا ہے اور آٹو رکشا کے ذریعہ سے سفر کر سکتا ہے؛ اس لیے میرے خیال کے مطابق اس کو کار یا مکان کی ضرورت نہیں ہے، یا ایک یا دو سال میں وہ دونوں چیزیں خرید سکتا ہے۔ ۱۸۰۰۰۰/روپیہ بہت بڑی رقم ہے؛ اس لیے آپ کیسے اس طرح کے آدمی کو اجازت دے سکتے ہیں، اور دوسرے ''سوال نمبر: ۲۷۵۵'' میں آپ نے لون لینے کی اجازت نہیں دی ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے، برائے کرم مجھے جلد از جلد جواب عنایت فرماویں۔　　　(۱۳۷۹/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

محولہ جواب ۲۷۵۵، ۵۲۴۸ کو آپ نے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور غور سے نہیں پڑھا۔

(الف) سود تو بینک کے لفظوں میں ہے، ورنہ یہ درحقیقت ایک چیز خرید کر دوسرے کے ہاتھ زیادہ دام میں فروخت کرنا ہے، جو یقیناً جائز ہے اور خریدار کا زیادہ دام میں خریدنا بھی درست ہے۔(۱)

(ب) بالاقساط ادا کیے جانے کی وجہ سے کسی چیز کی قیمت بڑھا کر لینا بھی جائز ہے، جب کہ معاملہ کے وقت بالاقساط ادائیگی کی شرط پر ایک قیمت متعین ہو کر طے ہوگئی ہو مثلاً: ایک چیز کی قیمت بازار میں ۵/روپے ہیں، فروخت کنندہ خریدار سے یہ معاملہ کرتا ہے کہ میں تمہیں دس روپے میں یہ چیز دوں گا تم دو روپے ماہانہ قیمت ادا کر دینا، یہ صورت بھی بلاشبہ جائز ہے۔(۲)

جواب مذکور میں اسی طرح کا معاملہ کرنے کی بات، کار خریدنے والے سے کہی گئی ہے کہ اگر تم

---

(۱) المرابحة بيع بمثل الثمن الأول وزيادة ربح .... والكل جائز كذا في المحيط (الفتاوى الهندية: ۱۶۰/۳، كتاب البيوع، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية).

(۲) البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح، يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتاجيل والتقسيط (شرح المجلّة: ۱۲۵/۱، رقم المادة: ۲۴۵، ۲۴۶، ط: حنفيه كوئٹه).

بینک سے اس طرح معاملہ کرلو کہ بینک خود کار خرید کر اپنا نفع شامل کر کے مجموعی رقم پر تمہارے بدست بالاقساط ادائیگی کی شرط پر کار فروخت کر دے، تو یہ صورت جواز کی ہے، بازار میں کار کی قیمت کچھ بھی ہو، جب کار کی قیمت تراضی طرفین سے طے ہو جائے گی، تو ان کے حق میں یہی قیمت مقررہ قرار پائے گی۔(۱)

(ج) بینک نے چونکہ خود کار خرید کر گراہک کو دی ہے؛ اس لیے زاید رقم اس کا نفع ہوگا، سود نہیں کہلائے گا، ہاں اگر بینک گراہک کو بجائے کار کے نقد رقم دیتا ہے؛ تاکہ وہ خود کار خرید لے، تو اس صورت میں زائد رقم جو بینک لے گا یقیناً بلاشبہ وہ سود کہلائے گی جس کا لینا اور دینا حرام ہے۔(۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/ ۸/ ۲۹ھ

الجواب صحیح: محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

تعمیر سے قبل فلیٹ کی بیع اور اجارہ کی ناجائز شکل

سوال: ﴿۶۷﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

کہ آج کل کوئی کمپنی کسی بلڈنگ کا نقشہ تیار کرتی ہے اور اس کی تعمیر سے پہلے ہی اس کے فلیٹ یعنی منزل فروخت کر دیتی ہے، تو کیا محض نقشہ کی وجہ سے منزل کی تعمیر سے پہلے، اس کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں نوازش ہوگی۔

نیز ایک کمپنی ایسی بھی ہے جو تعمیر سے پہلے محض نقشہ کی بنا پر فلیٹ کی قیمت لے لیتی ہے، پھر پانچ سال تک اس فلیٹ کا کرایہ مشتری کو دیتی ہے، پھر تقریباً پانچ سال بعد جب تک فلیٹ تعمیر بھی ہو جاتا ہے، پھر مشتری کے حوالہ کر دیتی ہے۔

تو کیا اس فلیٹ کو خریدنا اور کمپنی سے پانچ سال تک کرایہ لینا جب کہ وہ تعمیر بھی نہیں ہوا ہے جائز

(۱) والثمن ما تراضی علیه المتعاقدان سواء زاد علی القیمة أو نقص (الدرمع الرد: ۷/۱۲۲، کتاب البیوع، مطلب فی الفرق بین القیمة والثمن).

(۲) أحل اللّٰه البیع وحرّم الربوا (البقرة: ۲۷۵).

ہے یا نہیں؟ مطلع فرمائیں۔ والسلام چاہت محمد قاسمی (۱۱۸۵/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

محض نقشے کی بنیاد پر منزل کی تعمیر سے پہلے "**بیـع استصـنـاع**" کے حکم میں ہوکر فلیٹ کی خریداری جائز ہے: **بأن الاستصناع جائز في كل ماجرى التعامل فيه كالقلنسوة والخف والأواني المتخذة من الصّفر والنّحاس وما أشبه ذلك استحساناً.**

(الفتاوى التاتارخانية: ۹/۴۰۰).

البتہ مشتری کا کمپنی سے کرایہ لینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ کرایہ کسی چیز کا عوض ہوا کرتا ہے اور یہاں کرایے کی مالیت کے مقابلے میں کوئی عوض نہیں؛ لہٰذا فلیٹ کا کرایہ لینا جائز نہیں ہے: **الإجارة إسم للأجرة، وهى كراء الأجير، وقد آجره إذا أعطاه أجرته، وفي الهداية: الإجارة عقد على المنافع بعوض، وفي الزاد: يريد بالعوض عوضاً هو مال** (الفتاوى التاتارخانية: ۱۵/۳).

واضح رہے کہ فلیٹ پر مکمل قبضے سے پہلے اس کو کسی دوسرے شخص کو بیچنا بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ ابھی مبیع پر قبضہ نہیں ہوا ہے اور بیع قبل القبض جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

اسکول کے مونوگرام کا معاوضہ لینے اور کچھ دن "بس" استعمال کرنے پر مکمل مدت کا کرایہ وصول کرنا کیسا ہے؟

سوال: ﴿۶۸﴾......(۱) عرض اینکہ: ہمارا ایک اسلامی اسکول ہے، جس میں بچوں کو سالانہ پڑھائی جانے والی کتابیں اور کاپیاں لینے کے لیے ایک دکان متعین کر دی گئی ہے، تاکہ کاغذ چھپائی وغیرہ کا معیار برقرار رہے اور عام بازاری قیمت سے زیادہ پیسہ لینے سے بھی دوکاندار باز رہے، نیز اسکول کا مونوگرام بھی ان کاپیوں اور کتابوں کے ساتھ چسپاں کر دینے کا دوکاندار کو پابند کیا جاتا ہے؛ جس سے اسکول کے مخصوص فوائد وابستہ ہیں، ان تمام چیزوں کی نگرانی بھی اسکول کی طرف سے رکھی

جاتی ہے، دوکاندار کو اسکول کے سبھی طلبہ بطور خریدار ملتے ہیں، جس سے اس کو مناسب نفع بھی ملتا ہے، وہ دوکاندار اپنی منفعت میں سے ''مونو گرام'' کی نگرانی اور اسکول کی طرف سے تعیین کے پیشِ نظر اسکول کو سالانہ طے شدہ رقم دیتا ہے، کیا وہ رقم لینا اسکول کے لیے شرعاً جائز ہے؟

(۲) اسی طرح اسکول میں ایک کینٹین (ہوٹل) کھول دیا گیا ہے، جو اسکول والوں نے اپنے خرچ سے اسے بنا کر دیا ہے، نیز اسکول کا پانی اور بجلی وغیرہ بھی استعمال کی جاتی ہے؛ لیکن چلانے والے دوسرے لوگ ہیں، کیا اسکول والوں کا ان سے کرایہ لینا درست ہے؟ اور کیا ان لوگوں سے تعمیر میں لگنے والے رقم اور اخراجات کا لینا جائز ہے؟ نیز یہ ملحوظ رہے کہ خود یہ اسکول کرایہ پر ہے۔

(۳) اسی طرح اسکول کے بچوں کے لیے اسکول نے بس کی سہولت بھی دی ہے، جس میں بچے نے تین مہینے گذرنے کے بعد بھی، اگر ''بس'' کی خدمت لی، تو اسے چھ مہینے کی فیس بھرنی ہوتی ہے، نیز اگر ایک مہینہ ''بس'' کی خدمت لینے کے بعد وہ بس کی سہولت نہیں لینا چاہتا ہے، تو بھی اسے چھ مہینے کی فیس ادا کرنی ہوتی ہے، تو اس طرح کی شکل شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں؟ جب کہ یہ اطلاع ''بس فارم'' پر لکھ دی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح اگر اسکول میں کوئی طالب علم درمیان سال میں آتا ہے، تو اس سے بھی پورے سال کی فیس لی جاتی ہے، نیز اگر درمیان سال میں کوئی طالب علم اسکول چھوڑ کر جاتا ہے، تو بھی اس سے پورے سال کی فیس لی جاتی ہے؛ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ درمیان سال سے جانے والے طالب علم کی جگہ خالی رہ جاتی ہے جس سے اسکول کا نقصان ہوتا ہے، یہ شکل درست ہے یا شرعی جواز کی کیا شکل ہے؟ نیز اس کی اطلاع ''اسکول فارم'' پر دے دی گئی۔

(۵) اسی طرح اسکول کے بچوں کے یونیفارم کے لیے اسکول والوں نے ایک ٹیلر متعین کیا ہے؛ جس کے یہاں کپڑے کا معیار اور سلائی وغیرہ کی نگرانی اسکول والے کرتے ہیں، نیز مونو گرام کی اجازت بھی صرف اسی کو دی گئی ہے، نیز سلائی عام ریٹ سے زیادہ نہیں لی جاتی، یکجا طور پر سبھی طلبہ بطور خریدار ملنے اور مناسب نفع ہونے سے یہ ٹیلر ایک طے شدہ رقم، ہر یونیفارم پر اسکول والوں کو دیتا ہے، کیا یہ رقم لینا از روئے شرع جائز ہے؟ برائے کرم ان سوالات کے جوابات تحریر فرما کر ممنون مشکور فرمائیں۔ (۱۵/۷/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

چوں کہ سوال: ۱/اور ۵/میں ایک ہی نوعیت کے مسئلے مذکور ہیں؛ اس لیے دونوں کا حکم ایک ساتھ لکھا جاتا ہے..........................

(۱و۵) اسکول کو ملنے والی یہ رقم بہ ظاہر کسی چیز کا عوض نہیں اور شرعاً مالی معاملات میں طے کر کے یا عرف کے بناء پر، اس طرح کوئی رقم لینا، جو کسی چیز کا عوض وبدل نہ ہو، رشوت کے دائرے میں آتا ہے، نیز اس رقم کو مونو گرام کے حقِ استعمال کا معاوضہ قرار دے کر بھی، جائز قرار نہیں دیا جاسکتا؛ اس لیے کہ اس طرح کے حق پر کرایہ وصول کرنا شرعاً جائز نہیں (۱) البتہ درج ذیل طریقوں میں سے کوئی طریقہ اپنانے کی شرعاً گنجائش ہوسکتی ہے۔

(الف) اسکول انتظامیہ دکاندار کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرلیں، پھر جو کچھ نفع حاصل ہو، باہم حسبِ قرار داد تقسیم کرلیں۔

(ب) مونو گرام پر مشتمل کاپی کتاب وغیرہ کا سرِ ورق (ٹائٹل) یا اسٹیکر (جو کپڑے پر لگانے کے قابل ہو) تیار کروا کر مناسب منافع شامل کر کے، دکاندار کے ہاتھ فروخت کردیں۔

(ج) یا تمام چیزیں کاپی، کتاب وغیرہ اسکول والے خود تیار کروا کر، مطلوبہ منافع شامل کر کے دکاندار کے ہاتھ فروخت کردیں، پھر دکاندار اپنے نفع کے ساتھ آگے فروخت کردے۔

(۲) مذکورہ صورت میں چوں کہ اسکول خود کرایہ پر چل رہا ہے؛ اس لیے اگر مالک کی طرف سے کرایہ پر لی ہوئی زمین پر، تعمیر کرنے یا اس پر موجود عمارت پر اضافہ کر کے دوسرے کو کرایہ پر دینے پر کوئی اعتراض نہ ہو، تو اسکول والوں کا ہوٹل کرایہ پر دینا اور اجرت، نیز بجلی، پانی وغیرہ کا صرفہ وصول کرنا شرعاً جائز ہے (۲)؛ لیکن یہ بات وضاحت طلب باقی رہے گی کہ تعمیر کا خرچہ کس عنوان سے لیا جائے گا، پھر اس تعمیری اضافہ پر ملکیت کس کی رہے گی؟ اصل مالک کی؟ اسکول والوں کی؟ یا کرایہ پر لینے والوں کی؟ بہر حال کرایہ کے نام پر ہی رقم لینا بہتر ہے، اگرچہ کرایہ کی تعیین میں تعمیری اخراجات

---

(۱) وفي الأشباه: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة ((الدر مع الرد: ۷/۳۳).

(۲) وله السّكنى بنفسه وإسكان غيره بإجارة وغيرها وكذا كل لا يختلف بالمستعمل يبطل التقييد ((الدر مع الرد: ۹/۳۸).

کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۳و۴ کا مشترکہ حکم) اگر ''بس فارم'' یا ''داخلہ فارم'' پر مثال کے طور پر یہ عبارت لکھ دی جائے ''فلاں مہینے سے فلاں مہینے تک کا کرایہ، تعلیمی فیس اتنی رقم ہے، خواہ کوئی طالب علم پوری مدت بس کی خدمت لے، اسکول میں پڑھے یا صرف کچھ دن، یا یہ بات عرف کی بناء پر لوگوں کو معلوم ہو، تو کچھ مہینے بس کی خدمت لینے، اسکول میں پڑھنے پر معاہدے کے مطابق پوری مدت کا کرایہ فیس وصول کرنا شرعاً جائز رہے گا۔ امداد الفتاویٰ: سوال: ۳/ ۳۸۷ و ۳۹۴ ص، ۳/ ۳۹۸ و ۴۰۲ پر اس سے ملتے جلتے سوالات کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے جو کچھ لکھا، اس سے استفتاء ہذا میں مذکور مسئلے کا حکم شرعی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ امداد الفتاوی میں یوم اور مہینہ کی بات اور یہاں (استفتاء) میں چھ مہینے کی بات ہے۔ فقط واللہ اعلم

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۴/۳۲ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

کمیشن پر چندہ کرنا اور چندہ پر انعام لینے کا حکم

سوال: ﴿۶۹﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل میں کہ:

ہمارے مدارس دینیہ میں زیادہ تر آمدنی بمد زکوٰۃ ہوتی ہے، جس کو تملیک کرنے کے بعد مختلف مدات میں خرچ کیا جاتا ہے، اسی ذیل میں چندہ کرنے والے سفراء کی تنخواہ اور ان کا انعام بھی ہے، حسنِ کارکردگی پر سال ختم پر انعام دیا جاتا ہے، کیا سفراء کو انعام دینے کی شرعاً گنجائش ہے، بعض مدارس میں کمیشن طے کیا جاتا ہے اور سفراء کو کمیشن دیا جاتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ نیز انعام اور کمیشن میں کیا فرق ہے؟

بعض اہلِ خیر معطی حضرات کو اشکال و اعتراض ہوتا ہے، کہ ہمارے چندہ میں سے کمیشن اور انعام دینے کی اجازت نہیں ہے، اس سلسلے میں شرعی حکم کی وضاحت فرمائیں؛ تاکہ معطی صاحبان اور اہل مدرسہ کے سامنے صحیح صورت حال واضح ہو سکے۔ والسلام

محمد امان اللہ محلہ مفتی سہارن پور (۱۴۱۵/ د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

صرف کمیشن پر چندہ کرنے کا معاملہ کرنا، بچند وجوہ ناجائز ہے:

(۱) اجرت من العمل ہے، جو ناجائز ہے(۱) یعنی اس جمع شدہ چندہ میں سے یہ اجرت دی جاتی ہے تو یہ معاملہ جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ صورت ''قفیز طحان'' کی ہے، جو حدیث شریف کی رو سے ممنوع ہے (اگر مدرسہ اپنے فنڈ سے دے گا، تو یہ وجہ ناجائز ہونے کی باقی نہ رہے گی، مگر دوسری مندرجہ ذیل وجوہ قائم رہیں گی)۔

(۲) اجیر اس عمل پر بنفسہ قادر نہیں، قادر بقدرۃ الغیر ہے، اس کا عمل چندہ دینے والوں کے عمل پر موقوف ہے، اور قادر بقدرۃ الغیر بحکم عاجز ہے، جب کہ صحتِ اجارہ کے لیے بوقت عقد اجیر کا قادر علی العمل ہونا اور مستاجر کا قادر علی تسلیم الاجرۃ ہونا صحت عقد کے لیے شرط ہے؛ لہٰذا یہ اجارہ باطلہ ہوا؛ اس لیے چندہ لانے والے کے لیے اس کی اجرت بصورتِ حصہ مقررہ حلال نہیں۔ (راجع احسن الفتاوی)

(۳) اسی طرح اس میں اجرت اور منفعت بھی مجہول ہے؛ کیوں کہ اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کہ کتنے گھنٹے روزانہ لوگوں کے پاس جانا ہے، ان تمام وجوہات کی بناء پر کمیشن کی بنیاد پر چندہ کرنا ناجائز ہے (۲)، سفیر کے لیے چندہ جمع کرنے پر اجرت کا بے غبار طریقہ یہ ہے کہ مہتمم مدرسہ جس شخص کو چندہ جمع کرنے کے لیے مقرر کرے، اس کے چندہ جمع کرنے کے عمل کی کوئی معین اجرت طے کردے، خواہ ماہانہ ہو یا یومیہ اور وہ شخص اس طے شدہ معاملہ کے مطابق چندہ جمع کرے، تو یہ صورت بلا شبہ جائز ہے، اور اگر سفیر تنخواہ دار ملازم ہو، تو اس کی حسن کارکردگی یا متعینہ مقدار (وصولیابی کی) پوری کرنے کی وجہ سے تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم بطور انعام دینا تو جائز ہے؛ لیکن زکوۃ کے پیسے سے دینا جائز نہیں، بلکہ زکوۃ کا پیسہ مدرسہ میں جمع کرنا لازم ہے اور یہ انعام مدرسہ اپنے امدادی فنڈ سے (جس سے تنخواہ دی جاتی ہے) دے سکتا ہے۔

اب یہاں دو باتیں ہوئیں کمیشن پر چندہ کرنا (جو کہ ناجائز ہے) دوسرے تنخواہ پر چندہ کر کے

---

(۱) ولو دفع غزلاً لآخر لينسجه له ينصفه أي بنصف الغزل أو استأجر بغلاً ليحمل طعامه ببعضه ...... فسدت في الكل؛ لأنّه استأجره بجزء من عمله (۹/۷۹).

(۲) وتفسد (الإجارة) بجهالة المسمّى كلّه أو بعضه .... وتفسد بعدم التسمية (الدر مع الرد، ۹/۶۲).

اخیر میں انعام دیا جانا، یہ جائز ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کمیشن اجرت کے درجہ میں ہوتا ہے جس کا اجارہ فاسدہ میں داخل ہونا اوپر ذکر کیا جا چکا اور انعام اجرت کے علاوہ حسن کارکردگی پر اضافی طور پر دیا جاتا ہے، جو شرعاً جائز ہے، ہاں یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر انعام بطور فیصد دیا جائے تو بھی اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ یہ اصل اجرت نہیں ہے کہ اجرت مجہول میں داخل ہونے کا گمان ہو۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خاص چندہ کی رقم، جو عموماً زکوٰۃ، صدقات واجبہ کے مد کی ہوتی ہیں، اس میں سے کمیشن یا انعام دینا جائز نہیں؛ بلکہ مدرسہ اپنے عمومی فنڈ سے تنخواہ یا انعام دے، جس طرح مدرسہ کے دوسرے جائز مصارف میں خرچ کرنے اور ملازمین کو تنخواہ دینے کا مہتمم مجاز ہوتا ہے، اس کا بھی مجاز ہوگا، معطیین کی زکوٰۃ وغیرہ رقمِ خاص سے نہیں دیا جاتا کہ معطیین کو اعتراض یا اشکال ہو، ہاں اربابِ حل وعقد یا شوریٰ اس کے صواب وناصواب ہونے کی جانچ کر سکتے ہیں، اور جہاں کہیں معطیین کی رقم خاص سے تنخواہ یا انعام کمیشن لے لینے کا طریقہ ہو، وہاں معطیین کا اعتراض بجا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۸/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام، وقار علی غفرلہ

مدرسہ کی مالیت سے متعلق چند سوالات

سوال: ﴿۷۰﴾ مدرسہ کے شعبۂ مالیات سے متعلق چند باتیں دریافت طلب ہیں، امید ہے کہ شرعی رہنمائی فرمائیں گے۔

(۱) ہمارے مدرسہ میں قمری مہینوں کے اعتبار سے نظام العمل اور حاضری وغیرہ معمول بہا ہے، اس میں ہر سال دس بارہ روز کی کمی ہو جاتی ہے، اسی طرح اساتذہ کو ملنے والی تنخواہیں، شمسی مہینوں کے بالمقابل زیادہ ہو جاتی ہیں؛ یعنی سالانہ بونس لے کر ساڑھے تیرہ مہینے کی تنخواہ دینی پڑتی ہے اور بجٹ پر اس کا اثر پڑتا ہے، تنخواہوں کے لیے جو رقم مختص کی جاتی ہے، وہ کم پڑ جاتی ہے، اگرچہ مدرسہ کے دستور میں قمری مہینہ ہی مقدم ہے؛ مگر موجودہ دور میں سرکاری دفاتر سے متعلق کام اور ملازمین،

شمسی مہینوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ اس میں ملازمین کو بمقابل قمری ماہ کے تنخواہ کم ملتی ہے؛ یعنی صرف تیرہ مہینے کی، جب کہ قمری مہینے کے اعتبار سے بونس کو شمار کر کے ساڑھے تیرہ مہینے ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جن ملازمین نے شمسی ماہ کے اعتبار سے ماہانہ دفتر سے رقم حاصل کی، ان کی سالانہ پندرہ یوم کی تنخواہ باقی بچی رہی، ضابطہ کے مطابق اس کے حقدار ملازمین ہیں؛ مگر مدرسہ دوبارہ اس رقم کو استعمال کر لیتا ہے، اس کے برعکس قمری مہینے سے تنخواہ لینے والے اساتذہ وملازمین کو دس دن سے زائد کی جو رقم دینی پڑتی ہے، یہ زائد خرچ دوسرے مد میں شامل ہو جاتا ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) مدرسہ میں آمدنی اور اس کے خرچ کے مدات متعین ہیں؛ جن میں ایک مد اکرام مسلم بھی ہے، اس میں بھی آمدنی کبھی کبھی بہت ہوتی ہے؛ لیکن اخراجات کئی گنا زیادہ ہو جاتے ہیں، جو دوسری مد سے پورے کیے جاتے ہیں، بہت سے مہمان غیر مسلم بھی آتے ہیں اور بہت سے علماء وفضلاء اور عامۃ المسلمین اور اصلاحی وتبلیغی کام کرنے والے حضرات بھی، سب کے کھلانے پلانے پر خرچ ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس طرح مدات تقسیم کرنا اور وقت ضرورت ایک مد کی رقم دوسرے مد میں خرچ کر دینا اور خاص طور پر مدرسہ کی رقم مہمانوں پر اور ان کے آرام پر خرچ کرنا کیسا ہے؟

اس میں ایک بات اور غور طلب ہے کہ بعض خصوصی مہمانوں کے ساتھ مدرسہ کے معزز ممبران اور اساتذہ کو بھی شریک کیا جاتا ہے، اور وہ بھی ان کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں، اور مدرسہ کے خرچ پر گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ قدرے وضاحت سے تحریر فرمائیں۔

(۳) بہت سارے مالدار لوگ حضرت مہتمم صاحب کو یہ کہہ کر رقم دیتے ہیں کہ، آپ اپنی صواب دید پر جہاں چاہیں خرچ کریں، حضرت مہتمم صاحب کبھی کبھی کسی عارضی ملازم کی تنخواہ بھی اس رقم سے دے دیتے ہیں، اور اس عارضی ملازم کا استقلال ہونے کے بعد وہ رقم، دفتر محاسبی سے واپس نہیں لیتے؛ مثال کے طور پر کسی ملازم کو یہ کہہ کر رکھ لیتے ہیں کہ آپ چند ماہ خدمت کرو، میں کچھ آپ کو دیدوں گا اور اس کو کچھ دے دیتے ہیں، اور استقلال ہو گیا تو باضابطہ اس کی تنخواہ دفتر سے جاری ہو جاتی ہے، ملازم پر واضح کر دیا جاتا ہے کہ یہ رقم آپ کی اجرت نہیں ہے؛ بلکہ ہم بطور تعاون اور تبرع کے آپ کو دیتے ہیں، اسی طرح مہتمم صاحب اساتذہ اور ملازمین کی ضروریات کے لیے قرض دیتے رہتے ہیں، کبھی تو کچھ دنوں بعد قرض دی گئی رقم واپس لے لیتے ہیں اور کبھی کبھی بالکل معاف

کردیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایسی ہی نیت کرکے دیتا ہوں، قرض اس لیے کہہ دیتا ہوں؛ تاکہ ملازمین اور مدرسین بلاضرورت شدیدہ سوال نہ کریں، اس طرح مختلف اساتذہ اور ملازمین کو مثلاً ایک سال دولاکھ روپیہ تقسیم کیا تو ایک لاکھ ہی واپس ملتا ہے، بقیہ لاکھ روپے واپس نہیں مل پاتے، مہتمم صاحب اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے کسی تاجر کو کچھ رقم یہ بتا کر دے دیتے ہیں کہ آپ اسے اپنی تجارت میں شامل کرکے اس حصہ کا نفع دیتے رہیں، اس طرح سے اگر سالانہ لاکھ روپیہ خسارہ ہوگیا یعنی واپس نہیں آیا تو لاکھ روپیہ کا نفع بھی ہوجاتا ہے، کبھی کبھی کسی دوسرے مدرسے کو وقت ضرورت اس مد سے کچھ رقم بھی دے دی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا کیسا ہے؟

بعض مرتبہ زکوٰۃ کے مسائل کی رعایت میں دشواری ہوئی، تو ایک استاذ صاحب نے مہتمم صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس طرح کی رقوم اپنے ہی حق میں کسی مستحق استاذ کے ذریعہ تملیک کرادیں، یا طلبہ کے ذریعہ تملیک کرادیں، اس طرح یہ رقم آپ کے لیے عطیہ ہوجائے گی، پھر آپ جسے بھی چاہیں، جس مد میں چاہیں خرچ کرسکتے ہیں، خاص طور پر مضاربت پر دینے کے لیے یا کاروبار میں لگانے کے لیے تملیک کرانا زیادہ مناسب ہوگا، اب سوال یہ ہے کہ تملیک کرانے سے، کیا یہ رقم مہتمم صاحب کے لیے عطیہ ہوجائے گی؟ یا بعد تملیک مہتمم صاحب جن کو دیتے ہیں، ان کے لیے عطیہ ہوگی؟ اگر یہ رقم بڑی ہو اور نصاب کو پہونچتی ہو تو اس پر فرض ہونے والی زکوٰۃ اس رقم میں سے ادا کی جائے گی یا علاحدہ سے؟ وضاحت فرمائیں، بہت مہربانی ہوگی۔

(۴) ہمارے مدرسے کے ایک استاذ رمضان مبارک میں ''کویت'' تشریف لے گئے، وہاں کچھ لوگوں نے ان کو کویتی دینار مدرسہ کے لیے چندہ دیا، جس میں زکوۃ اور فطرہ کے مد کی رقم شامل تھی، اس رقم کو ہندوستان منتقل کرنے کے لیے موجودہ دور میں ہنڈی اور حوالہ کا طریقہ ہے؛ مگر خلاف قانون ہونے کی وجہ سے استاذ نے اس طرح سے رقم منتقل نہیں کی؛ بلکہ انہوں نے اس سے کچھ تجارتی اشیاء خریدی، اور اس میں اپنی ذاتی رقم بھی شامل کی اور اسے ہندوستان ''کارگو'' کردیا، ہندوستان پہونچ کر جب وہ چیزیں فروخت کی گئیں تو اصل رقم سے زائد رقم بھی وصول ہوئی، مہتمم صاحب اور کمیٹی کے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ آمدنی ہوئی ہے، مکمل رقم مدرسہ کو دے دیں؛ چونکہ آپ مدرسہ کی طرف سے فراہمی مالیہ کے لیے وہاں گئے تھے، استاذ محترم کا کہنا یہ ہے کہ میرے ذمہ

صرف سبق پڑھانا تھا، میں نے تبرعاً رمضان کی چھٹیوں میں مالیہ فراہم کیا اور اس راستہ کی مشکلات کو برداشت کیا اور جن شاگردوں نے مجھے کچھ تحفہ تحائف دیئے وہ سب کچھ بھی اسی مال میں شامل کر کے، میں نے تجارتی سامان خریدا، میری نیت یہ تھی کہ چاہے اس میں نفع ہو یا نقصان، اور یہ سامان ہندوستان پہونچے یا ضائع ہو جائے مدرسہ کے لیے وصول ہونے والی رقم میں ادا کر دوں گا، اگر میں نے غیر قانونی طریقہ اختیار کیا ہوتا، تو تنہا میں جواب دہ ہوتا، تو اب اگر نفع ہو رہا ہے تو وہ مدرسہ کا حق نہیں ہے، میں مدرسہ کو اتنی ہی رقم ادا کروں گا جتنی وصول ہوئی ہے، حضرت مفتی صاحب سے درخواست ہے کہ اس صورت حال کا حکم بیان فرمائیں تا کہ استاذ محترم اور ذمہ داران مدرسہ کے اس معاملہ کا شرعی حل معلوم ہو جائے، مہربانی ہوگی۔

(۵) مدرسہ میں لوگ مختلف معاملات میں دعا کے لیے کہتے ہیں، جب وہ کام ہو جاتا ہے، تب کچھ چندہ بھیج دیتے ہیں، اس طرح مہتمم صاحب سے بعض حضرات دنیاوی افسران کے پاس سفارشی خطوط لے کر جاتے ہیں اور فون کرا دیتے ہیں، جس سے وہ کام بآسانی ہو جاتا ہے، بعد میں کچھ رقم مدرسہ کو بطور عطیہ کے بھیج دیتے ہیں، کبھی کبھی مہتمم صاحب ان کو ترغیب بھی دے دیتے ہیں کہ آپ کا کام تو ہو جائے گا، آپ مدرسہ کو چندہ دے دیں، کبھی ان سے کوئی دوسرا بھی دینی کام کرا دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر مہتمم صاحب کی سفارش یا ان کے فون سے وہ کام نہ ہوتا، تو ایسا شخص دینی کام میں یہ حصہ نہ لیتا، سوال یہ ہے کہ اس طرح کی رقم رشوت تو نہیں ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ملازمین ومدرسین کا حضرات مہتممین کے مابین جو معاملہ ہوتا ہے، وہ عقد اجارہ کا ہوتا ہے، حساب کتاب باہم طے شدہ معاہدے کے مطابق کیا جانا چاہیے، کسی کو خواہ وہ ملازم ومدرس ہو یا مہتمم، اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، اب جب کہ سوال میں مذکور بیان کے مطابق تنخواہ وغیرہ کا لینا، قمری مہینے سے طے تھا، اور یہ ہونا بھی چاہیے، تو پھر شمسی مہینے کے اعتبار سے لینے کی کیا وجہ ہے؟ مہتمم صاحب نے تنخواہ دیتے وقت کیا کہہ کر دیا؟ اور ملازمین نے کیا کہہ کر لیا؟ نیز کسی ایک مہینے میں ایسا ہوا یا پورے سال اسی طرح کرتے رہے؟ ان سب باتوں کی وضاحت کے بغیر جواب نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) مدرسہ میں جو رقوم آتی ہیں، اگر معطین کی طرف سے کسی مصرف؛ مثلاً تعمیر، کتابوں کی خریداری وغیرہ کی صراحت کردی گئی ہے، تو ان رقوم کو انہی مصارف میں خرچ کرنا ضروری ہے، **فإنّ شرائط الواقف معتبرة إذالم تخالف الشرع وهو مالك فله أن يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية** (۱) نیز زکاۃ اور صدقاتِ واجبہ جیسی واجب التملیک رقومات کو غریب طلبہ پر خرچ کرنا ضروری ہے (۲)؛ البتہ عام عطیات کی مد میں آئی ہوئی رقم سے، ضرورت کے موقعے پر مہمانوں کے کھانے پینے وغیرہ میں خرچ کیا جاسکتا ہے؛ لیکن یہ بات انتہائی قابل لحاظ ہے کہ مدرسے کے فنڈ سے، انہی مہمانوں کی خاطر تواضع کی گنجائش ہے، جو خاص مدرسہ کے کام کے لیے آئے ہوں، اپنا ذاتی کام یا کسی دوسرے مقصد، اگرچہ دینی ہو؛ جیسے تبلیغ واصلاح وغیرہ کے لیے آنے والوں کو مدرسہ کی رقم سے کھانا کھلانا، شرعاً جائز نہیں، مستفاد از (فتاوی محمودیہ: ۵۳/۲۳، واحکام المدارس)، البتہ کسی مہمان کے اعزاز میں اگر مہتمم صاحب یا ان کے حکم سے بعض اساتذہ کھانے میں شریک ہوجائیں تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح اگر مدرسے کے کام کے لیے مہمان کے ساتھ سفر درپیش ہوا اور مہتمم یا اساتذہ کی معیت بھی ضروری سمجھی جائے، تو مدرسے کے خرچ پر سفر کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن کفایت شعاری بہرحال ضروری ہے۔

نوٹ: یہ اختیارات مہتمم صاحب کو اس وقت حاصل ہوں گے، جب معطینِ چندہ یا مجلسِ شوریٰ یا انتظامی کمیٹی کی طرف سے وہ (مہتمم صاحب) اس طرح کے اختیارات کے مجاز ہوں۔

(۳) زکوۃ کی جو رقم مہتمم صاحب کو یہ کہہ کر دی گئی ہو کہ ''آپ اپنی صواب دید پر جہاں چاہیں خرچ کریں'' اُسے عارضی ملازمین کو بہ طور تبرع دینا جائز نہیں (۳)؛ اس لیے کہ اگرچہ یہ بہ ظاہر تبرع ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ اجرتِ عمل ہے، ورنہ اتنے دن جو عارضی ملازمین نے کام کیا، اس کی اجرت کہاں ہے؟ البتہ مدرسے کے ملازمین اگر مستحقِ زکوۃ ہوں تو ان کو اس رقم سے پیسے دیے جاسکتے ہیں،

---

(۱) الدر مع الرد، كتاب الوقف، مطلب شرائط الوقف معتبرة مالم تخالف الشرع : ۶/ ۵۲۷.

(۲) الزكاة :هي تمليك جزء مال عينه الشارع من مسلم فقير غيرها شمي ولامولاه مع قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالىٰ. شامي: ۳/ ۱۷۰.

(۳) زکوۃ کی ادائیگی میں تملیک بلاعوض شرط ہے اور مذکورہ صورت میں عوض کا شبہہ؛ بل کہ قریب قریب یقین ہے، اس لیے ناجائز ہے۔

خواہ قرض کے عنوان سے ہو یا کسی اور عنوان سے، بہ شرطیکہ عوض یا اجرت ہونے کا شبہ نہ ہو اور جب زکوۃ کی نیت سے دے دی تو پھر دوبارہ اسے واپس لینا جائز نہیں، صورتِ مذکورہ میں کن کو کس نیت سے رقم دی تھی؟ پھر بعض سے واپس لینے اور بعض سے نہ لینے کی کیا وجہ ہے؟ پھر تجارت کے لیے کس مد کی رقم، کس نیت وارادے سے دی تھی؟ مہتمم صاحب کی جانب سے پوری وضاحت ہونے کی صورت میں ہی جواب دیا جاسکتا ہے؛ البتہ اتنی بات قابل لحاظ ہے کہ مدرسے کی رقم کو بطور مضاربت دینے کو مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے ناجائز لکھا ہے۔ (کما فی فتاوی دارالعلوم دیوبند :۱۳/۱۱۰ط: مکتبہ دارالعلوم دیوبند)، نیز اس مد کی رقم کو اپنے حق میں تملیک کرانا بھی منشاء معطی کے خلاف ہے؛ اس لیے اس سے بچنا بھی لازم ہے۔(۱)

(۴) مذکورہ صورت میں یہ رقم استاذ کے پاس امانت تھی، اسے بعینہ یا (مجبوری کی شکل میں) اس کا بدل مدرسہ میں پہنچانا ضروری ہے؛ لہٰذا استاذ صاحب کا اس رقم کے ساتھ اپنی ذاتی رقم ملانا، تجارت کرنا اور نفع کمانا وغیرہ سب امانت میں خیانت کے مترادف ہے، **ليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة** (مبسوط)(۲)؛ اس لیے استاذ صاحب پر خیانت سے توبہ لازم ہے؛ لیکن چوں کہ مذکورہ عمل سے استاذ کا مقصد منتقلیٔ زر کی غیر قانونی شکل (ہنڈی) سے بچنا تھا، نیز ضائع ہونے یا نقصان ہونے کی شکل میں استاذ خود ہی ذمہ دار ہوتے اور اس کا ضمان ادا کرتے؛ اس لیے کویتی دینار جتنی مقدار میں ان کو ملے تھے، اتنی مقدار میں کویتی دینار ہندوستانی روپے سے اس کا بدل مدرسے میں جمع کر دیں اور مابقیہ رقم بشمول منافع اپنے پاس رکھنے کی گنجائش ہے۔(۳)

---

(۱) **فإن كان الوقف معينا على شيء، يصرف إليه بعد عمارة البناء. (الدر مع الرد: ٦/٥٦٠، مطلب يبدأبعد العمارة بما أقرب إليها)، الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. الدر مع الرد :۳/۱۸۹، كتاب الزكاة.**

(۲) **المبسوط للسرخسي:۱۱/۱۲۲، كتاب الوديعة، ناشر: دار المعرفة بيروت.**

(۳) مستفاد از عزیز الفتاوی:۶۴۸، اس میں امانت کے روپے سے تجارت کر کے حاصل کردہ نفع سے متعلق لکھا ہے، یہ روپیہ جو عمر کو نفع میں حاصل ہوا سود نہیں؛ مگر ''عمر'' نے جو بلا اجازت ''زید'' کے یہ تصرف امانت میں کیا اچھا نہیں کیا، اس کی اجازت سے لے لے، بعد اجازت زید کے، عمر کے لیے وہ نفع بالکل حلال ہے اور بلا اجازت اچھا نہیں ہے۔ انتہی

(۵) ترغیباً ایسا کہہ دینے میں حرج نہیں، یہ رشوت میں داخل نہیں، **الرشوة: ما يأخذه الآخذ ظلمًا بجهة يدفعه الدافع إليه من هذه الجهة، وفي البرجندي: الرشوة: مال يعطيه بشرط أن يعينه والذي يعطيه بلاشرط فهو هديّة كذا في فتاوى قاضي خان. قواعد الفقه: ۳۰۷، ط: اشرفي.** فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی اللہ عنہ مفتیان دارالعلوم دیوبند

عورتوں کے پردے اور لباس سے متعلق بعض احکام

عورتوں کے لیے چہرہ چھپانے کا حکم

(آیات واحادیث کی روشنی میں)

گرامی قدر عالی منزلت جناب مفتی صاحب .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، خدمتِ اقدس میں درج ذیل سوال حاضر ہے امید ہے کہ مدلل جواب عطا فرمائیں گے۔

سوال: ﴿۱۷﴾......(۱) فرانس میں برقع پہننے پر پابندی لگانے کی حکومتی سطح پر تیاری چل رہی ہے، فرانس کے صدر کا بیان برقع پر پابندی کے حق میں آچکا ہے، فرانس کے ممبرانِ پارلیامنٹ کی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو مسلمانوں میں برقع کی حیثیت کو جاننے کی کوشش کررہی ہے، وہ کمیٹی مولانا لوگوں سے یہ پوچھتی ہے کہ مذہب اسلام میں جب عورت کے لیے چہرہ کھولنے کی گنجائش ہے تو پھر مسلمان برقع پر پابندی کے خلاف احتجاج کیوں کرتے ہیں؟ تو کیا عورت کے لیے چہرہ کھولنا درست ہے؟ کیا اس گنجائش سے ہمیں حجاب کی اہمیت سے دست بردار ہوجانا چاہیے؟ فقط والسلام

المستفتی: محمد ازہر جونپوری (۱۳۳۳/د/۱۴۳۰ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

قرآن کی سات آیات اور حدیث کی ستر روایات سے پتا چلتا ہے کہ شریعت کا اصل مطلوب ایسا حجاب (پردہ) ہے، جس میں عورتوں کا وجود ان کی نقل وحرکت ان کا لباس، ظاہر اور چھپی ہوئی زینت

کا کوئی حصہ کسی اجنبی مرد کو نظر نہ آئے۔

ایسا پردہ گھر کی چہار دیواری یا معلق پردوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے، یہی عورت کا اصل مقام ہے اور یہ حجاب (پردہ) کا اول درجہ ہے، جس کا حکم آیاتِ ذیل میں دیا گیا ہے۔

(۱) وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (احزاب:۳۳) قرار رکھو اپنے گھروں میں (مراد اس سے یہ ہے کہ محض کپڑا اوڑھ لپیٹ کر پردہ کر لینے پر کفایت مت کرو؛ بلکہ پردہ اس طریقہ سے کرو کہ بدن مع لباس نظر نہ آئے (البتہ ضرورت کے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں) اور پہلے زمانۂ جاہلیت کی طرح اظہار کرتی مت پھرو (جس میں بے پردگی رائج تھی)۔

(۲) وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْاَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ. (احزاب:۵۳) اور جب تم ان (حضرت ﷺ) کی بیویوں سے کوئی چیز مانگو، تو پردے کے باہر سے مانگا کرو یہ بات تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

پہلی آیت میں گھر میں رہنے کا پابند کیا گیا اور بلاضرورت نکلنے سے منع کیا گیا ہے۔ بغیر ضرورت گھر سے نکلنا وہ بھی بلا پردہ اور بلا نقاب شریعت میں قطعاً ممنوع ہے۔

دوسری آیت میں عورتوں کو پس پردہ رہنے کا حکم ہے اور مردوں کو یہ حکم ملا ہے کہ بوقت ضرورت کوئی سامان لینے کا موقع آئے (یا بات کرنے کی ضرورت پیش آئے) تو اس وقت بھی پردہ کی آڑ سے لیں، نامحرم کے روبرو آنا حرام ہے۔ یہ حجاب کے سلسلے میں پہلی آیت ہے؛ جس کے ذریعہ حجاب (پردہ) کی فرضیت کا حکم دیا گیا، اگر کسی ضرورت کے وقت نکلنا ناگزیر ہو جائے تو اس کے لیے حجاب کا دوسرا درجہ اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک برقع یا لمبی چادر سے پورے بدن کو چھپا کر نکلے، جس سے چہرہ، ہتھیلیاں، بدن کا کوئی حصہ اور زینت کا لباس ظاہر نہ ہو، راستہ دیکھنے کے لیے صرف آنکھ کھولیں یا برقع میں آنکھ کی جگہ جالی لگالیں، ضرورت کے موقع پر حجاب کا یہ دوسرا درجہ بھی پہلے درجہ کی طرح سب علماء فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے، دوسرے درجہ کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ. (احزاب:۵۹)، اے پیغمبر! کہہ دیجیے اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ (سر سے) نیچی کر لیا کریں اپنے (چہرہ

کے) اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس آیت میں تعلیم ہے گھر سے باہر نکلنے کے ضابطہ کی، جو کسی ضرورت سفر وغیرہ سے واقع ہو کہ اس وقت بھی بے حجاب نہ ہوں؛ بلکہ اپنی چادر کا پلہ اپنے چہرہ پر لٹکالیں تاکہ چہرہ کسی کو نظر نہ آئے، ظاہر ہے کہ اس تصریح کے بعد اس بات کے کہنے کی کب گنجائش ہے کہ چہرہ چھپانا فرض و واجب نہیں، نص قطعی سے چہرہ چھپانے کی صراحت ہے، مجبوری کی صورت مستثنیٰ ہے، اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ گھر سے نکلتے وقت عورت کو اپنا سر اور چہرہ اور بدن چھپانا فرض ہے کہ کسی کو اس کا چہرہ نظر نہ آئے، یہی وہ پردہ مروجہ ہے جو شروع اسلام سے اب تک مسلمانوں میں رائج ہے؛ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک خاتون جن کو ''امّ خلاد'' کہا جاتا تھا حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ ان کے چہرہ پر نقاب تھا اور آکر اپنے مقتول بیٹے کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کرنے لگیں، حضور ﷺ کے صحابہ میں سے کسی صحابی نے ان خاتون سے کہا کہ تم اپنے مقتول بیٹے کے بارے میں پوچھنے آئی ہو اس کے باوجود تم نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈالا ہوا ہے؟ ان خاتون نے جواب دیا کہ اگر میرے بیٹے پر مصیبت آئی ہے تو میری حیاء پر تو مصیبت نہیں آئی (۱)، دوسری روایت میں ہے کہ امّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جب قرآن کریم کی آیت نازل ہوئی ''يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ. الآية''. تو انصار کی خواتین اپنے گھروں سے اس طرح نکلیں کہ گویا ان کے سروں پر کوّے بیٹھے ہیں (۲)۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ ''احکام القرآن'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ جوان عورتوں کو یہ حکم ہے کہ وہ گھر سے نکلنے کے وقت اجنبی مردوں سے اپنا چہرہ چھپالیں۔ في هذه الآية دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها من

---

(۱) عن قيس بن شماس عن أبيه عن جدّه قال: جاء ت امرأة إلى النّبى صلّى اللّه عليه وسلّم يقال لها أم خلاد وهى منتقبة تسأل عن ابنها وهو مقتول، فقال لهابعض أصحاب النّبى صلّى اللّه عليه وسلّم جئت تسألين عن ابنك وأنت منتقبة، فقالت: إن أرزأ ابني فلن أرزأحيائي (أبوداؤد: رقم: ۲۴۸۸، باب فضل قتال الروم على غيرهم).

(۲) عن أمّ سلمة قالت: لما نزلت" يدنين عليهن من جلابيبهن" (الأحزاب: ۵۹)، خرج نساء الأنصار كأن على رؤوسهن الغربان من الأكسية (أبو داؤد رقم: ۴۱۰۱، باب في قوله تعالى يدنين عليهن الآية).

الأجنبيين (۳/۱۴۵۸، احکام القرآن)۔

عن ابن مسعود عن النبي صلّى اللّه عليه وسلّم قال: المرأة عورة فإذاخرجت استشرفها الشيطان (رواه الترمذی)۔

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت سراپا ستر (پردہ) ہے جب وہ باہر نکلتی ہے شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے۔

حجاب اجنبی (نامحرم) مردوں سے ہوتا ہے؛ جس میں زینت کی چیزوں کا چھپانا بھی فرض ہے۔ **وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ.** (نور:۳۱) ترجمہ: آپ مسلمان عورتوں سے فرما دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا حسن و جمال نہ دکھایا کریں، مگر جو چیز کھلی رہتی ہے تو خیر، اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لیں۔ اس آیت میں صاف حکم ہے حسن و جمال کے چھپانے کا، جو حقیقت ہے پردہ کی اور یہ جو فرمایا ''مگر جو چیز کھلی رہتی ہے'' مراد اس سے چہرہ اور ہتھیلی ہے جو ضرورت کے وقت (مثلاً ازدحام، شہادت وغیرہ کے موقع پر) بہ طور رخصت کھولنا جائز ہے، ان دونوں چیزوں کا استثناء ستر سے ہے، حجاب سے نہیں؛ اسی لیے دورانِ نماز ان کا چھپانا ضروری نہیں؛ لیکن باہر نکلنے کی صورت میں بلا ضرورت کھولنا جائز نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عورت کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ سرِ بازار چہرہ کھول کر اپنا حسن و جمال دکھاتی پھرے، حسن و جمال کا تمام دار و مدار چہرہ پر ہے، اور اصل فریفتگی چہرہ پر ہی ختم ہے؛ اس لیے شریعت نے زنا کا دروازہ بند کرنے کے لیے نامحرم کے سامنے چہرہ کھولنا حرام قرار دیا، صاحب تفسیر ابن کثیر **إلا ما ظهر منها** کے تحت لکھتے ہیں کہ **ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها أي لا يظهرن شيئاً من الزينة للأجانب إلا ما لا يمكن إخفاؤه**[۱] (تفسیر ابن کثیر)۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے پردہ کا جو حکم ہے اس میں چہرہ بھی داخل ہے، اصل حکم چہرہ ڈھانکنے کا ہی ہے اور زینت میں عورت کے عمدہ کپڑے یا زیور جسے وہ پہنے ہوئے ہو بھی داخل ہے اور ظاہر ہے کہ چہرہ اور دوسرے مواقعِ زینت اور سامان زینت کپڑے زیور وغیرہ کا

(۱) ابن کثیر: ۶/۴۱، ط: دار الکتب العلمیة.

پردہ، برقع یا اس کے مثل کسی دوسرے کپڑے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے؛ اس لیے مسلمان عورتوں کے لیے پردہ کی فرضیت، پورا کرنے کے لیے برقع یا اس جیسا حجاب کے تقاضہ کو پورا کرنے والا کوئی کپڑا پہننا ضروری اور واجب ہوا؛ اسی لیے قرآن کریم کے ذریعہ اولاً اس بات کا حکم دیا گیا کہ عورت اپنے گھر میں رہے اور بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلے اور اگر کسی ضرورت سے باہر نکلے تو اس کو یہ حکم ہے کہ برقع یا چادر سے اپنے چہرہ کو ڈھانک لے؛ البتہ دوصورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: ایک یہ کہ چہرہ کھولنے کی ایسی ضرورت ہو کہ چہرہ ڈھانکنے میں نقصان ہوتا ہے؛ جیسے بھیڑ میں چلنے کے دوران یا کسی دوسری ضرورت کے وقت؛ مثلاً گواہی وغیرہ دیتے وقت۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسب اور عمل کے وقت بلاقصد اس کا چہرہ کھل جاتا ہو کہ ضرورت کے تقاضے سے چہرہ کھل جانے کی گنجائش ہے؛ البتہ ان دونوں صورتوں میں مردوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ مذکورہ حکم یعنی چہرہ اور ہتھیلی چھپانا نوجوان اور میانہ عمر کی عورتوں کے لیے ہے کیوں کہ بوڑھی عورتوں کے حق میں کچھ تخفیف اس باب میں دوسری آیت میں دی گئی ہے۔

لہٰذا عورت کے لیے چہرہ کھولنے کی اسلام میں گنجائش کی بات علی الاطلاق کہنا درست نہیں ہے، ضرورت کے احکام کی شکل استثنائی ہوتی ہے؛ لہٰذا چہرہ چھپانے کی بابت اسلام کا عام قانون وہ ہے جو اوپر آیات واحادیث کی روشنی میں لکھا گیا، جو بھی اسلام کے اس قانون میں مداخلت کرے گا مسلمانوں کو حق ہے کہ قولاً وعملاً حدودِ شرعیہ میں رہ کر اس کے خلاف احتجاج کریں اور جو عمل پیرا ہونے میں رکاوٹ پیدا کرے مضبوطی سے عمل کر کے اس کی مدافعت کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۷/۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلندشہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

خواتین کے پردے اور ملازمت کے احکام

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

سوال: ﴿۲۷﴾ معاشرہ میں اس وقت عورتوں کی ملازمت اور ذریعۂ آمدنی کے تعلق سے مختلف طریقے عمل میں آرہے ہیں:

(۱) ناچ، گانا، ڈانس وغیرہ کو ذریعہ آمدنی بنانا۔

(۲) ائیر ہوسٹس، کاؤنٹر سیلر، مختلف کمپنیوں کی طرف سے ایجنٹی کا کام (جگہ جگہ جا کر مختلف افراد سے مل کر کمپنی اور اس کے نام یا اسکیم کا تعارف کرانا، سمجھانا)۔

(۳) الف: آفس، دفاتر میں ملازمت کرنا بعض ملازمتیں ایسی ہیں کہ اس میں حرام کام کرنا مثلاً: سودی حساب کا لکھنا، جوئے قمار کے معاملے میں لکھا پڑھی کرنا ہوتا ہے۔

ب: اور بعض ملازمتیں ایسی ہیں کہ نفس کام تو اپنی جگہ جائز اور مباح ہے؛ مگر بے پردگی کے ساتھ مردوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا پڑتا ہے، بے محابہ ان سے بات چیت کرنے کی نوبت آتی ہے۔

ج: اور بعض ملازمتیں ایسی ہیں کہ عورت کو غیر مرد سے اختلاط کی نوبت نہیں آتی، وہ باپردہ ہو کر جاتی ہے اور پردہ میں رہ کر کام کرتی ہے، اس آخری صورت میں اگر عورت کو معاشی تنگی لاحق ہو، اور اگر لاحق نہ ہو تو ان دونوں صورتوں کا حکم شرعی کیا ہے؟ نیز مسلمان عورت کے لیے مذکورہ بالا ملازمتوں میں سے کون کون سی ملازمت جائز اور درست ہے؟ اور کون سی درست نہیں؟ نیز جائز ملازمتوں کی مزید جو شرائط ہوں انہیں وضاحت کے ساتھ تحریر فرماویں۔

(۴) ملازمت کی شرائط وقیود کی رعایت کرتے ہوئے اگر عورت ملازمت کرتی ہے تو کیا اسے والدین یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا؟ نیز عورت کی تنخواہ کی مالک خود عورت ہوگی یا اس کا شوہر؟ اعجاز احمد قاسمی جونپوری یوپی (۳۰۳/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

جاننا چاہیے کہ مسلمان عورت کی ملازمت کے تعلق سے دو چیزیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں: ایک ہے اس کے پردے سے متعلق اسلامی ہدایات واحکام، دوسرے اس کا فی نفسہ کسی ملازمت کو اختیار کرنا۔ عورت کے پردہ کے تعلق سے قرآن وحدیث کی ہدایات بالکل واضح ہیں، شرعاً قابل حجاب حصہ کھلا رکھ کر اس کا کسی نامحرم کے سامنے آنا جائز نہیں، حتیٰ کہ زیب وزینت کے لباس کا ظاہر کرنا اور بے حجاب ہو کر کسی نامحرم کے سامنے آنا بھی منع ہے؛ کیوں کہ حسن وجمال کی چیزوں کو چھپانا ہی درحقیقت پردہ ہے۔ پردہ کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے: **وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولىٰ** (أحزاب: ۳۳) اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھلاتی نہ پھرو؛ جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ**

وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ. (أحزاب:۵۹) اے نبی! کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہ نیچے لٹکا لیں اپنے اوپر تھوڑی سی چادریں۔ تیسری جگہ ارشاد ہوا: وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ. (النور:۳۱) اور کہہ دے ایمان والیوں کو کہ نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار؛ مگر جو کھلی چیز ہے، اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر۔ قرآن کریم کی یہ آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں، پہلی آیت اگر چہ امہات المومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ مگر ظاہر ہے کہ یہ حکم ازواج مطہرات کے ساتھ خاص نہیں؛ اس لیے کہ مفسرین کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس سے پہلی اور بعد والی آیت میں مذکور احکام تمام مومنات کے لیے ہیں، امہات المومنین کے ساتھ خاص نہیں؛ لہٰذا یہ حکم بھی (یعنی گھر میں قرار پکڑنے کا حکم اور بے حجابی کے ساتھ باہر نکلنے کی ممانعت) تمام مومنات کے لیے عام ہے، دوسری آیت میں مومنات کو حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ باہر نکلیں تو اپنے اوپر ایسی جلباب ڈال دیں، جس سے جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو، تیسری آیت میں یہ حکم دیا گیا کہ اگر گھر سے باہر نکلنے کی نوبت آئے تو بہ وقت ضرورت ہاتھ اور چہرہ کھول سکتی ہیں۔ ان تینوں آیات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہائے کرام نے پردے کے تین درجے مقرر فرمائے ہیں: اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عورتیں گھروں کو لازم پکڑیں، اور گھروں میں اپنے آپ کو اس طرح چھپائیں کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ اجنبی کو دکھائی نہ دے؛ کیوں کہ عورتوں کے باہر نکلنے سے فتنہ وفساد کے دروازے کھلتے ہیں اور شیطان کو لوگوں کے دلوں میں خواہشات نفسانی ابھارنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ ان کے ذریعے لوگوں کو اپنے دام فریب میں الجھاتا ہے؛ جیسا کہ حدیث میں ہے: **النساء حبائل الشيطان** (۱) (**واحدها حبالة، وهي ما يصاد بهن من أي شئي كان**) (النهاية). عورتیں شیطان کا جال ہیں، دوسری روایت میں ہے: **عن عبد اللّٰه أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم قال: المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان** (۲) عورت چھپانے کی

(۱) المقاصد الحسنة: رقم: ۱۱۹۵، دار الكتاب العربي.

(۲) ترمذي رقم: ۱۱۷۳.

چیز ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تانک جھانک میں لگ جاتا ہے۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے میں ستائیس گنا ثواب ملتا ہے(۱)؛ مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے عورت کے لیے فرمایا: **صلاتك في دارك خير لك من صلاتك في مسجد قومك**(۲)، گھر کے اندر تمہارا نماز پڑھنا، اپنے قبیلہ کی مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔ ان نصوص سے یہ واضح ہوا کہ عورت کا گھر میں رہنا ہی اصل ہے، اور بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا منع ہے؛ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازی اس سلسلے میں لکھتے ہیں: **إن النساء مأمورات بلزوم البيوت منهيات عن الخروج** (احکام القرآن)(۳)، ترجمہ: عورتوں کے لیے گھروں کو لازم پکڑنے کا حکم ہے، اور باہر نکلنے سے انہیں منع کیا گیا ہے، پردہ کا یہ پہلا اور اعلیٰ درجہ ہے؛ لیکن بسا اوقات عورت کے لیے گھر سے نکلنا ناگزیر ہو جاتا ہے مثلاً: حوائج طبعیہ کے لیے یا کسی شرعی ضرورت کے واسطے؛ اس لیے بوقت ضرورت باہر نکلنے کی اجازت درج ذیل حدیث میں دی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: **إنه قد أذن لكن أن تخرجن لحاجتكن**(۴) تم عورتوں کو قضاء حاجت کی خاطر باہر نکلنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: **ليس للنّساء نصيب في الخروج إلا مضطرة** (۵) (کنز العمال: ۱۶/۳۹۱) عورتوں کے لیے گھر سے باہر نکلنے میں کوئی حصہ نہیں، الا یہ کہ وہ نکلنے پر مجبور ہوں۔

ان روایتوں سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ضرورت و حاجت پر موقوف ہے، پھر ضرورت کے وقت بھی باہر نکلنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی کہ اپنے اوپر ایسی چادر ڈال لیں، جس سے ان کے بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو؛ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: **يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ**. ترجمہ: اور اپنے اوپر چادریں لٹکا لیا

(۱) صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة، بخاري، باب فضل صلاة الجماعة، رقم: ٦٤٥.

(۲) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ٢٦٥٤٩.

(۳) أحكام القرآن للجصاص: ٥/٢٢٩، دار إحياء التراث العربي بيروت.

(۴) بخاري رقم: ٤٧٩٥، باب قوله لا تدخلوا بيوت النبي الأية.

(۵) كنز العمال: ٤٥٠٦٢، موسسة الرسالة بيروت.

کریں۔ (احزاب:۵۹)، جس سے مقصد پورے جسم کو چھپانا ہے، حتی کہ چہرہ کو بھی؛ کیوں کہ عربی میں ''جلباب'' اس چادر کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کا سارا جسم چھپ جائے۔(۱)

حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے اس کے پہننے اور اوڑھنے کا طریقہ بھی مروی ہے وہ فرماتے ہیں: اپنی جلباب کو پیشانی سے موڑ لے، پھر ناک پر موڑے اگر چہ دونوں آنکھیں ظاہر ہو جائیں؛ لیکن سینہ اور اکثر چہرہ چھپائے رہے (۲) یہ پردہ کا دوسرا درجہ ہے جو ضرورتاً باہر نکلنے کی صورت میں بطور رخصت بتلایا گیا ہے۔

چنانچہ مذکورہ آیت کے نازل ہونے کے بعد انصار کی عورتیں گھروں سے نکلیں تو انہوں نے اپنے اوپر کالا کپڑا ڈال لیا، اور ان کے سر اس طرح بے حرکت تھے، گویا ان پر پرندے ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابیات میں اس پردہ کا غایت درجہ اہتمام تھا (۳)۔ حفصہ بنت سیرین نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ عیدگاہ جانے کے لیے اگر ہم میں سے کسی کے پاس جلباب نہ ہو، اس وجہ سے وہ عیدگاہ نہ جا سکے تو کیا اس پر گناہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اس کی سہیلی اپنا جلباب اس کو پہنا دے (بے پردہ نہ نکلے)۔ (بخاری)(۴)

اس کے علاوہ اور بھی روایات ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دور نبوی میں اگر صحابیات

---

(۱) الجلباب في لغة العرب التي خاطبنا بها رسول اللّٰه ــ صلى اللّٰه عليه وسلّم ــ هو ماغطي جميع الجسم لا بعضه، المحلىٰ لإبن حزم: ۳/۲۱۷،دار الفكر بيروت، والجلابيب جمع جلباب وهو ما روي عن ابن عباس الذي يستر من فوق إلى أسفل .روح المعاني : ۲۲/۸۸، دار إحياء التراث العربي، بيروت.

(۲) قال ابن عباس وقتادة: تلوى الجلباب فوق الجبين وتشده ثم تعطفه على الأنف وإن ظهرت عيناها لكن تستر الصدر ومعظم الوجه، وفي رواية أخرى تغطى وجهها من فوق رأسها بالجلباب وتبدى عينا واحدة (المصدر السابق).

(۳) أخرج عبدالرزاق عن أم سلمة قالت: لما نزلت هذه الآية (يدنين عليهن الآية)خرج نساء الأنصار كأن على رؤوسهن الغربان عن السكينة وعليهن أكسية سود يلبسنها (المصدر السابق).

(۴) بخاري رقم: ۱۶۵۲.

کو گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے جسم کو چادر سے ڈھانک کر چہرہ پر بھی لٹکالیا کرتی تھیں، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عورتوں کو شریعت کا حکم یہی ہے کہ اگر گھر سے ضرورۃً نکلیں تو اپنے چہرہ کو بھی چھپا کر نکلیں؛ لیکن بسا اوقات ایسے عوارض بھی پیش آتے ہیں، جن میں چہرہ اور ہتھیلیاں کھولے بغیر چارۂ کار نہیں رہتا، ایسی مجبوری کی حالت میں اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں کھولدے تو جائز ہے، بشرطیکہ فتنہ سے مامون ہو۔

قرآن میں یہ ہدایت ہے کہ عورت اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے؛ مگر جو اس میں کھلی چیز ہے، سورۂ نور میں ارشاد ہے: وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا. (النور:۳۱) آپ مسلمان عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں؛ مگر جو اس میں کھلی چیز ہے۔ اس آیت میں ''ما ظهر منها'' سے مراد مواقع زینت ہیں، ان کی تعیین میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابن عمر اور حضرت عائشہ رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے کہ ''ما ظهر منها'' سے مراد چہرہ اور ہتھیلی ہے، حضرت عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی علیہم الرحمۃ کا بھی یہی قول ہے، فقہائے کرام نے اس ضمن میں ''قدمین'' کو بھی شامل کیا ہے، البتہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک ''ما ظهر منها'' سے جلباب یعنی اوپر والی چادر مراد ہے، اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ زینت کی کسی چیز کو ظاہر کرنا جائز نہیں، بجز ان کپڑوں کے جو ان مواضع زینت کے اوپر ڈالے جاتے ہیں؛ جیسے لمبی چادر یا برقع؛ کیوں کہ ضرورۃً باہر نکلتے وقت ان چادروں کا چھپانا ممکن نہیں، اس لیے اس کو مستثنیٰ کر دیا گیا، مگر قولِ اول؛ یعنی چہرہ اور ہتھیلی مراد ہونے پر بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں؛ اس لیے علماء امت نے اس کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ضرورت اور مجبوری کے وقت چہرہ، ہتھیلی نامحرم کے سامنے کھل جائے تو اس کی گنجائش ہے؛ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

حج کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت فضل بن عباسؓ کو اپنے اونٹ کے پیچھے بٹھایا تھا، قبیلۂ خثعم کی ایک خوب صورت عورت آپ ﷺ سے مسئلہ پوچھنے لگی تو حضرت فضل بن عباسؓ اس کی طرف دیکھنے لگے، آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو پیچھے کیا، پھر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر ان کا چہرہ اس

عورت کی طرف سے پھیر دیا(۱)۔ سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کا چہرہ کھلا ہوا تھا؛ لیکن آپ ﷺ نے اس عورت کو چہرہ ڈھانکنے کا حکم نہیں دیا؛ اس لیے کہ وہ عورت حالت احرام میں تھی یا شاید ازدحام کی وجہ سے ڈھانکنے کا حکم نہ دیا ہو کہ شدید ازدحام میں چہرہ کا پردہ کرنے کی صورت میں گر جانے یا کسی اور تکلیف میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال! یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر عورت کا سارا بدن چھپا ہوا ہو تو ضرورت کے وقت اس کے لیے چہرہ کھولنا جائز ہے، یہ پردہ کا تیسرا درجہ ہے، جو ضرورت اور مجبوری کے وقت کے لیے ہے؛ اسی وجہ سے فقہائے احناف نے عورت کے باہر نکلنے کو دو شرطوں کے ساتھ مقید کیا ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ بلا ضرورت چہرہ نہ کھولے، ضرورت یہ ہے کہ شدید ازدحام ہو، اور اس میں چہرہ چھپانے سے گر جانے کا اندیشہ ہو یا کسی اور تکلیف میں مبتلا ہونے کا خوف ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ چہرہ کھولنے کی صورت میں کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو؛ کیوں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہوگا تو پھر چہرہ کھولنے سے پرہیز کرنا ضروری ہوگا (۲) اور جن صورتوں میں عورت کے لیے ضرورۃً چہرہ کھولنے کی اجازت ہے اور مرد کو اس کے چہرہ کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہو جیسے معالج، تو دیکھنا مباح اس وقت ہوگا جب شہوت سے امن ہو۔

چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے (۳) کہ یہ تمام باتیں اس وقت ہیں، جب دیکھنا شہوت کی نگاہ سے نہ ہو، اگر مرد یہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے سے رغبت پیدا ہو جائے گی تو اس صورت میں اس مرد کے لیے عورت کے اعضاء میں سے کسی عضو کی طرف دیکھنا حلال نہیں، اس لیے کہ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: جس شخص نے کسی اجنبیہ کے محاسن کی طرف دیکھا، قیامت کے دن اس کی آنکھوں میں سیسہ ڈالا

---

(۱) أقبلت إمرأة من خثعم وضيئة تستفتي رسول الله ــ صلى الله عليه وسلّم ــ فطفق الفضل ينظر إليها وأعجبه حسنها فالتفت النّبيّ ــ صلّى الله عليه وسلّم ــ الفضل ينظر إليها فأخلف بيده فأخذ بذقن الفضل فعدل وجهه عن النظر إليها. بخاري رقم: ۶۲۲۸.

(۲) وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنّه عورة بل لخوف الفتنة. الدّرمع الرّد: ۷۹/۲

(۳) وهٰذا كُلُّهُ إذا لم يكن النّظَرُ عَنْ شَهْوَةٍ فإن كانَ يعلمُ أنّه إنْ نَظَرَ اشْتَهَى لَمْ يَحِلَّ لَهُ النّظَرُ إلى شيء منها لقوله صلّى الله عليه وسلّم مَنْ نظرَ إلى مَحَاسِنِ أجْنَبِيَّةٍ عن شَهوةٍ صُبَّ فِيْ عَيْنَيْهِ الآنُكُ يَوْمَ القيامةِ وَقَالَ لِعَلِيٍّ رضي الله عنهُ: لا تُتْبِعْ النّظْرَةَ بعدَ النّظرةِ فإنّ الأولى لك والأخرى عليكَ يعني بالأخرىٰ أنْ يَّقْصِدَهَا عَنْ شَهْوَةٍ. المبسوط شمس الدّين السّرخسي: ۱۵۳/۳، مطبع سعادت، مصر.

جائے گا (۱)؛اس لیے کہ پہلی نگاہ تمہارے لیے حلال ہے اور دوسری نگاہ تم پر وبال ہے (۲)؛یعنی دوسری نگاہ اگر شہوت کے قصد سے ڈالی گئی۔

حنفیہ کے ساتھ ائمہ ثلاثہ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ لذت حاصل کرنے کی نیت سے یا فتنہ کے اندیشہ کے وقت عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنا حرام ہے،اور شافعیہ وحنابلہ کا راجح قول یہ ہے کہ فتنہ سے امن کے وقت بھی چہرے کی طرف دیکھنا حرام ہے،البتہ حنفیہ اور مالکیہ نے فتنہ سے امن اور لذت کا قصد نہ ہونے کی شرط کے ساتھ دیکھنے کی اجازت دی ہے۔**كما هو مصرح في كتبهم.**

لیکن اس شرط کا پایا جانا، فی زماننا بہت مشکل ہے؛بلکہ مفقود کے درجہ میں ہے؛ اس لیے متاخرین حنفیہ نے مطلقاً عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنے سے منع کیا ہے۔علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

فإن خاف الشهوة أو شك امتنع نظره إلى وجهها، فحل النظر مقيد بعدم الشهوة وإلا فحرام، وهذا في زمانهم وأما في زماننا فمنع من الشابة أي لا؛ لأنه عورة بل لخوف الفتنة. (الدر مع الرد:۵۳۲/۹،كتاب الحظر والإباحة)

اس موقع پر پردہ سے متعلق بعض تفصیل اس بناء پر ذکر کی گئی کہ معاشرہ میں بے پردگی اور بے حیائی کی ایمان سوز فضا عام ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ ملازمت کا اقدام کرنے سے پہلے مسلمان عورت، پردہ کی اہمیت کے پہلو سے بھی اس پر غور کرلے۔جہاں تک عورت کی ملازمت کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے اصالۃً عورت پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے؛ بلکہ مردوں کو کسب معاش کا مکلّف بنایا ہے؛ چنانچہ شادی تک لڑکیوں کا نان ونفقہ والد کے ذمہ اور شادی کے بعد شوہر پر واجب قرار دیا ہے،یہی لوگ اس کے نان ونفقہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ.** (النساء:۳۴)مرد حاکم ہیں عورتوں پر،اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کیے انہوں نے اپنے مال۔

ارشادِ نبوی ہے:**المرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده. الحديث** (بخاری: رقم: ۵۲۰۰) یعنی عورت شوہر کے اہل خانہ اور اس کے بچے کی نگراں اور ذمہ دار ہے،اس کے بارے میں (قیامت کے دن) اس سے باز پرس ہوگی۔متفق علیہ

(۱) نصب الرّاية :۳۰۸/۴، دارالحديث مصر.

(۲) لا تتبع النّظرة النّظرة فإن لك الأولى وليست لك الآخرة، ترمذي رقم:۲۷۷۷،باب نظر المفاجاة.

یہی اصول عین فطرت کے مطابق ہے،جس کا تقاضا یہ ہے کہ مرد پر کمانے کی ذمہ داری ہواور عورت اندرون خانہ کی ذمہ داری انجام دے؛ لہٰذا کسی عورت کو اگر نفقہ کی تنگی یا مخصوص حالات کے تحت معاشی بدحالی نہیں تو محض معیار زندگی بلند کرنے اور ترقّہ کی زندگی بسر کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل کر ملازمت کے لیے پیش قدمی کرنا، شریعت کی نظر میں پسندیدہ امر نہیں، اور یہ اس تقسیم کے مغایر ومنافی ہے، جو شریعت نے خانگی اور اکتسابی امور میں ملحوظ رکھی ہے، البتہ اندرون خانہ رہ کر بعض گھریلو امور: ہینڈ لوم پر صنعت کاری، کشیدہ کاری، سلائی، کڑھائی، ہوم ٹیوشن وغیرہ، ایسے کام جس میں گھر سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آتی ہو، شوہر کی اجازت سے کرنے میں حرج نہیں، اس طرح کے کام کرنا بلا کراہت جائز ہے؛ بشرطیکہ گھر کی بنیادی ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں؛ مثلاً: عبادات اور شوہر اور بچوں کے حقوق۔

بہر حال گھر کے اندر ایسے امور کا انجام دینا، جس سے شوہر کو کوئی ضرر لاحق نہ ہو، عورت کو اس سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بالخصوص جب کہ شوہر گھر میں موجود نہ ہو؛ کیوں کہ عورت کے اپنے گھر میں یونہی بیکار پڑے رہنے سے شیطانی وساوس اور برے خیالات جنم لیں گے یا اجنبیوں اور پڑوسیوں سے بیکار باتوں میں مشغولیت رہے گی، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی باتیں نقصان دہ ہیں(۱)۔ البتہ شوہر اگر ان کاموں سے منع کردے تو اس کی اطاعت اور حکم کی بجا آوری ضروری ہوگی؛ کیوں کہ جب شوہر کو نفلی عبادات سے روکنے کا حق ہے تو اس قسم کے کام میں مشغولیت سے روکنے کا حق بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ **لا يحل للمرأة أن تصوم وزوجها شاهد إلا بإذنه** (۲)۔ اسی طرح علامہ قاضی خاں نے لکھا ہے کہ مرد کو اختیار ہے کہ عورت کو سوت کاتنے سے روک دے۔ **للزوج أن يمنع المرأة من الغزل** (خانيه على الهندية: ۱/۴۴۲، فصل حقوق الزوجية). علامہ ابن نجیم نے اس کی توضیح میں لکھا ہے کہ ''غزل'' کی تخصیص نہیں؛ بلکہ ہر وہ کام جسے ذریعۂ معاش بنایا جاسکتا ہو، اس سے روکنے کا اختیار شوہر کو ہے؛ کیوں کہ بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری شریعت نے شوہر پر عائد کی ہے۔ **وينبغي عدم تخصيص الغزل بل له أن يمنعها عن الأعمال كلّها**

(۱) أما العمل الذي لا ضرر له فيه فلا وجه لمنعها عنه، خصوصاً في حال غيبته من بيته فإن ترك المرأة بلا عمل في بيتها يؤدي إلى وساوس النفس والشيطان أو الاشتغال بما لا يعني مع الأجانب والجيران. الدر مع الرد: ۵/۳۲۵، باب النفقة.

(۲) بخاري: ۵۱۹۵.

المقتضية للكسب ،لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه(۱)؛ لیکن اگر عورت کو معاشی تنگی کا سامنا ہو اور شوہر اس کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہو یا وہ تساہلی کرتا ہو اور گھر میں رہ کر عورت کے لیے کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنا ممکن نہ ہو تو ایسی مجبوری اور ضرورت کے وقت اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے؛ جیسا کہ فقہائے کرام نے معتدۃ الموت کے لیے کسب معاش کے واسطے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے(۲)؛ مگر اس قسم کی مجبوری اور ضرورت کے وقت باہر نکل کر ملازمت کرنے کے جائز ہونے کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ ملازمت کا کام فی نفسہ جائز ہو، ایسا کام نہ ہو جس کا کرنا شرعاً ناجائز ہو، چنانچہ بار یا ہوٹلوں میں رقص کر کے یا ناچ گانے کی محفل میں شرکت کر کے یا کسی طریقہ سے جسم کی نمائش کر کے پیسے جمع کرنا یا ایسے ادارہ میں نوکری کرنا، جو اسلام اور اس کی تعلیمات کی بیخ کنی کے لیے قائم کیے گئے ہوں، یا وہاں کفر وشرک کو فروغ دینے کی کوششیں ہوتی ہوں، اس قسم کے گناہ کے کام کرنا یا ان میں کسی طرح کا تعاون کرنا خود ناجائز ہے تو ان کاموں کی ملازمت اختیار کرنا، یقینی طور پر ناجائز اور حرام ہوگا۔ **قال اللّٰہ تعالیٰ: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ.** (ترجمہ: نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ وزیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو)، اسی طرح ایسی ملازمتیں جن سے اسلام کی مطلوبہ ستر پوشی فوت ہوتی ہو یا اسلام کے حکم حجاب کی خلاف ورزی کر کے بے حجابی کے مواقع پیدا ہوتے ہوں؛ مثلاً ائیر ہوسٹس، سیلس گرل، سوئمنگ پل، کھیل کود سے متعلق ملازمت، کہ اس طرح کی ملازمت اختیار کرنا کسی مسلمان عورت کے لیے شرعاً ناجائز ہے، خواہ اسے شوہر یا ولی کی اجازت سے اختیار کرے۔ **لقوله صلى الله عليه وسلّم: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق** (۳) ایک مسلمان عورت جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتی ہے، ایمان کے تقاضہ سے اس پر واجب ہے کہ اسلام کے حکم حجاب کو بھی بسر وچشم تسلیم کرتے ہوئے ایسے کام کی

---

(۱) البحر الرائق: ۳۳۲/۴، باب النفقة.

(۲) ومعتدة موت تخرج في الجديدين وتبيت أكثر الليل في منزلها؛ لأن نفقتها عليها، فتحتاج للخروج (الدر)، وفي الشامي: قال في الفتح: والحاصل أن مدار حل خروجها بسبب قيام شغل المعيشة فيتقدر بقدره: ۲۲۵/۵، الدر مع الرد.

(۳) مصنف ابن أبي شيبة: ۳۴۲۸۱.

ملازمت جو خود ناجائز اور ممنوع ہیں یا ان کے اختیار کرنے میں اسلام کے مطلوبہ حکم حجاب کی خلاف ورزی لازم آتی ہو، اختیار کرنے سے اجتناب کرے۔

اور اس وقت جب کہ ملازمت جائز کام کی ہو اور خاص حالات کے تحت عورت کے لیے اس کا اختیار کرنا، ناگزیر ہو جائے تو دوسری ضروری شرط ستر وحجاب کے احکام کی پوری پابندی کرنا ہے، اس کی تفصیل شرعی تعلیمات کی روشنی میں درج ذیل ہے۔

(الف) شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو، شدید ضرورت کے وقت اگر چہ چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے، مگر فتنہ کا خوف ہو تو پھر اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے، موجودہ دور جو کہ فتنہ کا خطرناک دور ہے، اس میں عام حالات میں حکم چہرہ نہ کھولنے کا ہوگا۔

(ب) لباس دبیز سادہ اور جسم کے لیے ساتر ہو بھڑک دار جاذب و پرکشش اور نیم عریاں قسم کا نہ ہو، اور ایسا بھی نہ ہو، جس سے جسم کا کوئی حصہ نمایاں ہوتا ہو۔ حدیث شریف میں ایسے لباس سے ممانعت اور اس کے پہننے والیوں پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ چناں چہ مسلم شریف میں ایک حدیث ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ: بہت سی کپڑا پہننے والی عورتیں ننگی ہوتی ہیں، وہ خود مائل ہوتی ہیں اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں، ان کے سر بختی اونٹ کے جھکے ہوئے کوہان کی طرح ہوتے ہیں، نہ وہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی، جب کہ اس کی خوشبو اتنی اتنی مسافت سے پائی جاتی ہے۔(۱)

(ج) بناؤ سنگار اور زیب وزینت کے ساتھ اور خوشبو لگا کر نہ نکلے، قرآن کریم میں اس سے ممانعت وارد ہوئی ہے، ارشاد باری ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى. (احزاب: ۳۳) اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں۔

حدیث میں بھی خوشبو لگا کر نکلنے والی عورت کو زانیہ قرار دیا گیا ہے(۲)۔

(د) مردوں سے اختلاط نہ ہو، اگر کبھی کسی مرد سے اتفاقیہ گفتگو کی نوبت آئے تو عورت لوچ دار

---

(۱) نساء كاسيات عاريات مائلات مميلات رؤوسهن كأسنِمَة البخت المائلة لا يدخلن الجنة ولا يجدن ريحها وإن ريحها ليوجد من مسيرة كذا وكذا. مسلم شريف: ۳۹۷۱۔

(۲) كل عين زانية والمرأة إذااستعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني زانية. مشكوة.

طرز گفتگو کے بجائے سخت لہجہ اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ . (احزاب:۳۲)

ایسا زیور پہن کر نہ نکلے جس سے آواز آتی ہو۔ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَايُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ . (النور:۳۱) اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنے سنگار۔

(ھ) ملازمت کرنے کی وجہ سے خانگی امور میں لا پرواہی نہ ہو، جس سے شوہر، بچوں کے حقوق ضائع ہوں؛ کیوں کہ عورت کی اولین اور اہم ذمہ داری بچوں کی تعلیم وتربیت اور امور خانہ داری اور خانگی مسائل میں شوہر کی شریک وسہیم ہونا ہے(۱)، ملازمت ثانوی درجہ کی چیز ہے، شریعت نے عورت کو اس کا مکلّف بھی نہیں بنایا ہے۔

(و) راستہ پر امن ہو، یعنی آمدورفت کے دوران کسی شر اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

مذکورہ باتیں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، فقہائے کرام نے ان کی بالتفصیل صراحت کی ہے؛ لہٰذا ان شرائط کا لحاظ رکھتے اور ان پر عمل کرتے ہوئے اگر جائز کام کی ملازمت عورت اختیار کرے تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، مگر غور کا مقام ہے کہ اکثر جگہوں میں دوران ملازمت ان میں سے بیشتر شرطیں مفقود ہوتی ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ جہاں عورتوں کی ملازمت سے بظاہر کچھ فوائد محسوس کیے جاتے ہیں، وہیں معاشرے میں بہت زیادہ خراب اثرات بھی اس سے پیدا ہورہے ہیں، مثلاً خاندانی رکھ رکھاؤ کا کم ہوجانا، باہمی میل محبت کا کم ہوجانا، بسا اوقات زوجین کے مزاج وانداز میں دوری پیدا ہونا، بچوں کی تربیت نرسری کے حوالے کرنا، نیز عورت کی ملازمت ہی کے نتیجے میں طلاق اور تفریق کے مسائل اور دوسری خرابیاں بکثرت رونما ہورہی ہیں، اس سلسلہ میں ماہنامہ ''الفرقان'' کا ایک چشم کشا اقتباس ملاحظہ ہو———:

''نیز خواتین کی ملازمت اخلاقی اعتبار سے بھی کافی نقصان دہ ہے، مخلوط ماحول میں مردوں اور عورتوں کی ملازمت اخلاقی بے راہ روی کو جنم دیتی ہے، اور خاص طور پر عورتوں کے جنسی استحصال کے

---

(۱) والمرأة راعية علـى أهـل بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنهم متفق عليه. (البخاري: رقم: ۱۳۸۷) خيـر نسـاء ركبـن الإبـل، صـالح نساء قريش، أحناه على ولد في صغره وأرعاه على زوج في ذات يده متفق عليه (البخاري: رقم: ۵۰۸۲).

واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں، یہ بات صرف مغربی ممالک میں ہی پیش نہیں آتی؛ بلکہ ہندوستان جیسے ملک، جہاں عورتوں کی ملازمت کی شرح مغربی ممالک سے کم ہے، وہاں بھی ایسے واقعات کی کثرت ہے؛ چنانچہ ابھی دہلی کی ایک غیر سرکاری تنظیم .C.F.T.I (center for transforming india) نے ملک کے چھ بڑے شہروں کی اطلاعاتی ٹکنالوجی (I.T) سے متعلق شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ کی جانے والی جنسی زیادتی کے بارے میں ایک سروے کیا ہے، اس رپورٹ میں مذکورہ تنظیم نے یہ چونکا دینے والا انکشاف کیا کہ ان شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں کی اکثریت ۸۸٪ فیصد کو تلاش معاش کی جدوجہد کے دوران جنسی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس رپورٹ میں لرزا دینے والی یہ صورت حال بیان کی گئی ہے کہ ان میں سے ۹۱٪ کی اکثریت نے اس کی کہیں شکایت نہیں کی ہے، اور پچاس فیصد عورتیں تو اس کو پیشہ وارنہ زندگی کا لازمی حصہ مان کر اس پر راضی ہیں''۔

(ماہنامہ الفرقان جنوری ۲۰۱۱ء ص:۴۶)

حاصل یہ کہ عورت کے لیے ملازمت بوقت ضرورت اختیار کرنے کی صورت میں، پہلی شرط یہ ہے کہ جائز کام کی ملازمت ہو، دوسری یہ ہے کہ پردہ کا اہتمام ہو، ایسی ملازمت جس میں غیر مردوں سے اختلاط یا نامحرموں سے بات چیت یا تنہائی کی نوبت آتی ہو جائز نہیں؛ کیوں کہ اس صورت میں ملازمت اگرچہ فی نفسہ جائز ہے، اس کی آمدنی بھی جائز ہے، مگر ناجائز امر کے شامل ہونے کی وجہ سے ایسی ملازمت کا اختیار کرنا، ناجائز قرار پائے گا؛ لہٰذا اگر کسی عورت کو واقعی معاشی تنگی کا سامنا ہونے کی بناء پر ملازمت ناگزیر ہوجائے تو بوقت ضرورت ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں اسے اللہ اور اس کے رسول پر کامل ایمان اور اسلام کے احکام پر پختہ یقین رکھنے والی مسلم خاتون کی طرح حجاب کی شرعی ہدایات پر کار بند اور عمل پیرا ہونے میں فخر محسوس کرنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ اسلام کا خصوصی حکم اور اس کا شعار ہے، اب عورت اپنے حالات میں خود غور کرلے کہ اس کی ضرورت کیسی ہے ، اور ملازمت اختیار کرنے میں کیا کیا امور ناجائز و گناہ پیش آسکتے ہیں، جن سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنا اور خلافِ شرع امور سے اجتناب کی راہ اختیار کرنا، عورت کی خود اپنی ذمہ داری ہے۔

عورت اگر اپنی ذاتی محنت سے کچھ کماتی ہے تو از روئے شرع اس پیسے کی مالک عورت ہوگی،

شوہر اس کا مالک نہ ہوگا؛ جیسا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کام کر کے پیسہ حاصل کرتی تھیں اور پھر اس کو صدقہ کر دیتی تھیں، جو ملکیت کی دلیل ہے(۱)۔

اگر چہ آپ کے تمام سوالات کے جوابات بالتفصیل اوپر آ گئے ہیں، تاہم بالترتیب سوالات کے جوابات مختصر لفظوں میں لکھے جاتے ہیں:

(۱) ایک مسلمان عورت کے لیے یہ جائز نہیں۔

(۲) جائز نہیں۔

(۳) الف: سودی حساب کتاب، جوئے قمار کے معاملے کی لکھا پڑھی کرنے کی ملازمت جائز نہیں۔(ب) مطلوبہ شرعی پردہ کے فقدان کی وجہ سے جائز نہیں۔(ج) معاشی تنگی نہ ہونے کی حالت میں مکمل شرعی پردہ کی رعایت کرتے ہوئے بھی ملازمت کے لیے باہر نکلنا شرعاً پسندیدہ نہیں، البتہ معاشی تنگی کی صورت میں اگر پردہ کی مکمل رعایت اور دیگر شرائط کو ملحوظ رکھا جائے تو جائز ہے۔(د) باہر نکلنے میں پردہ کی مکمل رعایت ہو، لباس دبیز سادہ اور جسم کے لیے ساتر ہو، بھڑک دار نہ ہو، بناؤ سنگار کر کے اور خوشبو لگا کر نہ نکلے، مردوں سے اختلاط نہ ہو، اگر اتفاقیہ کسی مرد سے کلام کی نوبت آئے تو سخت لہجہ میں گفتگو کرے، لوچ دار انداز میں کلام کرنے سے پرہیز کرے، ایسا زیور پہن کر نہ نکلے جس سے آواز آتی ہو، ملازمت کی وجہ سے خانگی امور میں لاپرواہی نیز شوہر اور بچوں کے حقوق سے بے اعتنائی نہ ہو، راستہ پرامن ہو۔

(۴) الف: اندرون خانہ یا بیرون خانہ دونوں صورتوں میں ذریعۂ معاش اختیار کرنے کے لیے والد یا شوہر کی اجازت ہونا ضروری ہے، ہاں اگر شوہر ناکارہ ہے، نان ونفقہ میں لاپرواہی کرتا ہے، اندرون خانہ رہ کر مناسب معاش سے گزارہ نہ ہوسکتا ہو تو پھر شوہر کی اجازت ضروری نہیں۔

(ب) عورت اپنی تنخواہ کی مالک خود ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۲/۲/۱۸

الجواب صحیح: محمود حسن بلندشہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

(۱) كانت زينب إمرأة صناعة اليد فكانت تدبغ وتخرز وتصدق في سبيل الله عزوجل. المستدرك رقم:٦٧٧٦،دار الكتب العلمية بيروت.

خواتین کی ملازمت کاحکم

محترم حضرات مفتیان کرام .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال:﴿۴۷﴾کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

کیا مسلم خواتین سرکاری وغیر سرکاری نوکریاں کرسکتی ہیں یا نہیں؟ کرنے اور نہ کرنے کی وجوہات کیا ہیں؟ اگر شوہر تنگدست ہوتو اس صورت میں بیوی کے لیے نوکری کے تعلق سے شریعت کا کیاحکم ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں مذکورہ جزئیات کے جوابات مدلل ومفصل تحریر فرمائیں عین کرم ہوگا۔ فقط والسلام محمد خورشید خادم جامعہ حضرت عثمان بن عفانؓ، احمد پور، لاتور، مہاراشٹر (۱۱۸۰/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

شریعت نے اصالۃً عورت پر کسبِ معاش کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے؛ بلکہ مردوں کو کسبِ معاش کا مکلّف بنایا ہے؛ چنانچہ شادی تک لڑکیوں کا نان ونفقہ والد کے ذمے اور شادی کے بعد شوہر پر واجب قرار دیا ہے، یہی لوگ اس کے نان ونفقہ کے ذمہ دار ہیں۔ **الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ.** (سورہ نساء:۳۴)

ترجمہ: مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالی نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔

اس لیے کسی عورت کو اگر نفقے کی تنگی یا مخصوص حالات کے تحت معاشی بدحالی کا سامنا نہیں، تو محض معیارِ زندگی بلند کرنے اور زندگی میں ترفہ پیدا کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل کر ملازمت کے لیے پیش قدمی کرنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ عمل نہیں؛ لیکن اگر عورت کو معاشی تنگی کا سامنا ہو اور شوہر اس کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہو، یا تساہلی کرتا ہو، یا عورت بیوہ ہو اور گھر میں رہ کر اس کے لیے کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنا ممکن نہ ہو، تو ایسی مجبوری اور ضرورت کے وقت ملازمت کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہوگی؛ چناں چہ حضرات فقہائے کرام نے معتدۃ الوفات کو کسبِ معاش کے لیے دن دن میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے؛ مگر ایسی مجبوری اور ضرورت کے وقت باہر نکل کر

ملازمت کے جائز ہونے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ملازمت کا کام فی نفسہ جائز کام ہو ایسا کام نہ، جو شرعاً ناجائز یا گناہ ہو؛ کیوں کہ ممنوع و ناجائز کام کی ملازمت بہر صورت ناجائز ہے۔

عورت کے لیے ملازمت ناگزیر ہونے کی صورت میں اور اس شرط کے پائے جانے کے ساتھ کہ وہ ملازمت جائز کام کی ہے، دوسری ضروری شرط احکامِ ستر وحجاب کی پوری پابندی کرنا ہے، اس کی تفصیل شرعی تعلیمات کی روشنی میں درج ذیل ہے۔

(الف): شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو، باہر نکلنے کے وقت شدید ضرورت کی حالت میں اگر چہ چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے؛ مگر فتنے کا خوف ہو تو ان کے کھولنے سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے، موجودہ دور جو فتنہ کا خوف ناک دور ہے، اس میں عام حالات میں حکم چہرہ چھپانے ہی کا ہے۔

(ب): لباس دبیز، سادہ اور جسم کے لیے ساتر ہو، بھڑک دار، جاذب، پرکشش اور نیم عریاں قسم کا نہ ہو، اور ایسا لباس بھی نہ ہو، جس سے جسم کا کوئی حصہ نمایاں ہوتا ہو؛ کیوں کہ حدیث میں عورت کے لیے ایسا لباس پہننے کی ممانعت اور وعید وارد ہوئی ہے:

رب نساء كاسيات عاريات مميلات ومائلات، لا يدخلن الجنّة ولا يجدن ريحها وإن ريحها ليوجد من مسيرة كذا وكذا (مسلم شریف: ۱/ ۳۹۷)۔

ترجمہ: کچھ عورتیں ہیں جو کپڑا پہننے والی ہیں (مگر) وہ برہنہ ہیں، دوسروں کو مائل کرنے والی ہیں اور خود بھی مائل ہونے والی ہیں (ایسی عورتیں) ہرگز جنت میں نہیں جائیں گی اور نہ اس کی خوشبو سونگھ پائیں گی حالانکہ اس کی بو اتنی اتنی دور سے آئے گی۔

(ج) بناؤ سنگار اور زیب وزینت کے ساتھ نیز خوشبو لگا کر نہ نکلے، قرآن کریم میں اس سے ممانعت وارد ہوئی ہے ارشاد باری ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلَى (احزاب: ۳۳)، احادیث میں بھی خوشبو لگا کر نکلنے والی عورت کو زانیہ قرار دیا گیا ہے: **كل عين زانية والمرأة إذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني زانية** (ترمذی: رقم: ۲۷۸۶)، ترجمہ: ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے اور عورت جب خوشبو لگا کر مجلس کے پاس سے گذرتی ہے تو وہ زنا کرنے والی ہوتی ہے۔

(د) مردوں سے بالکل اختلاط نہ ہو، اگر کبھی کسی مرد سے اتفاقیہ گفتگو کی نوبت آئے تو عورت

لوچ دار طرزِ گفتگو کے بجائے سخت لہجہ اختیار کرے تا کہ دل میں بے جا قسم کے وساوس وخیالات پیدا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ. (الآیۃ احزاب: ۳۲)، ترجمہ: تم بولنے میں نزاکت مت کرو کہ ایسے شخص کو خیال ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے۔

(ھ) ایسا زیور پہن کر نہ نکلے جس سے آواز آتی ہو۔ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ. (النور: ۳۱)، ترجمہ: اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جاوے۔

(و) ملازمت کرنے کی وجہ سے خانگی امور میں لاپروائی نہ ہو جس سے شوہر اور بچوں کے حقوق ضائع ہوں؛ کیوں کہ عورت کی اولین اور اہم ذمہ داری، بچوں کی تعلیم وتربیت اور امور خانہ داری ہے، ملازمت ثانوی درجہ کی چیز ہے، شریعت نے عورت کو اس کا مکلّف بھی نہیں بنایا۔

(ز) راستہ پرامن ہو؛ یعنی آمد و رفت کے دوران کسی شر اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

مذکورہ شرطیں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، فقہائے کرام نے ان کی صراحت کی ہے، ان شرائط کا لحاظ رکھتے اور ان پر عمل کرتے ہوئے اگر جائز کام کی ملازمت عورت اختیار کرے تو اس کی گنجائش ہو سکتی ہے؛ مگر غور کا مقام ہے کہ اکثر جگہوں میں دورانِ ملازمت ان میں سے بیشتر شرائط مفقود ہوتی ہیں، اور یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ جہاں عورتوں کی ملازمت سے بظاہر کچھ فوائد محسوس کئے جاتے ہیں، وہیں معاشرے پر اس کے بہت زیادہ خراب اثرات بھی پڑ رہے ہیں؛ مثلاً: خاندانی رکھ رکھاؤ ختم ہو جاتا ہے، زوجین کے مزاج وانداز میں ایک دوسرے سے دوری پیدا ہو جاتی ہے، بچوں کی تربیت نرسری کے حوالے ہو جاتی ہے، عورت کی ملازمت ہی کے نتیجے میں طلاق وتفریق کے مسائل بھی بہ کثرت رونما ہو رہے ہیں۔

اگر کسی عورت کو واقعی معاشی تنگی کا سامنا ہونے کی بنا پر ملازمت ناگزیر ہو جائے تو بہ وقت ضرورت ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں اسے اللہ اور اس کے رسول پر کامل ایمان اور اسلام کے احکام پر پختہ یقین رکھنے والی مسلم خاتون کی طرح اسلام کے حکم حجاب کو بھی تسلیم کرتے ہوئے، حجاب کی شرعی ہدایات پر کاربند اور عمل پیرا ہونے میں فخر محسوس کرنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ اسلام کا

خصوصی حکم اور اس کا شعار ہے؛ لہٰذا عورت خود اپنے حالات میں غور کرلے کہ اس کو ملازمت کی ضرورت کس درجہ کی ہے اور ملازمت اختیار کرنے میں کیا کیا امور ناجائز وگناہ کے اسے اختیار کرنے پڑیں گے؛ جن سے ایک مسلم خاتون کی حیثیت سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنا، اس کے ذمہ لازم وضروری ہے، حاصل یہ ہے کہ مجبور کن حالات میں بھی خلافِ شرع امور سے اجتناب کی راہ اختیار کرنا، عورت کی خود اپنی ذمہ داری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

عورت کا پینٹ پہننا اور الیکشن میں حصہ لینا

سوال: ﴿۴۷﴾......(۱) کیا عورتوں کے لیے پینٹ پہننا جائز ہے؟ (یہ پینٹ خصوصی طور پر مرد یا عورت کے لیے نہیں بنے ہوتے ہیں)۔

(۲) کیا یہ جائز ہے کہ عورت الیکشن میں حصہ لے اور سربراہِ مملکت بنے؟ (لوگ کہتے ہیں کہ مولانا تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں اس کی اجازت دی ہے، خصوصاً پارلیمنٹری طرز حکومت ہونے کی صورت میں)۔　　(۱۰۶/ د ۱۴۲۸ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو لباس پہننے کا حکم دیا ہے، اس کے دو مقصد ہیں، تستّــــر (بدن کو ڈھانکنا) اور زینت (۱)، بدن کو ڈھانکنے کی ایک مقدار تو فرض ہے؛ جیسے مرد کے لیے ناف کے نیچے سے گھٹنے تک کہ اس حصہ کو بیوی کے علاوہ کسی دوسرے مرد کو بھی دیکھنا جائز نہیں ہے، اور عورت کے لیے چہرہ، ہتھیلی اور پیر کے علاوہ پورے بدن کا ستر فرض ہے (۲)۔ عورت کو جس طرح پورے بدن کو

(۱) يا بني آدم! قد أنزلنا عليكم لباسًا يواری سواٰتكم وريشا (الاعراف:۲۶).

(۲) وهی للرّجل ما تحت سرته إلٰى ما تحت ركبته......وللحرّة جميع بدنها خلا الوجه والكفّين والقدمين حتّى شعرها النّازل في الأصحّ (الدّرّ مع الرّد: ۲/۷۷) وينظر الرّجل من الرّجل سوى ما بين سرته إلٰى ما تحت ركبته وينظر من الأجنبية إلٰى وجهها وكفّها (الدّر مع الرّد: ۹/۵۲۴).

ڈھانکنا فرض ہے؛ اسی طرح ایسے لباس کے پہننے سے احتراز کرنا لازم وضروری ہے، جو جسم کی ساخت اعضاء کے نشیب وفراز کو ظاہر کرے، جسم کی ساخت اور نشیب وفراز اور اعضاء کا حجم، خواہ کپڑے کے باریک ہونے کی وجہ سے ظاہر ہو یا کپڑے کے موٹے اور دبیز ہونے کے باوجود (کپڑے کے چست ہونے کی وجہ سے) جسم کی ساخت اور اعضاء کا حجم ظاہر ہو رہا ہو، عورت کو ایسے لباس سے احتراز کرنا واجب ہے، ایسی صورت میں کپڑے کے اوپر سے دیکھنا بھی ممنوع ہے؛ کیوں کہ یہ ان اعضاء ہی کے دیکھنے کے حکم میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من تأمل خلف إمرأة ورأى ثيابها حتى تبين حجم عظامها لم يرح رائحة الجنة۔** جس شخص نے کسی عورت کے پچھلے حصہ میں تأمل کیا اور اس کے کپڑے کو دیکھا، جس سے اس عورت کے اعضاء کا حجم (ساخت) ظاہر ہو گیا تو ایسا شخص جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا۔ **وقال الشامي: مفاده أن رؤية الثوب بحيث يصف حجم العضو ممنوعة ولو كثيفاً لا ترى البشرة منه.** (الدر مع الرد:۹/۵۲۶)۔

علامہ شامی نے فرمایا کہ اس کا حاصل یہ ہے کپڑے کو اوپر سے اس طور پر دیکھنا، جو عضو کی ساخت کو ظاہر کر رہا ہو ممنوع ہے، کپڑا خواہ موٹا ہی کیوں نہ ہو جس سے جسم نظر نہ آتا ہو؛ چونکہ عورت کے لیے زینت اور اعضائے زینت کو غیر محرموں سے چھپانا فرض ہے اور پینٹ جیسا لباس پہننے سے اعضاء زینت غیر محرموں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں؛ اس لیے یہ بھی منع ہوگا، نیز قرآن پاک کے اس حکم کی خلاف ورزی بھی اس میں پائی جاتی ہے، جس میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے **وليضربن بخمرهن على جيوبهن** یعنی اپنے دوپٹوں کا آنچل اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔ اس کے علاوہ مردوں کے لباس سے مشابہت اور غیر قوموں کی مشابہت پائی جاتی ہے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من تشبّه بقوم فهو منهم** (۱)، نیز اس میں بے حیائی کا فروغ ہے، جب کہ حدیث میں حیا کو ایمان کا شعبہ قرار دیا گیا ہے، اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: **رب نساء كاسيات عاريات مميلات مائلات** (الحدیث)، یعنی کچھ عورتیں کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی، خود

---

(۱) عن ابن عمر قال: قال رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم: من تشبّه بقوم فهو منهم، (رقم:۴۰۳۱، كتاب اللباس).

بھی غیروں کی طرف مائل ہوں گی اور ان کو اپنی طرف مائل کریں گی، ایسی عورتیں جنت کی خوشبو نہیں پائیں گی(۱)۔

(۲) بخاری شریف میں ہے: **لما بلغ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم أن أهل فارس قد ملکوا علیهم بنت کسری قال: لن یفلح قوم ولّوا أمرهم إمرأة** (۲)، جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسری کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنالیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنا سربراہ عورت کو بنالیا، اس ارشادِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے امارتِ مطلقہ اور سیادتِ عظمیٰ جو کسی کے تابع نہ ہو، عورتوں کے سپرد نہ کرنا چاہیے، یہ چیز باعث فلاح نہ ہوگی۔

ایسا ہی قسطلانی شارح بخاری کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہورِ امت کے نزدیک عورت کو ایسی سربراہی، جس میں عورت واقعی خودمختار اور مطلق العنان ہو، کسی کے تابع نہ ہو درست نہیں ہے، ہاں اگر خودمختار مطلق العنان نہ ہو؛ بلکہ کسی کے تابع ہو اور وقتی ہو تو گنجائش رہے گی؛ جیسا کہ اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے، **وعن أبي حنیفة: تلي الحکم فیما تجوز فیه شهادة النّساء** (۳) یعنی ان مسائل میں جہاں عورتوں کی شہادت جائز ہے، عورت قاضی بن سکتی ہے، یہ حکم نفسِ حکومت کی ذمہ داری قبول کرنے کا ہے، باقی الیکشن میں حصہ لینا جس کے لیے بے پردہ ہونا، اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط اور مردوں کی محفلوں میں بے محابا شرکت لازم ہے اور یہ امور اپنی جگہ ناجائز ہیں، اور ناجائز امور کا مجموعہ بھی ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/۴/۲۴ ۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری

---

(۱) ونساء کاسیات عاریات الخ (الصحیح المسلم: رقم: ۲۱۳۱).

(۲) صحیح البخاري: رقم: ۴۴۲۵.

(۳) الموسوعة الفقهیة، الشرط السّادس: الإذن من الإمام (القضاء)

عورتوں کا ڈرائیونگ کرنا

الحمد لأهله والصّلوٰة على أهلها أما بعد!

فالسّلام عليكم ورحمة الله وبركاته

سوال: ﴿۵۷﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں:

(۱) اگر عورت اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہو اور کوئی غیر محرم نہ ہو اور عورت گاڑی (اپنی چھوٹی کار) چلائے تو جائز ہے یا نہیں؟

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ عورت کا پورا چہرہ کھلا ہوا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ صرف آنکھیں کھلی ہوئی ہوں؛ جیسا کہ آج کل عورت بازار میں سامان خریدنے جاتی ہے، تینوں صورتوں (۱: عورت کا چہرہ کھول کر گاڑی چلانے، ۲: صرف آنکھیں کھول کر چلانے، ۳: بازار میں صرف آنکھیں کھول کر جائیں اور باقی پورے بدن پر برقعہ رہے) کا حکم بیان فرما کر رہنمائی کریں۔

نیز صراحت فرمائیں کہ مأخذِ مسئلہ مذکورہ آیت (**قل للمؤمنٰت يغضضن من أبصارهنّ**) **الآية** ہی ہے یا کوئی حدیث بھی ہے تو اس کی صراحت فرمادیں۔

(۲) اگر عورت اپنے سر کے بالوں پر زینت کے لیے ڈائی (ایک گاڑھے سے مادہ کے ذریعہ کالا یا لال کرانا) کرائے تو جائز ہے یا نہیں؟

ایک تو یہ کہ عورت آزاد مزاج کی ہو اور احکامِ شرعیہ کی بجا آوری نہ کرتی ہو؛ یعنی غیر محرم سے پردہ نہ کرتی ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں جائز نہ ہوگا، دوسرے یہ کہ عورت شریعت کی پابند ہو اور سب سے پردہ کرتی ہو اور وہ ڈائی صرف اپنے شوہر کی خوشی وفرحت کے لیے کرائے تو جائز ہے یا نہیں؟

دونوں صورتوں کا حکم بیان فرما کر رہنمائی کریں۔

عین نوازش ہوگی۔ المستفتی: محمد ریاض احمد غفرلہ متعلم دارالعلوم دیوبند سہارن پور یوپی الہند

۲۹/ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۲/ اگست ۲۰۰۸ء (۱۲۶۰/ د ۱۴۲۹)

الجواب وباللہ التوفیق:

عورت کے لیے باہر نکلنے اور گاڑی چلانے میں موجودہ ماحول کی روشنی میں جو مفاسد ہیں اور

اسلامی احکام کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوگا، وہ آیات قرآنی اور ذخیرہ احادیث پر نظر رکھنے والے سے مخفی نہیں ہیں۔عورتوں کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: **وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى** (الأحزاب: ۳۳) اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔ جاہلیت اولیٰ اور مغربیت حاضرہ میں کیا فرق ہے ! بلکہ مغربیت حاضرہ بے حیائی اور ننگے پن اور نمائش حسن کے رجحان میں اس سے بڑھ کر ہے؛ اس لیے امتثال حکم کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، نیز ارشاد ہے: **واذا سالتموهن متاعاً فسئلوهن من ورآء حجاب، ذٰلكم اطهر لقلوبكم وقلوبهن.** (الأحزاب: ۵۳) یعنی جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کی آڑ سے مانگا کرو، یہ بات تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کو پاک رکھنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورت کو باہر نکلنے کا حق نہیں ہے، بجز یہ کہ وہ مجبور ومضطر ہوجائے (۱)۔حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ عورت سامنے سے بھی شیطان کی صورت میں آتی ہے اور پیچھے سے جاتی ہے تو بھی شیطان کی صورت میں (۲)۔ حضرت ابن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت چھپانے کی چیز ہے (یعنی اسے پردہ میں رہنا ہے)؛ کیوں کہ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک جھانک میں لگ جاتا ہے (۳)۔شیخ ابوسعید الخادمی فرماتے ہیں: **ولا يأذن لها بالخروج إلى المجلس الذي يجتمع فيه الرجال والنساء، فيه من المنكرات كالتصدية ورفع الأصوات المختلفة واللعب .... وقال أيضاً: ولا يدعها أن تخرج من الستر**

---

(۱) عن ابن عمر مرفوعاً: ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة. (كنز العمال، الفصل الأول في الترهيبات، ۱۶/۳۹۱).

(۲) عن جابر ـ رضي الله عنه ـ قال رسول الله ـ صلى الله عليه وسلّم ـ: إن المرأة تقبل في صورة شيطان وتدبر في صورة شيطان. (أخرجه مسلم، رقم: ۱۴۰۳، باب ندب من رأى امرأة، فوقعت في نفسه).

(۳) عن ابن مسعود عن النبي ـ صلّى الله عليه وسلّم ـ قال: المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان. أخرجه الترمذي: ۱۱۷۳.

من البيت فإنها عورة وخروجها إثم (۱). یعنی عورت کا ایسی جگہوں میں جانا جائز نہیں، جہاں عورتوں اور مردوں کا مجمع اکٹھا ہو، شور وشغب گالی گلوج اور دیگر منکرات پائے جاتے ہوں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ پردہ کے ساتھ بھی عورت کا باہر نکلنا (بلاضرورت) درست نہیں؛ کیوں کہ وہ عورت ہے، اسے گھر میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے اس کا باہر نکلنا گناہ ہے۔

فقہائے کرام نے ضرورتِ شرعیہ اور طبعیہ کے لیے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے، جب کہ وہ ضرورت ایسی ہو کہ بغیر باہر نکلے مصیبت ٹلنے یا کام پورا ہونے کی دوسری کوئی سبیل نہ ہو تو ایسی صورت میں پردہ کے ساتھ نکلنے کی اجازت ہے؛ بہ شرطیکہ بناؤ سنگھار کر کے عمدہ کپڑے پہن کر نہ نکلے، جو مردوں کو اس کی طرف نظر اٹھانے اور مائل کرنے کا ذریعہ بنے۔ **قال العلامة ابن عابدين: وحيث أبحنالها الخروج فبشرط عدم الزينة فى الكل وتغيير الهيئة إلىٰ ما لا يكون داعية إلى نظر الرجال واستمالتهم**(۲)**. ولكن يخرجن وهن تفلات.** لیکن ایسے طریقے پر نکلیں کہ برقعہ میں معمولی اور سادہ کپڑے پہنے ہوں۔

جس طرح مردوں کو حکم ہے کہ عورتوں اور (غیر محرم) پر نظر نہ ڈالیں؛ اسی طرح عورتوں کے لیے بھی منع ہے کہ وہ اجنبی مردوں پر نظر نہ ڈالیں۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نامی نابینا صحابی سے اپنی ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم فرمایا(۳)، مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عورتوں کے لیے اصل حکم باہر نکلنے سے ممانعت کا ہے اور اگر بوقت ضرورت نکلیں تو چادر یا برقع سے ان کا سارا جسم مستور رہے، چہرہ ڈھانکنا بھی ضروری ہے؛ البتہ بوقتِ ضرورت آنکھیں کھلی رکھنے اور کبھی ضرورتِ شدیدہ کے وقت چہرہ کھولنے کی بھی اجازت ہے؛ لیکن یہ استثنائی حالت ہے،

---

(۱) البريقة المحمودية ۴/ ۱۵۵،۱۵۶،نقلا عن أحسن الفتاوى ۸/ ۵۰،۵۱۔

(۲) الدر مع الرد ۴/ ۲۹۴، مطلب في منع الزوجة نَفْسها لقبض المهر.

(۳) عن أمّ سلمة أنها كانت عند رسول اللّٰه ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ وميمونة قالت: فبينا نحن عنده، أقبل ابن أم مكتوم فدخل عليه وذٰلك بعد ما أمرنا بالحجاب، فقال رسول اللّٰه ــ صلى الله عليه وسلّم ــ احتجبا منه، فقلت: يا رسول اللّٰه! أليس هو أعمى لا يبصرنا ولا يعرفنا، فقال رسول اللّٰه ــ صلّى اللّٰه عليه وسلّم ــ أفعمياوان أنتما، ألستما تبصرانه. أخرجه الترمذي، رقم: ۲۷۷۸، باب ما جاء في احتجاب النساء من الرجال.

عام حکم نہیں ہے، نیز عورت اگر گاڑی چلا کر باہر نکلے گی تو اس کے ساتھ کچھ اور خرابیاں بھی آسکتی ہیں؛ اس لیے عام حالات میں گاڑی چلا کر باہر جانا عورت کے لیے ممنوع رہے گا، ہاں! اگر ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر باہر نکلنا ناگزیر ہو جائے اور کوئی شرعی محذور نہ پایا جائے؛ نیز پردہ کا پورا اہتمام بھی ہو تو ایسے وقت گاڑی چلا کر نکلنے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر باہر نکلنے میں بے پردگی کا امکان ہو یا مردوں سے اختلاط کی نوبت آئے تو ایسے وقت باہر نکلنا ہی اس کے لیے ناجائز ہے تو گاڑی چلانا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔

(۲) دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ڈائی لگانے کی اجازت صرف اس شکل میں ہے کہ وہ کالے رنگ کی نہ ہو، نیز اس میں کسی ناجائز چیز کی آمیزش نہ ہو اور لگانے کے بعد صرف رنگ چڑھتا ہو اس کی پرت (تہہ) نہ جمتی ہو؛ کیوں کہ پرت جمنے کی صورت میں وضو اور غسل درست نہ ہوگا۔

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۰/ ۷/ ۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ، محمود حسن بلندشہری غفرلہ

وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

عورتوں کا باہم مصافحہ کرنا

سوال: ﴿۷۶﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

مرد اپنی محرم عورت سے یا ایک عورت دوسری عورت سے مصافحہ کر سکتی ہے یا نہیں؟ حکمِ شرعی کیا ہے مستحب یا سنت یا کچھ اور؟ صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے دور میں اس کا رواج تھا یا نہیں؟ نیز تینوں زمانوں میں اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

محمد راشد منگلوری ۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ (۱۸۳۶/ د ۱۴۳۰ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

حضرت ابی امامہؓ کی روایت ہے جس کا ایک جزیہ ہے: **وتمام تحیاتکم بینکم المصافحة** (۱). یعنی سلام کی تکمیل آپس میں مصافحہ کرنے سے ہوتی ہے، نیز ایک دوسری روایت

(۱) أخرجه أحمد في مسنده، رقم: ۲۲۲۳٦.

میں ہے: **إن المؤمن إذا لقي المؤمن فسلم عليه وأخذ بيده فصافحه تناثرت خطاياهما كما يتناثر ورق الشجر. رواه الطبراني** (۱). فقہاء کرام نے بھی مصافحہ کو سنتِ قدیمہ متوارثہ قرار دیا ہے اور ہر ملاقات پر اسے مستحب کہا ہے۔ ان روایات واقوال سے جہاں مانعِ شرعی موجود نہ ہو، ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے کا استحباب معلوم ہوا؛ لہٰذا مرد کے لیے اپنی محرم عورتوں سے مصافحہ کرنا (جب کہ کسی فتنہ کا خوف نہ ہو) اور عورت کا عورت سے مصافحہ کرنا بھی مستحب ہوا، حدیث وقرآن کے خطاب میں بالعموم مخاطب اول مرد ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی وجہِ تخصیص نہ ہوئی تو خطاب اور حکم عورتوں کو بھی شامل ہوتا ہے؛ لہٰذا **تمام تحياتكم الحديث** میں عورتیں بھی شامل ہیں؛ اسی طرح: **المؤمن إذا لقي المؤمن** میں عورتیں بھی داخل ہیں، پس مرد کا اپنی محرم عورت سے، جب کہ فتنہ یا شہوت کا مظنہ نہ ہو، مصافحہ کرنا مستحب ہوا، رسول اللہ ﷺ کا اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مصافحہ کرنا اور ان کی انگلی پکڑنا اسے چومنا روایت میں وارد ہے (۲)، اور عورت کا عورت سے مصافحہ کرنا اگر چہ کسی واقعہ میں اس کا ذکر صراحۃً نہیں ملا اور ایسے امور عادیہ کا ذکر صحابیات کے تذکروں میں نہ ملنا کوئی محلِ استعجاب نہیں؛ لیکن عمومِ ادلہ سے ملاقات کے وقت مصافحہ کے مستحب ہونے کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے؛ البتہ اجنبیہ سے

(۱) ترجمہ: ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملنے کے بعد اس کو سلام کرے اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کرے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں، جس طرح درخت سے پتے جھڑتے ہیں۔

(۲) **عن عائشة قالت: ما رأيت أحداً كان أشبه سمتاً وهدياً ودلاً. وفي رواية حديثاً وكلاما برسول الله ـ صلى الله عليه وسلّم ـ من فاطمة، كانت إذا دخلت عليه، قام إليها فأخذ بيدها فقبّلها وأجلسها في مجلسه، وكان إذا دخل عليها، قامت إليه، فأخذت بيده، فقبّلته وأجلسته في مجلسها. (أبو داؤد، رقم: ۵۲۱۷، باب ما جاء في القيام)**

قال الملا علي القاري: فأخذ بيدها فقبّلها أي بين عينيها ورأسها، والأظهر الأول، كمارواه ابن عدي والبيهقي .... وكان إذا دخل عليها قامت إليه فأخذت بيده، فقبّلته أي عضوا من أعضائه الشريفة، والظاهر أنه اليد المنيفة. (مرقاة المفاتيح: ۸/۴۶۹، باب المصافحة والمعانقة).

مصافحہ کرنا حرام ہے حرمتِ مس کی وجہ سے، اور محرم عورت سے اگر فتنہ اور شہوت کا ڈر نہ ہو مصافحہ مستحب ہے؛ اسی طرح عورت کا عورت سے ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/ ۸/ ۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن غفرلہ بلند شہری، فخر الاسلام عفی عنہ، وقار علی غفرلہ

سود، رشوت اور ٹیکس کے بعض مسائل

سود کی رقم ہاؤس ٹیکس میں دینے کے عدم جواز کی وجہ

حضرت والا .... سلام مسنون!

سوال: ﴿۷۷﴾ عرض خدمت ہے کہ میں نے دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے ایک فتوی مانگا تھا، جس کے جواب میں ہمرشتہ فتوی دیا گیا ہے جس کے مطابق بینک سے ملنے والے سود کو (۱) انکم ٹیکس (۲) سیل ٹیکس (۳) ویٹ ٹیکس (۴) کسٹم ڈیوٹی میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے؛ البتہ ہاؤس ٹیکس میں خرچ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، اس میں اشکال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ ا رتا ۴ رمیں دینے کی گنجائش ہے، جب کہ ہاؤس ٹیکس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس دلیل کی بنیاد پر ا رتا ۴ رمیں گنجائش نکالی گئی ہے اور ہاؤس ٹیکس میں ناجائز قرار دیا گیا ہے؛ چونکہ ٹیکس کیسا بھی ہو، بہر حال اس سلسلہ میں دلائل و براہین مطلوب ہیں۔ عنایت فرما کر ممنو فرما دیں۔

شرف الدین بہٹ روڈ آریہ نگر بھگوتی کالونی لین سہارن پور ۲۹/۱۲/۱۸ھ (۲۳۱۶/د ۱۴۲۹ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک کا کاروبار سود پر مشتمل ہوتا ہے؛ جس میں شرکت واعانت ناجائز ہے کما هو مصرح

فی الحدیث (۱)، رقم جمع کرنے سے بھی اعانت ہوتی ہے وہ بھی اس میں شامل ہے؛ البتہ اپنی رقم کے تحفظ کی کوئی صورت نہ ہو یا حکومت کی جانب سے انسان بینک میں رقم جمع کرنے کا پابند ہو ایسی مجبوری کے وقت ضرورۃً بہ نیت تحفظ رقم بینک میں جمع کرنے کی گنجائش ہے (۲)، اس پر ملنے والا سود قطعی حرام ہے، اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے، ایسے حرام مال کا اول حکم تو یہ ہے کہ اصل مالک کو لوٹا دیا جائے؛ لہٰذا بینک سے سود کی رقم نکالنا ہی جائز نہ ہونا چاہیے؛ لیکن جب یہ تحقیق ہوئی کہ اس طرح کی رقموں کو اسلام کے خلاف چیزوں کی ترویج وتعمیر میں خرچ کیا جاتا ہے، تو علمائے کرام نے مجبوراً اس کے نکال لینے کا حکم کیا اور اس رقم کے دوسرے مصرف یعنی فقراء پر بلانیت ثواب صرف کرنے کا فتوی دیا؛ کیوں کہ مال حرام اگر اصل مالک تک واپس نہ کیا جاسکے تو اس کے لیے فقراء میں صدقہ کرنے کا وجوبی حکم ہوتا ہے (۳)۔

اس تمہید کے بعد سمجھئے کہ مذکور فی السوال ٹیکس میں سے ایک تا ۴ر حکومت کے غیر شرعی ٹیکس ہیں، جن کے بدلے ٹیکس دہندہ کو کوئی ذاتی منفعت یا معاوضہ حاصل نہیں ہوتا؛ لہٰذا ان ٹیکسوں میں ادا کردینا گویا کہ حکومت کو ہی واپس کردینا ہوا (کیوں کہ بینک حکومت ہی کی ملکیت ہوتے ہیں اگر کوئی بینک حکومت کی ملکیت نہیں ہے تو اس سے ملنے والا سود مذکورہ ٹیکسوں میں ادا نہ کیا جاسکے گا)؛ اس لیے ان ٹیکسوں میں ادا کرنا جائز ہوا۔

مذکورہ چار ٹیکسوں کے برخلاف ہاؤس ٹیکس، اس میں کہیں واٹر ٹیکس اور سیور ٹیکس بھی شامل ہوتا ہے، اس کی وجہ سے انسان گورنمنٹ سے پانی کی تحصیل کرتا ہے، سیور لائن کی صفائی اور نالی وسڑک

(۱) لعن رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم أكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف رقم: ۱۲۰٦، باب لعن آكل الربا وموكله).

(۲) الضرورات تبيح المحظورات (الأشباه: ۱/۷۲، ط: العلمية).

(۳) (الف) قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك، فسبيله التصدق على الفقراء، قال: إن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوي به فراغ ذمته ولا يرجو به المثوبة (معارف السنن: ۱/۳۴، سعيد، أبواب الطهارة).

(ب) ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه (الدر مع الرد: ۹/۵۵۳، كتاب الحظر والإباحة).

کی صفائی کے منافع حاصل کرتا ہے، ٹیکس انہیں کا معاوضہ ہوتا ہے؛ لہٰذا سود کی رقم دے کر اس کے بدلے میں کوئی منفعت یا معاوضہ حاصل کرنا چونکہ جائز نہیں ہے؛ اس لیے ہاؤس ٹیکس میں سود کی رقم دینا جائز نہیں ہے، اور جن جگہوں میں ہاؤس ٹیکس میں پانی اور سیور کا ٹیکس شامل نہیں ہوتا؛ بلکہ سب ٹیکس الگ الگ وصول کیے جاتے ہیں، وہاں بھی ہاؤس ٹیکس کے بدلے میں آدمی مکان کے سامنے کی نالی اور سڑک کی صفائی کی منفعت حاصل کرتا ہے، جو سود کی رقم ادا کرکے حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ فقط

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/۱۲/ ۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ

سود کی رقم رشوت اور ٹیکس میں دینے کا حکم

سوال: ﴿۸۷﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان دین مسئلہ ہٰذا کے متعلق:

(۱) کیا سود کے پیسے سے رشوت بحالت مجبوری دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اس کے علاوہ جو ہندوستانی حکومت جبراً انکم ٹیکس وصول کرتی ہیں تو کیا اس کو بذریعہ سود دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتي: (طارق محمود مشتاق کوپاگنجی (مئو) متعلم دارالعلوم دیوبند (۹۲۰/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) سود کی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں۔

(۲) ہندوستانی حکومت جبراً انکم ٹیکس جو وصول کرتی ہے، وہ غیر منصفانہ اور ناواجبی ہے، اس بنا پر اس میں سود کی رقم دینے کی گنجائش ہے (۱) البتہ ان ٹیکسوں میں سود کی رقم دینا جائز نہیں، جو منصفانہ

---

(۱) (الف) يستفاد مما في الدّر مع الرد: ۱۸۲/۶، ط: دار الفكر: غصب دراهم إنسان من كيسه ثمّ ردّها فيه بلا علمه برئ وكذا لو سلّمه إليه بجهة أخرىٰ كهبة وإيداع وشراء وكذا لو أطعمه فأكله.

(ب) ويردونها (الرشوة والفوائد الربوية فى حكمها) على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (الدر مع الرد: ۵۵۳/۹، كتاب الحظر والإباحة).

اور واجبی ہیں، اور اس کا نفع خود انسان کی ذات کو پہونچتا ہے؛ مثلاً پانی، روشنی، مکان کا ٹیکس چونکہ ان سب چیزوں کا نفع محسوس طور پر حکومت ہماری طرف لوٹا دیتی ہے؛ اس لیے ان سب چیزوں میں سود کی رقم دینا جائز نہیں ۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۶/۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے لائف انشورنس پالیسی لینے کا حکم

سوال: ﴿۹۷﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے سلسلے میں:

ایک شخص سرکاری ملازم (ماسٹر) ہے، اس کی ماہانہ تنخواہ ۲۰۰۰۰ (بیس ہزار) روپے ہیں، اس طرح کل سالانہ آمدنی ۲/لاکھ ۴۰/ہزار روپے ہوئے، حکومت کا قانون ہے کہ اگر سالانہ آمدنی ۲/لاکھ سے اوپر ہے تو اس زائد رقم میں ٹیکس دینا ہوگا؛ البتہ ٹیکس سے بچنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ''جیون بیما'' کے طور پر کچھ رقم جمع کر دی جائے تو ٹیکس سے چھٹکارا مل سکتا ہے ۔تو کیا شرعی اعتبار سے یہ جائز ہے؟ برائے مہربانی تشفی بخش جواب سے نواز کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں ۔

المستفتی محمد لقمان گونڈوی متعلم دارالعلوم دیوبند ۲۷/۱/۱۴۳۲ھ (۱۳۶/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

لائف انشورنس سود اور قمار پر مشتمل ہوتا ہے اور ان دونوں کی حرمت نص قطعی (قرآن پاک اور احادیث نبویہ) سے ثابت ہے (۱) اگرچہ بعض حالات میں اپنی جائز کمائی کے تحفظ کے لیے انشورنس کرانے کی اجازت ہے؛ لیکن قابل لحاظ امر یہ ہے کہ جس طرح سود و قمار کے ذریعہ حاصل اضافی رقم

---

(۱) (الف) احل اللّٰه البیع وحرم الربوٰ (البقرة: ۲۷۵).

(ب) یا أیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوه لعلکم تفلحون (المائدة: ۹۰).

(ج) لعن رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم آکل الربوٰ وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال: هم سواء (أخرجه مسلم رقم: ۱۲۰۶، باب لعن آکل الربا ومؤکله)

''مال خبیث'' میں داخل ہوکر حرام ہے(۱) اسی طرح سود وقمار پر مشتمل معاملہ کرنا بھی ناجائز ہے، لائف انشورنس کرانے والا ایک طویل مدت تک حرام معاملہ کا مرتکب اور اس میں ملوث رہتا ہے؛ لہٰذا تھوڑی منفعت عاجلہ کی خاطر اس طرح کا ناجائز معاملہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ جس قدر رقم انشورنس میں دی گئی اس قدر کا انکم ٹیکس اگرچہ ساقط ہوگیا مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب پالیسی مکمل ہونے پر رقم ملے گی تو کسی مسلمان کے لیے حکم شرعی کے مطابق اسی قدر رقم استعمال کرنے کی اجازت ہوگی، جو اصل جمع کردہ رقم تھی، اضافی ملنے والی رقم کا صدقہ کرنا اس پر واجب ہوگا، پس اس بات پر اچھی طرح غور کرلیں کہ جب اسے اصل رقم ملے گی تو روز بروز کرنسی کی مالیت میں پیدا ہونے والی گراوٹ کو دیکھتے ہوئے رقم کی ویلو بہت کم ہو چکے گی، لہٰذا اس کے بالمقابل زیادہ انفع صورت یہ ہے کہ فی الوقت انکم ٹیکس ادا کرنے کے بعد بقیہ رقم وصول کرکے اسے جائز طریقے پر اپنے لیے کارآمد بنالی جائے اور نفع حاصل کیا جائے نہ یہ کہ انشورنس کمپنی کو دیکر جائز نفع اندوزی کی راہ مسدود کردی جائے؛ کیوں کہ انشورنس کمپنی سے ملنے والا نفع شرعًا لائق استعمال نہ ہوگا (۲)؛ لہٰذا دونوں پہلو پر غور کرلیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۷ صفر ۳۲ھ

الجواب صحیح: محمود حسن بلندشہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

انشورنس: اقسام، احکام، شرائط وحدود

سوال: ﴿۸۰﴾ بیمہ کی حقیقت سے آگاہ فرمائیں۔ (۱) زندگی کا بیمہ کرانے کا کیا حکم ہے؟

(۲) املاک ودوکان کا بیمہ یا گاڑی وغیرہ کا بیمہ کرانا کیسا ہے؟

(۳) میڈیکل انشورنس کا کیا حکم ہے؟ اس کا کرانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی کمپنی اپنے ملازمین

(۱) کل قرض جر منفعة فهو ربا (أخرجه ابن أبي شيبة رقم: ۲۰۶۹۰: ۴/ ۳۲۷، باب من كره كل قرض جر منفعة).

(۲) قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك، فسبيله التصدق على الفقراء، قال: إن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوى به فراغ ذمته ولا يرجو به المثوبة (معارف السنن: ۱/ ۳۴، سعيد، أبواب الطهارة).

کا میڈیکل بیمہ از خود کرادیتی ہے اور طبی سہولیات ملازمین کو فراہم کرتی ہے تو ایسی سہولیات کا لینا کیسا ہے؟ اگر اس کے لیے کچھ پیسے ملازمین سے کاٹتی ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۴) اگر کسی نے ۱ر تا ۳ر بیمہ کرالیا ہے تو ملنے والی رقم کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کو انکم ٹیکس میں ادا کرسکتے ہیں اور اگر ٹیکس پہلے ادا کرچکے ہیں تو بعد میں زائد ملنے والی رقم سے اسے لے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: (فیضان اللہ مشتاق کوپا گنجی (مئو) متعلم دارالعلوم دیوبند (۱۶۲/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات پیش آتے ہوں کوئی انسان یا ادارہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کردوں گا، اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے وہ بیمہ کرانے والے سے بالاقساط رقمیں وصول کرتا ہے، بعض صورتوں میں بیمہ کرانے والے کو اپنی رقم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور بعض صورتوں میں وہ رقم مع سود واپس مل جاتی ہے، جن خطرات کے پیش نظر بیمہ کیا جاتا ہے، ان کے لحاظ سے بیمہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) زندگی کا بیمہ (۲) اشیاء کا بیمہ (۳) ذمہ داری کا بیمہ۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۳/ ۳۰۷، از مفتی تقی عثمانی صاحب)

(۱) زندگی کے بیمہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ جو شخص زندگی کا بیمہ کرانا چاہتا ہے، کمپنی اس کا طبی معاینہ کراتی ہے کہ یہ مرد کتنے سال تک زندہ رہ سکتا ہے؛ مثلاً رپورٹ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے دس سال تک زندہ رہنے کی امید ہے تو اس کی جسمانی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے کمپنی اس سے کہتی ہے کہ تم دس سال تک دس ہزار سالانہ کے حساب سے بالاقساط ایک لاکھ جمع کردو اگر دس سال کے اندر تمہارا انتقال ہوجائے گا تو ہم تمہاری بیوی اور اولاد کو دس لاکھ دیں گے اور اگر دس سال کے بعد تک زندہ رہے تو جمع شدہ رقم اور کچھ اضافہ (مثلاً: ایک لاکھ بیس ہزار) تم کو واپس کردی جائے گی، آج کل لوگ یہ بیمہ اس لیے کراتے ہیں کہ موت واقع ہونے کے بعد بیوی بچوں کی کفالت کا نظم ہوسکے اور وہ فقر و افلاس سے محفوظ رہ سکیں۔ بیمہ کی یہ صورت سود اور غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے؛ کیوں کہ پالیسی ہولڈر اگر متعین مدت کے اندر انتقال کرجاتا ہے تو اس کو دس لاکھ ملتے ہیں، اور اگر اس کے بعد تک زندہ رہا تو صرف اصل رقم کچھ اضافے کے ساتھ ملتی ہے، دونوں

صورتوں میں چونکہ اضافہ اصل رقم کے معاوضہ میں ملتا ہے اس لیے سود ہے (۱) جس کی حرمت قرآن کریم کی سات آیات اور بہت سی احادیث سے ثابت ہے، اور غرر اس لیے ہے کہ اضافہ کے ساتھ کتنی رقم ملے گی، یہ معلوم نہیں، دس لاکھ یا ایک لاکھ بیس ہزار، یہاں معاوضہ یا معقود علیہ مجہول ہے (۲)، البتہ اگر کسی نے جیون بیمہ کرالیا ہے تو اس کے لیے صرف اصل رقم کا استعمال حلال ہوگا، زائد رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں (۳)، ہاں اگر حکومت نے غیر شرعی ٹیکس عاید کردیا ہو اور بیمہ کرانے والا ادارہ سرکار کے ہاتھ میں ہو پرائیویٹ کمپنی کے ذمہ نہ ہو تو پھر سرکاری ٹیکس کی ادائیگی بیمہ میں ملنے والی اضافی رقم سے کر سکتے ہیں، خواہ اس رقم کے حصول کا ذریعہ ربوٰ کے عنوان میں آتا ہو (جواہر الفقہ :۲/ ۱۸۷از:مفتی محمد شفیع صاحبؒ)۔ اگر غیر شرعی ٹیکس حکومت کو ادا کر چکا ہے تو سرکاری بینک یا دوسرے سرکاری محکمات سے ملنے والے سود کی رقم میں سے ٹیکس میں ادا کردہ رقم کے بہ قدر لے سکتے ہیں، لینے والے کے حق میں وہ سود نہ ہوگا۔ (امداد المفتیین :۲/ ۸۵۱ کتاب الربا والقمار)

(۲) اشیاء کے بیمہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ دار اپنی موٹر سائیکل گاڑی عمارت کا بیمہ کراتا ہے اور اس کے لیے کمپنی میں معینہ مدت کے لیے رقم جمع کرنی پڑتی ہے، اس متعینہ مدت میں اگر کوئی حادثہ پیش آیا یا عمارت کو آگ لگی تو کمپنی اس نقصان کی تلافی کی ذمہ دار ہوتی ہے، اس میں اور لائف انشورنس میں بنیادی فرق یہ ہے کہ لائف انشورنس میں اصل رقم بہر حال محفوظ رہتی ہے اور بیمہ کرنے والے کو واپس ملتی ہے، جب کہ اشیاء کے بیمہ میں ہولڈر کی اصل رقم محفوظ نہیں رہتی، حادثہ ہونے کی صورت میں ہولڈر کو فائدہ پہنچتا ہے، ورنہ اصل رقم بھی ہاتھ سے چلی جاتی ہے، کمپنی واپس نہیں کرتی، شرعی نقطہ نظر سے جیون بیمہ کی طرح اشیاء کا بیمہ بھی مفاسد شرعیہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز

(۱) الربا: هو في اللغة: الزيادة، وفي الشرع: هو فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة (التعريفات الفقهية : ۳۰۲).

(۲) الغرر: الغرر ــ محركة ــ التعريض للهلكة وما طوى عنك علمه، وفي المبسوط: الغرر ما كان مستورا العاقبة، وفي المغرب: هو الخطر الذي لا يدرى أيكون أم لا؟ (التعريفات الفقهية : ۲۱۴، ط: دار الكتاب ديوبند).

(۳) لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه (الدر مع الرد: ۹/ ۵۵۳).

وحرام ہے، اس میں ایک طرف پریمیم کی طرف سے ادائیگی متیقن ہے اور دوسری طرف کمپنی کی جانب سے ادائیگی موہوم ہے اور معلق علی الخطر ہے کہ اگر حادثہ پیش آ گیا تو ادائیگی ہوگی اور حادثہ پیش نہ آیا تو ادائیگی نہ ہوگی، نیز ادائیگی کی صورت میں اضافہ کے ساتھ رقم ملتی ہے؛ اس لیے اس میں غرر اور قمار شامل ہے، جس کی وجہ سے یہ معاملہ بھی شرعاً ناجائز وحرام ہے (۱)، البتہ اگر کسی نے نادانستگی میں یہ بیمہ کرالیا ہے تو اس کے لیے آیندہ صرف اصل رقم کے بقدر لینا حلال ہوگا، زائد رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا۔

(۳) بیمہ کی تیسری قسم ذمہ داری کے بیمہ کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بیمہ دار کے ذمے کسی فریق ثالث کی جانب سے کوئی مالی ذمہ داری عائد ہو، تو بیمہ کمپنی اس ذمہ داری کو پورا کرتی ہے؛ مثلاً: کار والا بیمہ کمپنی سے یہ کہے کہ کسی وقت میری کار سے کسی کو ٹکر ہو سکتی ہے، اور وہ گھائل ہو سکتا ہے، یا فوت ہو سکتا ہے اور دعویٰ کر کے مجھ سے اس کا معاوضہ طلب کر سکتا ہے تو تم اس کے معاوضہ کی ذمہ داری لے لو، کمپنی اس کی ذمہ داری لے لیتی ہے اور اس کے بدلے اس سے ماہانہ رقم وصول کرتی ہے، بیمہ کی یہ شکل بھی ناجائز وحرام ہے؛ کیوں کہ اس شکل میں یہ امر موہوم ہے کہ حادثہ ہوگا یا نہیں اور اگر حادثہ ہوگا تو متاثر شخص دعوی کرے گا یا نہیں؟ اس میں یہ مذکورہ احتمالات موجود ہیں، اس لیے اس میں غرر پایا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ قمار بھی ہے (۲)؛ کیوں کہ یہاں ایک طرف سے ادائیگی متیقن اور دوسری طرف سے معلق علی الخطر اور موہوم ہے، نیز ملنے کی صورت میں رقم اضافہ کے ساتھ ملتی ہے، اس لیے اس میں سود کا عنصر بھی پایا جاتا ہے؛ لہٰذا یہ عام حالات میں جائز نہیں، حرام ہے، البتہ گاڑی چلانے کے سلسلے میں ہندوستان کا داخلی ملکی قانون یہ ہے کہ بغیر انشورنس کے گاڑی کو روڈ پر چلانا جرم ہوتا ہے، اس لیے مجبوراً اس طرح کا انشورنس کرالینے کی اجازت ہوگی اور ایسا انشورنس کرانے میں حادثہ کے پیش آجانے کی شکل میں گاڑی کا نقصان ہو جانے کی وجہ سے اگر معاوضہ ملے

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل مولفہ شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی: ۳/ ۳۰۸، ۳۰۹ ط: فیصل دیوبند۔

(۲) القمار: مصدر قامر هو كل لعب يشترط فيه غالبا أن يأخذ الغالب شيئا من المغلوب .... ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين (التعريفات الفقهية الملحقة بقواعد الفقه: ۴۳۴).

تو اس شخص کے لیے صرف جمع کردہ رقم کے بقدر کا استعمال کرنا جائز ہوگا زائد رقم کے استعمال کی اجازت نہ ہوگی (۱)۔

ذمہ داری کے بیمہ کی ایک شکل میڈیکل انشورنس (صحت کے بیمہ) کی ہے، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کرانے والا شخص ایک متعینہ مدت کے لیے متعینہ رقم ادارہ کو فراہم کرتا ہے، اس متعینہ مدت میں اگر وہ کسی پیچیدہ بیماری سے دوچار ہوتا ہے تو ادارہ یا کمپنی اس کے علاج کی ذمہ داری لیتی ہے اور اگر اس متعینہ مدت میں علاج کی ضرورت پیش نہ آئی تو کمپنی جمع شدہ رقم ضبط کر لیتی ہے، بیمہ ہولڈر کو واپس نہیں کرتی اور اسے پھر سے تجدید معاہدہ کر کے رقم جمع کرنی پڑتی ہے، یہ شکل متعدد خرابیوں کو شامل ہے، اس میں میسر اور قمار کی صورت پائی جاتی ہے؛ کیوں کہ متعاقدین میں سے ہر ایک کو بلا مقابل، خسارہ لاحق ہوتا ہے، اگر حادثہ پیش آ گیا تو کمپنی کو (علاج معالجہ کا خرچ برداشت کرنے کی وجہ سے) اور حادثہ نہ ہونے کی صورت میں ہولڈر کو کہ اس کو رقم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، ''قمار اور میسر'' کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے: **إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ** (مائدہ: ۹۰)، شراب، اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو۔ اس میں غرر کی شکل بھی پائی جاتی ہے؛ اس لیے کہ یہ مالی معاہدہ موہومہ امکانی خطرہ کے پیش نظر ہوتا ہے، جس کا ہونا نہ ہونا مجہول ہوتا ہے، اس صورت میں معقود علیہ مجہول اور غیر متعین ہے اور ایسے معاملات معاوضہ جس میں غرر ہو، شریعت میں اس سے منع کیا گیا ہے: **نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم عن بيع الغرر** (الترمذی: رقم: ۱۲۳۰) یہ پالیسی جوے اور غرر کے ساتھ ساتھ سود کو بھی شامل ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ پالیسی حادثہ کی صورت میں اپنی اصل سے زائد رقم پر مبنی علاج کو بھی شامل ہوتی ہے، جو قرض کے ساتھ مشروط منفعت ہوئی۔ **وفي الحديث: كل قرض جر منفعة فهو ربا** (مصنف ابن أبي شيبة)؛ اس لیے یہ پالیسی لینا بھی شرعاً ناجائز و حرام ہے (۲) تاہم اگر کسی نے یہ بیمہ پالیسی اپنا لی ہو تو حادثہ کے

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل مولفہ شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی: ۳/ ۳۰۸، ۳۰۹ ط: فیصل دیوبند۔

(۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے اشیاء کے بیمہ اور صحت کے بیمہ میں جواز کا فتویٰ تو نہیں دیا؛ البتہ کمپنی کی جانب سے تعاون قرار دے کر جواز کا رجحان ظاہر فرمایا ہے فلیتدبر (حاشیہ =

وقت صرف اصل رقم کے بہ قدر استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا، البتہ کوئی کمپنی یا ادارہ اپنے ملازمین وممبران کے صحت کا بیمہ اپنے تئیں از خود کرلے، اور بیماری کی صورت میں علاج کی ذمہ داری لے لے، ملازم اور ممبر نے انشورنس کا معاملہ نہ کیا ہو تو یہ ناجائز بیمہ کی شکل نہیں ہے؛ بلکہ کمپنی کی طرف سے اسے تعاون اور عطیہ سمجھا جائے گا؛ لہٰذا اس کی فراہم کردہ سہولت سے استفادہ کرنا حلال ہوگا؛ کیوں کہ ملازم نے خود کوئی معاملہ ومعاہدہ نہیں کیا، ہاں اگر صحت کے بیمہ کے عنوان سے کمپنی اپنے ملازمین سے ان کی مرضی سے کچھ پیسے کاٹ لیتی ہے، جس کے نتیجے میں مذکورہ طبی سہولیات فراہم کرتی ہے تو پھر اپنی جمع کردہ رقم سے زائد سہولیات سے فائدہ اٹھانا شرعاً ناجائز ہوگا؛ کیوں کہ یہ شکل میڈیکل انشورنس کی ناجائز صورت میں داخل ہے۔

بیمہ کی ایک امدادی تعاونی شکل ہوتی ہے؛ جس کو عربی میں ''التامين التبادلي'' کہتے ہیں، اس میں تجارت مقصود نہیں ہوتی؛ بلکہ ممبران کی امداد مقصود ہوتی ہے، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ باہمی طور پر ایک فنڈ قائم کرتے ہیں، اس فنڈ کے ممبران میں سے اگر کسی کو حادثہ پیش آجائے، تو اس حادثہ کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس فنڈ سے متاثرہ ممبر کی امداد کی جائے گی، یہ صورت بالاتفاق جائز ہے، اگر چہ یہ معلوم نہیں کہ اس اعانت کا فائدہ کس کو پہنچے گا؛ اس لیے اس میں یک گونہ غرر ہے، مگر یہ غرر مضر نہیں؛ کیوں کہ یہ از قبیل تبرع واحسان ہے اور عقود تبرع میں غرر مفسد یا مضر نہیں ہوتا، ہاں جو عقود معاوضہ ہوں، ان میں غرر ناجائز اور حرام ہوتا ہے، بیمہ کی ناجائز شکلوں کو مذکورہ امدادی تعاونی فنڈ پر قیاس کرکے جواز کا قائل ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ امدادی فنڈ میں جس طرح غرر کو برداشت کرلیا گیا ہے، اسی طرح املاک وصحت کے بیمہ میں بھی برداشت کرنا چاہیے، درست نہیں ہے؛ کیوں کہ ابھی اوپر یہ بات آچکی ہے کہ بیمہ ایک عقد معاوضہ ہے اور عقد معاوضہ میں غرر ہو تو وہ شرعاً صحیح نہیں، اور امدادی فنڈ کی بنیاد تعاون وامداد پر مبنی ہوتی ہے، اس میں معاوضہ مقصود نہیں ہوتا،

= فتاوی دار العلوم دیو بند:۱۴/ ۵۰۹)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے مغربی ممالک کے لیے جہاں بسا اوقات اشیاء کا بیمہ یا صحت کا بیمہ نہ کرانے سے انسان زبردست مشکل اور پریشانی سے دوچار ہوجاتا ہے، اور بغیر اس کے زندگی بہت دشوار ہوگئی ہے، ان کے جواز کا فتوی نہ دے کر صرف جواز کی رائے ظاہر کی ہے، فليتأمل تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسلام اور جدید معاشی مسائل:۳/ ۳۱۸۔

اس لیے اس میں غرر مفسد نہیں ہوگا (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۳/۳۱۲) اسی طرح انشورنس میں ملنے والی زائد رقم کو تعاون پر محمول کرنا بھی شرعًا درست نہیں؛ کیونکہ یہ زائد رقم عقد معاوضہ کے ضمن میں اضافہ کے طور پر ملنے کی وجہ سے سود میں داخل ہے، قرآن کریم کی آیت ربا، قرض وتجارت ہر دو کے ذریعہ ملنے والے سود کی حرمت کے بارے میں نازل ہوئی تھی، امام ابوبکر جصاص رازی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: **والثّاني أنّه معلوم أن ربا الجاهلية إنّما كان قرضامؤجلابزيادة مشروطة فكانت الزيادة بدلا من الأجل فأبطله الله تعالیٰ وحرمه** (احکام القرآن:۲/۱۸۶، ط:بیروت)؛ لہٰذا اسے سود کے بجائے تعاون کا نام دینے سے سود کی حقیقت ختم نہ ہوگی، بلاشبہ بیمہ کمپنی سے ملنے والے منافع سود اور ربا کی تعریف میں داخل ہوں گے، جن کا لینا شرعًا ناجائز وحرام ہے، نیز تبرع واحسان کی کوئی علامت یہاں موجود نہیں، ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ کمپنی کا مقصد اس سے صرف نفع کمانا ہے۔

بیمہ کی مذکورہ صورتوں کو عقد موالات پر قیاس کر کے امداد باہمی کا نام دینا بھی صحیح نہیں؛ کیوں کہ عقد موالات صرف ان نومسلموں کے لیے ہے، جن کا کوئی مسلمان وارث موجود نہ ہو، اگر وہ شخص کسی سے بھائی چارہ کا معاہدہ کرلے، تو وہ ایک حیثیت سے اس کا بھائی قرار پائے گا، زندگی میں جو جنایات کی دیت کسی بھائی پر عاید ہوتی ہے وہ اس شخص پر عاید ہوگی، اور مرنے کے بعد اس کی وراثت کا یہ حقدار قرار پائے گا، یہ عقد موالات صرف وہ شخص کرسکتا ہے، جس کا کوئی مسلمان وارث نہ ہو، جس کا کوئی مسلمان وارث (دور یا قریب کا، خواہ عصبات میں سے ہو یا ذوی الارحام میں سے موجود) ہو، اس کا کسی شخص سے عقد موالات کرنا باطل وکالعدم ہے؛ کیوں کہ وارث کا حق تلف کرنے کا اس کو اختیار نہیں، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: **وإن كان له وارث فهو أولى منه وإن كانت عمة أو خالة أو غيرهما من ذوي الأرحام** (هداية :۳/۳۴۵، كتاب الولاء).

نوٹ: جواہر الفقہ :۲/۱۸۵ میں اس سے متعلق اچھی بحث ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

املاہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۴ صفر ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

تصویر، ضبطِ تولید اور تبدیلیٔ جنس کے بعض مسائل

ڈیجیٹل تصویر اور آلات تصویر سازی

کی مرمت کو پیشہ بنانے کا حکم

محترم المقام قابل صد احترام حضرت مفتی صاحب .... زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال:﴿۸۱﴾بعدہٗ عرض خدمت اقدس میں یہ ہے کہ زید کیمرہ مکینک ہے اور تقریباً ۴۸؍سال سے کیمروں کی مرمت کرتا ہے تو کیا یہ کام درست ہے یا نہیں؟

واضح رہے کہ اب اس جدید دور میں کیمروں میں یہ فرق ہوگیا ہے کہ پرانے کیمروں میں ریل اور فلم ڈالی جاتی تھی، پھر فوٹو کھینچا جاتا تھا، اس کے بعد اس کو دھو کر تصویر بنتی تھی؛ لیکن اب ڈیجیٹل کیمرے آگئے ہیں، جن میں فلم نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ عکس کو الیکٹرونک طریقہ سے جذب کرتے ہیں اور کیمرہ پروسس (محفوظ) کرکے آپ کو یہ کیمرہ اسکرین پر تصویر دکھاتا ہے۔

آج جیسا کہ تصویر اور فوٹو کی ضرورت سے مطلقاً انکار نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ موقع بموقع فوٹو کی شدید ضرورت پیش آتی رہتی ہے، مثلاً سرکاری آفسوں میں ملازمتوں، بینکوں، مدارس اور کالج کے فارموں میں، شناختی کارڈ اور حج کی درخواستوں میں وغیرہ وغیرہ! اسی طریقہ سے پریس اور میڈیا والے حادثے کی تصویر کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں، نیز ڈاکٹر حضرات بھی زخموں کے علاج میں نیز دیگر بیماریوں، مثلاً دانتوں اور آنکھوں کے علاج میں اور پیٹ کے اندرونی علاج میں بھی کیمروں کا استعمال کرتے ہیں، اسی طریقہ سے ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر لوگوں کی نقل وحرکت پر نظر

رکھنے کے لیے بھی کیمروں کا استعمال ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ سی آئی ڈی جو حکومت کا ایک حساس ادارہ ہے، جو نہ صرف عوام؛ بلکہ پورے ملک کی حفاظت کے لیے کام کرتا ہے، اس میں بھی کیمروں کی ضرورت پڑتی ہے، اور اس شعبہ کے کیمروں کی مرمت کا کام بھی زید کے سپرد ہے۔

اب ایسی صورت حال اور ایسے مواقع کہ جن میں فوٹو کی شدید ضرورت پڑتی ہے اور شرعاً ایسے مواقع میں فوٹو کی اجازت بھی ہے تو کیا ان حالات میں زید کے لیے کیمروں کی مرمت کرنا درست ہوگی یا نہیں؟ نیز زید کے لیے کیمروں کی مرمت پر حاصل ہونے والی اجرت اور کمائی حلال ہوگی یا نہیں؟ واضح رہے کہ زید صرف کیمروں کی مرمت کرتا ہے، فوٹو گرافی اور فوٹو سازی وغیرہ کا کام نہیں کرتا ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ اصولِ شرع کی روشنی میں مفصل جواب تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی شیخ محمد غوث کیمرہ ٹکنیشین

۱۶/بیس مینٹ ایم جی روڈ، ونڈر لینڈ، پونہ ۴۱۱۰۰۱

۱۳/ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ (۱۰۹۳/ د/۱۴۳۲ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً!

شریعتِ اسلامیہ میں جاندار کی تصویر سازی اور تصویر بنانا، خواہ ڈیجیٹل کیمرے کے ذریعے ہو یا دوسرے کسی قسم کے کیمروں کے ذریعے، تصویر چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، بہر صورت ناجائز اور حرام ہے، اس مسئلے میں احادیثِ رسول ﷺ (۱)، افعالِ صحابہ اور عباراتِ اکابر امتؒ موجود ہیں۔

(۱) عن عبداللّه بن مسعود قال: سمعت النبيَّ صلّى اللّه عليه وسلّم يقول: "إن أشد النّاس عذابا عنداللّه المصورون" (صحيح البخاري: رقم: ۵۹۵۰، باب بيان عذاب المصورين يوم القيامة).

وعن ابن عباس قال: سمعت رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم يقول: كل مصوّر في النار...... مشكاة المصابيح: ۳۸۵، ط: دار الكتاب ديوبند.

إن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم قال: إن الذين يصنعون هٰذه الصور يعذبون يوم القيامة يقال لهم أحيوا ما خلقتم. (صحيح البخاري: رقم: ۵۹۵۱، باب بيان عذاب المصورين يوم القيامة)

نیز آپ کی یہ تحقیق کہ ''اس جدید دور میں کیمروں میں فرق ہوگیا ہے کہ پرانے کیمروں میں ریل اور فلم ڈالی جاتی تھی، پھر فوٹو کھنچتا تھا، اس کے بعد اس کو دھوکر تصویر بنتی تھی؛ لیکن اب ڈیجیٹل کیمرے آگئے ہیں، جن میں فلم نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ عکس کو الیکٹرونک طریقے سے جذب کرتے ہیں''۔

یہ تحقیق اور آپ کا یہ نظریہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہے؛ لیکن آپ کی اس تحقیق سے نفسِ مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا؛ کیوں کہ یہ بات مسلم ہے کہ کسی شئی کے حلال یا حرام ہونے میں اس کے ذرائع وآلات کا کوئی اعتبار نہیں، اگر کوئی چیز حرام ہے، تو اس کا وجود ہاتھوں سے ہوا ہو، یا سانچوں اور مشینوں کے ذریعے، اگر وہ حرام ہے تو اختلافِ آلات کی بنا پر اس میں کوئی فرق نہیں آتا، مثلاً: شراب چاہے دیسی مٹکوں میں بنائی جائے یا جدید آلات ومشینوں کے ذریعے، بہر صورت اگر اس میں نشہ ہے تو حرام کہا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کو آلۂ جارحہ سے قتل کرے، یا گولی مار کر قتل کرے، یا پھانسی پر لٹکا کر جان لے، یا زہر کھلا کر، یا کرنٹ لگا کر، یا زہر کا انجیکشن دے کر مارے، ان سب صورتوں کو قتل ہی کہیں گے؛ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کنواری لڑکی سے زنا کرے یا اپنا مادۂ منویہ بذریعہ ٹیوب اجنبیہ کے رحم میں داخل کرے، ہر صورت میں پیدا ہونے والا بچہ حرام ہوگا؛ لہٰذا تصویر سازی جو کہ حرام ہے، وہ کسی بھی ذریعے سے ہو حرام ہوگی اور جس طرح کاغذ پر اترنے کے بعد یہ تصویر حرام ہے، اسی طرح جس وقت اس کے اصل کو کیمرے کی ڈسک میں محفوظ کیا جارہا ہو تو عملاً اس کا حکم بھی تصویر محرم کا حکم ہوگا، چاہے محفوظ ہونے والی شکل ابتداءً ذرات کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔

وفي التوضيح: قال أصحابنا وغيرهم: تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم وهو من الكبائر وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيره فحرام بكل حال؛ لأن فيه مضاهاة لخلق الله، وسواء كان في ثوب أو بساط أ و دينار أو درهم أو فلس أو إناء أو حائط .... وبمعناه قال جماعة العلماء مالك والثوري وأبو حنيفة وغيرهم رحمهم (عمدة القاري). (۱)

(۱) عمدة القاري شرح البخاري: ۱۰/۳۰۹، باب عذاب المصورين يوم القيامة. (ط: دار الطباعة العامرة).

وكذا في الفتاوى الهندية : ۵/ ۳۵۹۔

وكذا في البدائع :۱/ ۱۱٦

وكذا في الدّر مع الرّد : ۲/ ٤۰۹،مطلب: إذا تردد الحكم بين سنة وبدعة.

وكذا ذكر العلامة النووي في شرحه على صحيح مسلم: ۲/ ۱۹۹(۱)

نیز تصویر سازی کی حرمت کے متعلق کم وبیش چالیس حدیثیں آپ علیہ الصلوۃ والسلام سے مروی ہیں، اور تمام کی تمام مطلق تصویر کے متعلق ہیں (کسی بھی ذریعے سے تصویر تیار کی جائے) اس کے برعکس تصویر کے جواز کی کوئی روایت نہیں ملتی، نیز حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کا، صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کوئی شارح نہیں ہوسکتا، یہ حضرات آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے حقیقی رمز شناس اور ہر قول وفعل کے عینی شاہد ہیں، ان حضرات نے بھی تصویر سے متعلق تمام احادیث سے یہی مفہوم اخذ کیا ہے کہ یہ ارشادات ہر قسم کی تصاویر سے متعلق ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصاری کی دعوت یہ فرما کر رد کردی کہ تمہارے یہاں تصویر ہوتی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالہیاج اسدیؒ کو بھیجا کہ شہر میں تمام تصاویر مٹادیں اور فرمایا کہ مجھے بھی آپ ﷺ نے اس مہم پر بھیجا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک مکان میں تصویر دیکھ کر دروازے سے لوٹ آئے۔

(سب واقعات بخاری ومسلم میں مذکور ہیں)

حضراتِ اکابر کی تصریحات سے بھی یہی تائید ہوتی ہے کہ کسی بھی طریقے سے تصویر کھینچی جائے، وہ تصویر ہی کے حکم میں ہے اور اس پر تصویر ہی کے احکام مرتب ہوں گے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی علیہ الرحمۃ عکس اور فوٹو کے درمیان فرق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''سب سے بڑا فرق دونوں میں یہی ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں ہوتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کرلیا جاتا ہے، پس وہ اسی وقت تک عکس ہے، جب تک اسے مسالے سے قائم نہ کیا

(۱) النووي على مسلم : ۲/ ۱۹۹،باب تحريم تصوير صورة الحيوان، ط:رحيميه ديوبند.

جائے اور جب اس کو کسی طریقے سے قائم و پائیدار کر لیا جائے وہی تصویر بن جاتا ہے''۔

(آلات جدیدہ کے شرعی احکام:۱۴۱-۱۴۲)(۱)

دوسری جگہ مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حاصل یہ ہے کہ عکس جب تک مسالہ وغیرہ کے ذریعے سے پائیدار نہ کر لیا جائے، اس وقت تک وہ عکس ہے اور جب اس کو کسی طریقے سے قائم و پائیدار کر لیا جائے تو وہی تصویر بن جاتا ہے اور عکس جب اپنی حد سے گزر کر تصویر کی صورت اختیار کرے گا، خواہ وہ مسالے کے ذریعے ہو یا خطوط ونقوش کے ذریعے اور خواہ یہ فوٹو کے شیشے پر ہو یا آئینہ وغیرہ شفاف چیزوں پر، اس کے سارے احکام وہی ہوں گے جو تصویر کے متعلق ہیں''۔(آلات جدیدہ کے شرعی احکام:۱۴۲)(۲)

اسی طرح مفتی رشید احمد صاحبؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کو عکس کہنا بھی صحیح نہیں؛ اس لیے کہ عکس اصل کے تابع ہوتا ہے اور یہاں اصل کی موت کے بعد بھی اس کی تصویر باقی رہتی ہے''۔(احسن الفتاوی:۸۹/۹)

دوسری جگہ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تصویر اور عکس دو بالکل متضاد چیزیں ہیں، تصویر کسی چیز کا پائیدار اور محفوظ نقش ہوتا ہے، عکس ناپائیدار اور وقتی نقش ہوتا ہے، اصل کے غائب ہوتے ہی اس کا عکس بھی غائب ہو جاتا ہے، ویڈیو کے فیتے میں تصویر محفوظ ہوتی ہے، جب چاہیں جتنی بار چاہیں ٹی وی کی اسکرین پر اس کا نظارہ کر لیں اور یہ تصویر تابع اصل نہیں؛ بلکہ اس سے بالکل لاتعلق اور بے نیاز ہے، کتنے لوگ ہیں جو مر کھپ گئے، دنیا میں ان کا نام ونشان نہیں؛ مگر ان کی متحرک تصاویر ویڈیو کیسٹ میں محفوظ ہیں، ایسی تصویر کو کوئی بھی پاگل عکس نہیں کہتا، صرف اتنی سی بات کو لے کر کہ ویڈیو کے فیتے میں ہمیں تصویر نظر نہیں آتی، تصویر کے وجود کا انکار کر دینا کھلا مغالطہ ہے''۔(احسن الفتاوی:۳۰۲/۸)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ کا ایک فتوی ''تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

(۱) آلات جدیدہ کے شرعی احکام:۱۴۱، ط: مکتبہ رضوان شاہ دہلی۔

(۲) آلات جدیدہ کے شرعی احکام:۱۴۲، ط: مکتبہ رضوان شاہ دہلی۔

''ٹی وی اور ویڈیو فلم کا کیمرہ جو تصویریں لیتا ہے وہ اگر چہ غیر مرئی ہیں؛ لیکن تصویر بہر حال محفوظ ہے اور اس کو ٹی وی پر دیکھا اور دکھایا جاتا ہے، اس کو تصویر کے حکم سے خارج نہیں کیا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ سے تصویر بنانے کے فرسودہ نظام کے بجائے سائنسی ترقی نے تصویر سازی کا ایک دقیق طریقہ ایجاد کرلیا ہے؛ لیکن جب شارع نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے تو تصویر سازی کا خواہ کیسا ہی طریقہ ایجاد کرلیا جائے، تصویر تو حرام ہی رہے گی''۔

(تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام: ص:۹۴، نعیمیہ)

قدیم زمانے میں تصویر ہاتھ سے بنتی تھی، پھر کیمرے کی ایجاد نے اس قدیم طریقے میں ترقی کی اور تصویر ہاتھ کے بجائے مشین سے بننے لگی، اب اس عمل میں نئی نئی سائنسی ایجادات نے مزید ترقی کی اور جدت پیدا کی اور جامد وساکن تصویر کی طرح اب چلتی پھرتی، دوڑتی بھاگتی تصویر کو محفوظ کیا جانے لگا، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس کو قرار وبقاء نہیں ہے، اگر اس کو بقاء نہ ہوتی تو ٹی وی اسکرین پر نظر کیسے آتی۔

بہر حال ان اقتباسات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ کسی جان دار کا مطلق عکس محفوظ کرنا، خواہ وہ کسی بھی طریقے پر ہو اگر اس میں استقلال واستقرار پیدا ہوجائے کہ جب چاہیں اس کو دیکھ سکیں تو یہ تصویر سازی میں داخل ہوگا، اور اس پر تصویر سازی کے احکامات مرتب ہوں گے۔

نیز حضرات اکابرؒ میں جن کے سامنے بھی حفظ عکس کی یہ جدید صورت اور ترقی یافتہ شکل سامنے آئی، انہوں نے بھی عکس کی مذکورہ حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کے تصویر ہونے کا ہی حکم دیا، اسی طرح اگر کوئی چیز منافع ومفاسد پر مشتمل ہوتی ہے تو اس میں غالب ہی کا اعتبار ہوتا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوے کے متعلق ارشاد فرمایا: ''وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِن نَفْعِهِمَا'' (سورۃ البقرۃ)

اور فقہ کا بھی قاعدہ ہے کہ: **درء المفاسد أولیٰ من جلب المصالح، فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً**(الأشباه والنظائر)(۱)

ٹھیک ہے کہ بعض موقعوں پر فوٹو کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور ضرورتِ شدید کے موقع پر فقہاء کرام ومفتیانِ عظام نے قاعدہ ''**الضّرورات تبیح المحظورات**'' کے پیش نظر فوٹو کی اجازت بھی دی ہے؛ لیکن چوں کہ کیمروں کا استعمال غالباً وعامۃً غلط اور ناجائز کاموں کے لیے ہوتا ہے؛

(۱) **الأشباه والنظائر: ص:۱۴۷، ط: مکتبة دار العلوم دیوبند.**

اس لیے صرف کیمروں کی مرمت کرنا کراہت سے خالی نہیں ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بے غبار اور پاک صاف نہیں کہا جا سکتا؛ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا" پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حلال اور پاک وصاف کاروبار کی تلاش جاری رکھیں، جب تک جائز وحلال کاروبار نہ مل سکے، تب تک بادلِ ناخواستہ اسی کام کو کرتے رہنے کی گنجائش ہے، ساتھ ساتھ توبہ واستغفار کرتے رہیں اور حلال کاروبار میسر آجانے کے بعد اس کام سے بالکلیہ کنارہ کشی اختیار کرلیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳/ رجب المرجب ۳۲ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام

ڈیجیٹل تصویر اور اس کا شرعی حکم

سوال: ﴿۸۲﴾

بعض اہل علم کا رجحان ڈیجیٹل تصویر کے جواز کی طرف ہے جس کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

(۱) یہ اشبہ بالعکس ہے جو پائیدار نہیں ہے؛ اس لیے تصویر کے حکم میں داخل نہیں ہے۔

(۲) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط قسم کے پروپیگنڈے میڈیا کے ذریعے کیے جا رہے ہیں جن کے دفاع کے لیے ٹی وی پر آنے کی شدید ضرورت پیدا ہوگئی، اس رجحان پر مبنی ایک بڑے ادارے کا مفصل فتوی مفتی عبدالرحمٰن صاحب نے بنگلہ دیش سے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں ارسال کر کے اس مسئلے میں دارالعلوم دیوبند کا موقف معلوم کیا تھا، مفتی عبدالرحمٰن کی تحریر درج ذیل ہے:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
گرامی قدر محترم المقام حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون:

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے، ہم بھی بحمد اللہ خیریت سے ہیں، خدمتِ اقدس میں ضروری عرض یہ ہے کہ دار العلوم کراچی پاکستان سے ایک فتوی بندے کے پاس ایک خط کے ساتھ آیا ہے؛ جس میں اس فتوی کے سلسلے میں رائے طلب کی گئی ہے، اس فتوی کو اچھی طرح پڑھا،

تحریر میں تیزی تو بہت ہے مگر قلب منشرح نہیں، اس قسم کا فتوی لکھنے والا عموماً نوجوانوں کا طبقہ ہے، اور بندہ اکابر دیوبند کے افکار ونظریات کو ماننے اور چلنے کا پابند ہے، اسی بنا پر حضرت والا کے پاس فتوی کے سارے کاغذات ارسال ہیں، اور یہ دریافت طلب ہے کہ اس مسئلے میں دارالعلوم دیوبند کا موقف کیا ہے؟ اس کی وضاحت فرمانے کا امیدوار ہوں، دارالافتاء اس لیے نہیں بھیجا کہ مجھے فتوی حاصل کرنا نہیں ہے؛ بلکہ دارالعلوم دیوبند کے موقف سے مطلع ہونا چاہتا ہوں۔ والسلام

مفتی عبدالرحمٰن

رئیس مؤسس مرکز الفکر الاسلامی بنگلہ دیش

بشوندرا، ڈھاکہ جامعۃ الابرار ریوردیو، ڈھاکہ

حضرت مہتمم صاحبؒ نے مفتی عبدالرحمن صاحب کی طرف سے مرسلہ مفصل فتویٰ دارالافتاء بھیج کر رائے طلب فرمائی تو مفتیان دارالعلوم دیوبند نے سب تحریریں پڑھ کر منسلکہ جواب فتویٰ کی شکل میں پیش کیا؛

(۶۴۶/ب ۱۴۳۰ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدوم ومکرم گرامی مرتبت حضرت مہتمم صاحب زیدت معالیکم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے فتاوے ارسال کر کے دارالعلوم دیوبند کا موقف معلوم کیا ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ڈیجیٹل سسٹم کے تحت اسکرین پر جو مناظر؛ یعنی تصویریں وغیرہ آتی ہیں، وہ سب شرعاً تصویر کے حکم میں ہیں، یہ سینما کی تصویروں کے مثل ہیں، فرق اتنا ہے کہ سینما میں ریز (بہانے والا کسی چیز کا ٹکڑا) سامنے سے ڈالی جاتی ہے اور ٹی وی میں پیچھے سے جو مفاسد سینما کی تصویروں سے پیدا ہوتے ہیں، وہی سارے مفاسد ٹی وی کی تصویروں سے بھی پیدا ہوتے ہیں؛ اس لیے ان تصاویر کا دیکھنا شرعاً ناجائز قرار دیا جائے گا، دارالعلوم دیوبند کے اربابِ افتاء کا فتویٰ اور موقف یہی ہے؛ البتہ شرعی ضرورت اور اضطرار کی حالت کے احکام اور ہوں گے۔ فقط والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/۴/۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

تصویر سے متعلق ایک فتویٰ

از حضرت مفتی محمود حسن بلند شہری (نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

محترم المقام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۸۳﴾ دیگر عرض خدمت عالیہ اینکہ تصویر کشی اور تصویر سازی کی حرمت اظہر من الشّمس ہے اور کسی مفتی نے اس کی حلت کا فتویٰ آج تک نہیں دیا؛ مگر ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر اِس کے باوجود بغیر کسی ضرورت کے اس کا ابتلائے عام ہوتا جا رہا ہے، ان نازک حالات میں ہم اس کے خلاف آواز اور ایک تحریک اٹھانا چاہتے ہیں، شریعت کی رو سے اس کا کیا حکم ہے؟

برائے مہربانی مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

اس سے قبل بھی ۱۹۹۰ء میں تحریکِ حجاب کے جواز پر یہیں سے فتوی لیا گیا؛ جس سے بڑی کامیابی ہوئی، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ اس تحریک میں بھی کامیابی عطا فرمائے۔

العارض حکیم فضل الکریم حسینی

مفتی اعظم مدنی دارالافتاء عالمی خواتین مدنی مشن آسام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق: حامداومصلیا ومسلما: تصویر کشی وتصویر سازی کا حرام ہونا تو آپ کو معلوم ہی ہے، نصوص بھی آپ کے سامنے ہیں، جواہر الفقہ میں مستقلاً ایک رسالہ اس سلسلہ میں لگا ہوا ہے، اس میں دلائل مذکور ہیں، ابتلائے عام کی وجہ سے یہ جائز نہیں ہوگا؛ بلکہ حرام ہی ہے، آپ اس سلسلہ میں اصلاحی تحریک چلانا چاہتے ہیں، ماشاء اللہ بہت مبارک جذبہ ہے، اللہ پاک پوری کامیابی عطا فرمائے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

الاحقر محمود حسن بلند شہری غفرلہ دارالعلوم دیوبند ۲۴/۴/۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

محمد ظفیر الدین غفرلہ

تصویر سے متعلق ایک فتویٰ

از: **حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب، پالن پوری**

(صدر المدرسین دار العلوم دیوبند)

سوال: ﴿۸۴﴾

حضرت مولانا شیخ حکیم فضل الکریم صاحب الحسینی مفتی اعظم مدنی دار الافتاء آسام نے حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مد ظلہ سے تصویر کشی کے ابتلائے عام ہو جانے کی وجہ سے اس کے جواز وعدم جواز کی بابت دریافت کیا، حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے درج ذیل تحریر ارقام فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم ومحترم زید مجدکم!.. السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے فوٹو کے تعلق سے دریافت کیا ہے کہ جائز ہے یا ناجائز؟ اور ناجائز ہے تو اکابر کا عمل اس سے مختلف کیوں ہے؟ عام طور پر بڑے بڑے لوگ جلسوں میں اور کانفرسوں میں بے دھڑک فوٹو کھنچواتے ہیں؛ بلکہ اب تو بعض بڑے ٹی وی پر بھی آنے لگے ہیں۔

تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ برصغیر (انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش) کے تمام مفتیان کرام بالاتفاق فتوی دیتے ہیں: کیمرے کا فوٹو بھی حرام ہے، حدیث صحیح میں جس تصویر کی ممانعت آئی ہے، وہ اس تصویر کو بھی شامل ہے، مصر اور عرب کے بعض علماء اس میں اختلاف رکھتے ہیں؛ مگر برصغیر کے علماء میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

مگر امت کے اکابر عملی طور پر اپنے مفتیوں کی مخالفت کرتے ہیں، ان کے ذہنوں میں کیمرے کے فوٹو کی کوئی خاص قباحت نہیں رہی، یہ ایک بڑا المیہ ہے، میں ہمیشہ اکابرین سے عرض کرتا ہوں کہ اگر مسئلہ بدل گیا ہے اور کیمرے کا فوٹو جائز ہو گیا ہے تو پہلے دار الافتاؤں سے کہو کہ وہ جواز کا فتویٰ دیں، پھر فوٹو کھنچواؤ، موجودہ صورت دین کی تضحیک کا سبب ہے، عوام یہ کہتے ہیں کہ لو جی! مفتی صاحبان یہ فتوی دیتے ہیں اور حضرت جیوں کا یہ عمل ہے، اور جب ایک مسئلہ میں عوام کے ذہنوں سے دین کی قدر ومنزلت ختم ہو جائے گی تو دین کے دوسرے شعبوں کا بھی یہی حال ہوگا۔

بلکہ بعض تجارت پیشہ ناعاقبت اندیشوں نے اکابرین کے فوٹوؤں کی تجارت شروع کر دی ہے،

دیوبند میں حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور دیگر بہت سے بزرگوں کے فوٹو دھڑلے سے بک رہے ہیں، اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے؛ اس لیے اکابرین سے میری گذارش ہے کہ خدارا دین پر رحم کریں، اگر ان کے دل میں دین کی کوئی قدر نہیں ہے تو عوام کو تباہ نہ کریں، واللہ یھدی السّبیل.

املاہ سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری خادم دارالعلوم دیوبند ۲۵/ ۵/ ۱۴۲۸ھ

اصاب من اجاب: محمد امین پالن پوری خادم دارالعلوم دیوبند یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۲۸ھ

ڈیجٹیل تصویر سے متعلق مظاہر علوم سہارنپور کا ایک فتویٰ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا، جس کی تصدیق کر دی گئی تھی، اس وقت اسے بھی شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔

ڈیجیٹل تصویر کی حرمت: اکابر کی عبارات کی روشنی میں

مخدومی حضرت مفتی صاحب مدظلہ .... دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۸۵﴾ عرض خدمت اینکہ "مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کا ایک فتوی "ڈیجیٹل تصویر" سے متعلق بھیج رہے ہیں، اگر یہ فتویٰ آپ حضرات کی تحقیق کے مطابق درست ہے؛ تو اس کی تصدیق فرمادی جائے۔ فقط والسلام محمد معاویہ سعدی

شعبۂ تخصص فی الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۱۱۰۶/د ۱۴۳۲ھ

"الجواب وباللہ التوفیق: ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ کمپیوٹر یا ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والے مناظر کی شرعی حیثیت کے بارے میں جامعہ دارالعلوم کراچی کا موقف اور فتویٰ نظر نواز ہوا؛ جس میں ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ محفوظ کیے گئے عکس کو آئینہ کے عکس پر قیاس کر کے؛ بلکہ اس سے بھی کم درجہ تسلیم کر کے تصویر سازی سے خارج قرار دیا گیا ہے اور اس کے جواز کا حکم لکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں غور طلب ہیں:

(۱) ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ محفوظ کردہ عکس کو آئینہ کے عکس کی طرح ناپائیدار قرار دے کر تصویر میں داخل نہ ماننا، درست معلوم نہیں ہوتا، دونوں میں واضح فرق موجود ہے،

آئینہ کا عکس مستقل نہیں ہوتا، وہ صاحبِ عکس کے تابع ہوتا ہے، آئینہ کے سامنے سے جیسے ہی ذی عکس ہٹے گا، عکس بھی فوراً ختم ہو جائے گا، ایک لمحہ کے لیے بھی عکس بغیر ذی عکس کے قائم اور باقی نہیں رہتا اور اگر ذی عکس دوبارہ آئینہ میں اپنا عکس دیکھنا چاہے تو اس کو دوبارہ آئینہ کے سامنے آنا پڑے گا، بغیر اس کے اس کو اپنا عکس نظر نہیں آئے گا، جب کہ اس کے بالکل متضاد ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ برقی ذرات کی شکل میں جو عکس محفوظ ہوا ہے، وہ مستقل ہوتا ہے، صاحبِ عکس کے تابع نہیں ہوتا، جب چاہیں اس کو بلا ذی عکس کے اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔

(۲) حضراتِ اکابر کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ عکس کے جواز کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی سطح پر رنگ ومسالہ سے قائم وپائیدار نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کے جواز کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ غیر مستقل اور ذی عکس کے تابع ہوتا ہے، بغیر ذی عکس کے ایک لمحہ بھی قائم اور باقی نہیں رہتا، اگر کسی طرح سے اس کی یہ تبعیت اور ذی عکس پر اس کا یہ انحصار ختم ہو جائے اور اس میں ایسا استقلال پیدا ہو جائے کہ جب چاہیں بلا ذی عکس کے اس کو دیکھنا ممکن ہو، خواہ رنگ ومسالہ کے ذریعہ قائم کیے بغیر محض انعکاسی صورت ہی میں کیوں نہ ہو تو یہ بھی تصویر سازی کے حکم میں داخل ہوگا۔

عکس کے بقاء اور قیام وپائیداری کا مفہوم فقط اتنا ہے کہ عکس مستقل بن جائے، ذی عکس پر اس کا انحصار ختم ہو جائے اور بلا ذی عکس کے اس کو دیکھ لیا جانا ممکن ہو، خواہ اس میں یہ بقاء وپائیداری اور استقلال کسی سطح پر بعینہٖ منعکس اور محفوظ ہو کر ہو؛ جیسا کہ غیر ڈیجیٹل کیمرہ میں ہوتا ہے، یا بلا کسی سطح کے برقی ذرات کی شکل میں محفوظ اور مقید ہو کر ہو؛ جیسا کہ ڈیجیٹل کیمرہ میں ہوتا ہے اور جہاں تک کسی سطح پر مسالہ وغیرہ کے ذریعہ عکس کے بقاء کا مسئلہ ہے تو چونکہ اس وقت بغیر سطح اور مسالہ کے عکس کو محفوظ کرنے اور باقی رکھنے کی شکل پیدا نہیں ہوئی تھی؛ اس لیے سطح اور مسالہ کے ذریعہ بقاء کی قید تھی، یہ قید قیدِ واقعی ہے قید احترازی نہیں؛ لہٰذا اگر بغیر سطح اور مسالہ کے بھی عکس محفوظ اور باقی رہ جائے تو وہ بھی تصویر محرم میں داخل ہوگا، احادیث، شراحِ حدیث اور حضرات فقہاء کے

کلام کے عموم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور حضراتِ اکابر کی تصریحات سے بھی، ذیل میں اس مسئلہ سے متعلق حضراتِ اکابر کی مکمل تصریحات درج ہیں، مرسلہ مقالہ میں بعض اکابر کی تصریحات ناقص نقل کی گئی ہیں، جس سے ان اکابر کے موقف اور منشاء کی صحیح ترجمانی نہیں ہوسکی اور اس کا رخ دوسرا ہوگیا:

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ عکس اور فوٹو کے درمیان فرق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''سب سے بڑا فرق دونوں میں یہی ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں ہوتا، اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کرلیا جاتا ہے؛ پس وہ اسی وقت عکس ہے، جب تک مسالہ سے اسے قائم نہ کیا جائے اور جب اس کو کسی طریقہ سے قائم اور پائیدار کرلیا جائے وہی تصویر بن جاتا ہے''۔ (امداد الاحکام:۴/۳۸۴)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنے رسالہ ''آلات جدیدہ کے احکام'' میں عکس اور فوٹو کے درمیان فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عکس، صاحب عکس کا ایک عرض ہے، جو اس سے علاحدہ نہیں ہوسکتا؛ یہی وجہ ہے کہ آئینہ، پانی وغیرہ میں جب تک ذی عکس ان کے مقابل رہتا ہے تو عکس باقی رہتا ہے اور جب وہ ان کے محاذات سے ہٹ جائے تو عکس بھی اس کے ساتھ چل دیتا ہے، دھوپ میں آدمی کھڑا ہوتا ہے اور اس کا عکس زمین پر پڑتا ہے؛ مگر اس کا وجود آدمی کے تابع ہوتا ہے، جس طرف یہ چلتا ہے عکس بھی اس کے ساتھ چل دیتا ہے، زمین کے کسی حصہ پر اس کا قائم و پائیدار ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی مسالہ اور رنگ کے ذریعہ سے اس کی تصویر نہ کھینچ لی جائے۔

حاصل یہ ہے کہ عکس جب تک کہ مسالہ وغیرہ کے ذریعہ سے پائیدار نہ کرلیا جائے، اس وقت تک عکس ہے اور جب اس کو کسی طریقہ سے قائم و پائیدار کرلیا جائے تو وہ تصویر بن جاتا ہے اور عکس جب تک عکس ہے، نہ شرعاً اس میں کوئی حرمت ہے اور نہ کسی قسم کی کراہت؛ خواہ آئینہ، پانی یا کسی اور شفاف چیز پر ہو یا فوٹو کے شیشہ پر، اور جب وہ اپنی حد سے گزر کر تصویر کی صورت اختیار کرے گا، خواہ وہ مسالہ کے ذریعہ سے ہو یا خطوط

ونقوش کے ذریعہ سے، اور خواہ یہ فوٹو کے شیشہ پر ہو یا آئینہ وغیرہ شفاف چیزوں پر اس کے سارے احکام وہی ہوں گے جو تصویر کے متعلق ہیں" (ص:۱۴۱)۔

مفتی رشید احمد صاحبؒ اسی مسئلہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس کو عکس کہنا بھی صحیح نہیں؛ اس لیے کہ عکس اصل کے تابع ہوتا ہے اور یہاں اصل کی موت کے بعد بھی اس کی تصویر باقی رہتی ہے"۔ (احسن الفتاویٰ: ۹/۸۹)

ایک دوسرے مقام پر اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تصویر اور عکس دو بالکل متضاد چیزیں ہیں: تصویر کسی چیز کا پائیدار اور محفوظ نقش ہوتا ہے، عکس ناپائیدار اور وقتی نقش ہوتا ہے، اصل کے غائب ہوتے ہی اس کا عکس بھی غائب ہوجاتا ہے، ویڈیو کے فیتہ میں تصویر ہوتی ہے، جب چاہیں جتنی بار چاہیں ٹی وی اسکرین پر اس کا نظارہ کرلیں اور یہ تصویر تابعِ اصل نہیں؛ بلکہ اس سے لاتعلق اور بے نیاز ہے، کتنے لوگ ہیں جو مر کھپ گئے، دنیا میں ان کا نام ونشان نہیں؛ مگر ان کی متحرک تصاویر ویڈیو کیسٹ میں محفوظ ہیں، ایسی تصویر کو کوئی بھی پاگل عکس نہیں کہتا، صرف اتنی سی بات کو لے کر کہ ویڈیو کے فیتہ میں ہمیں تصویر نظر نہیں آتی، تصویر کے وجود کا انکار کردینا کھلا مغالطہ ہے"۔ (احسن الفتاوی: ۸/۳۰۲)

مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند شرح ترمذی میں تحریر کرتے ہیں:

"اسی طرح یہ دلیل کہ کیمرہ کا فوٹو ایک ظل (سایہ) ہے اور خود اس کا سایہ نہیں ہے، جیسا پانی میں سایہ پڑتا ہے، بس اس کو کیمرہ سے برقرار کرلیا جاتا ہے؛ پس اس میں کیا حرج ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ظل برقرار کرنے ہی سے تو صورت بنتی ہے اور صورت کا سایہ ہونا ضروری نہیں، اور مطلق صورت سے فساد پھیلتا ہے؛ پس جب تک وہ ظل ہے اس کے احکام اور ہیں، اور جب اس کو برقرار کرلیا جائے تو وہ تصویر بن جاتا ہے اور حرام ہوجاتا ہے"۔ (تحفۃ الالمعی: ۵/۸۰)

ان اقتباسات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی جاندار کا مطلق عکس محفوظ کرنا،

خواہ کسی سطح (نگیٹو) پر ہو یا بلا کسی سطح کے برقی ذرات کی شکل میں ہو، اگر اس میں ایسا استقلال واستقرار پیدا ہوجائے کہ جب چاہیں بلا ذی عکس کے اس کو دیکھا جانا ممکن ہو تو یہ بھی تصویر سازی میں داخل ہے۔

(۳) اہلِ فتویٰ حضرات اکابر میں سے جن کی حیات میں حفظِ عکس کی یہ جدید صورت سامنے آئی، انھوں نے بھی عکس کی مذکورہ حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کو تصویر کہا اور ویڈیو کے فیتے میں محفوظ ہونے والے غیر مرئی عکس کو بھی تصویر قرار دیا، حالانکہ ویڈیو کے فیتے میں اس کا نہ کوئی نام ونشان ہوتا ہے اور نہ کسی آلہ کی مدد سے اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے، ڈیجیٹل کیمرہ اسی ویڈیو گرافی کا جدید ایڈیشن ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ ویڈیو کیسٹ میں موجود فیتہ کا مادہ دوسرا ہے اور حجم بھی بڑا ہے، اور ڈیجیٹل کیمرے میں موجود چپ کا مادہ دوسرا ہے اور حجم بھی بہت کم۔

مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ اسی غیر مرئی شکل میں محفوظ عکس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''ویڈیو کیمرہ سے کسی بھی تقریب کی منظر کشی کا عمل تصویر سازی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے؛ جیسے قدیم زمانہ میں تصویر ہاتھ سے بنائی جاتی تھی، پھر کیمرہ کی ایجاد نے اس قدیم طریقہ میں ترقی کی اور تصویر ہاتھ کے بجائے مشین سے بننے لگی، جو زیادہ سہل اور دیرپا ہوتی ہے، اب اس عمل میں نئی نئی سائنسی ایجادات نے مزید ترقی کی اور جدت پیدا کی، اور جامد وساکن تصویر کی طرح اب چلتی پھرتی دوڑتی بھاگتی صورت کو بھی محفوظ کیا جانے لگا، یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو قرار و بقاء نہیں، اگر اس کو بقاء نہیں تو وہ ٹی وی اسکرین پر چمکتی دمکتی اور اچھلتی کودتی نظر آنے والی چیز کیا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ وہی تصویر ہے، جو کسی وقت لے کر محفوظ کی گئی تھی، صرف اتنی سی بات ہے کہ کیسٹ کی پٹی میں ایسی فنی جدت سے کام لیا گیا ہے کہ دیکھنے میں پٹی خالی نظر آتی ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ وہ تصویر معدوم نہیں ہوتی، ورنہ وی سی آر پر دوبارہ کیسے ظاہر ہوسکتی ہے؟''۔

(احسن الفتاوی:۹/۸۸)

''تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام'' نامی رسالہ (مؤلفہ مفتی احسان اللہ شائق

صاحب) میں حضرت مولانا محمد یوسف شہید لدھیانویؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے، جس میں حضرت نے لکھا ہے کہ:

''ٹی وی اور ویڈیو فلم کا کیمرہ جو تصویریں لیتا ہے وہ اگرچہ غیر مرئی ہیں؛ لیکن تصویر بہر حال محفوظ ہے اور اس کو ٹی وی پر دیکھا جا سکتا ہے، اس کو تصویر کے حکم سے خارج نہیں کیا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ سے تصویر بنانے کے فرسودہ نظام کے بجائے سائنسی ترقی نے تصویر سازی کا ایک دقیق طریقہ ایجاد کیا ہے؛ لیکن جب شارع نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے تو تصویر سازی کا خواہ کیسا ہی طریقہ ایجاد کر لیا جائے تصویر تو حرام ہی رہے گی''۔ (ص:۹۴)

اسی نو پید صورت کے بارے میں مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند شرح ترمذی میں لکھتے ہیں:

اسی طرح ایک دلیل لوگ یہ بھی دیتے ہیں کہ ڈیجیٹل میں اور فلم میں غیر واضح ذرات کی شکل میں تصویر آتی ہے؛ پس اس پر تصویر کا اطلاق درست نہیں؛ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ غیر واضح نکتے کیا کام آئیں گے؟ ان کو بہر حال صفحۂ قرطاس (اسکرین) پر واضح کر کے منتقل کیا جائے گا؛ پس مآلاً وہ تصویر بنیں گے؛ اس لیے ابتداء ہی سے وہ حرام ہوں گے''۔ (تحفۃ الالمعی: ۸۰/۵)

ویڈیو گرافی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا محمد خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ویڈیو گرافی اور فوٹو گرافی کو عکس قرار دینا صحیح نہیں، عکس وہ صورت ہے جس میں ٹھہراؤ اور جماؤ نہ ہو؛ جیسا کہ پانی یا آئینہ میں ہوتا ہے، ویڈیو گرافی اور فوٹو گرافی میں یہ صورت نہیں ہوتی؛ بلکہ صاحبِ تصویر کی صورت ریل میں محفوظ ہو جاتی ہے اور جماؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے''۔ (کتاب الفتاوی: ۱۷۰/۶)

علاوہ ازیں مرسلہ مقالہ اور فتوی میں جن عرب علماء کے اقوال بطور استدلال و تائید پیش کیا گیا ہے، یہ درست نہیں، ان کا تو موقف ہی علاحدہ ہے، انہوں نے تو عام

کیمرے کے فوٹو کو بھی پہلے ہی سے تصویر سے خارج کر رکھا ہے؛ لہٰذا فتویٰ میں ان کے اقوال سے استدلال نہ ہونا چاہیے، اسی طرح بنگلور اجتماع کے حوالہ سے حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب نور اللہ مرقدہ وغیرہ کی جو رائے نقل کی گئی ہے، وہ دورانِ بحث ان کی طرف سے پیش کردہ محض ایک بات تھی، نہ وہ ان کی کوئی حتمی رائے تھی اور نہ ہی سیمینار کا فیصلہ، سیمینار کا فیصلہ ٹی وی کے عدم جواز کا ہی تھا؛ پس ایسی کچی بات بھی فتویٰ کی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔

(۴) شریعتِ اسلامیہ میں تصویر سازی مطلقاً حرام ہے؛ خواہ تصویر چھوٹی ہو یا بڑی اور خواہ کسی ذی جسم مادہ سے بنائی جائے یا غیر ذی مادہ جسم سے اور خواہ بن جانے اور وجود میں آجانے کے بعد وہ باقی رہے یا نہ رہے۔ امام نووی کی صراحت ہے: **تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر؛ لأنه متوعد بهذا الوعيد الشديد المذكور في هذاالحديث وسواء صنعه بما يمتهن أو بغيره، فصنعته حرام بكل حال؛ لأنه فيه مضاهاة لخلق الله تعالىٰ وسواء ماكان في ثوب أو بساط أو درهم أو دينار أو فلس أو إناء أو حائط أو غيرها.** (شرح مسلم:۲/۱۹۹)

تصویر کے تحقق کے لیے قرار و بقاء ضروری نہیں، فقط اتنا ضروری ہے کہ وہ صاحب تصویر اور اصل کے تابع نہ ہو، اور قرار و بقاء کا مفہوم بھی صرف اتنا ہی ہے؛ لہٰذا اگر کسی شخص نے کوئی تصویر بنائی اور پھر فوراً اگلے ہی لمحہ اس کو مٹا بھی دیا تو اس کو تصویر سازی کا گناہ ہوگا، یا اگر کوئی مشین ایسی ہو؛ جس کی ایک زد سے تصویر بنتی ہو اور دوسری زد سے فوراً محو ہو جاتی ہو تو یہ بھی تصویر سازی میں داخل ہو کر حرام ہوگا؛ اسی طرح ڈیجیٹل کیمرہ اسکرین پر جو شعاعیں پھینکتا ہے تو اسکرین پر تصویر بن جاتی ہے اور اگلے ہی لمحہ فنا بھی ہو جاتی ہے، ایک سیکنڈ میں ساٹھ فریم بنتے اور ٹوٹتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ فریم کا ٹوٹنا اور فنا ہونا وجود کے بعد ہی ہوتا ہے اور وجود ہی پر متفرع ہوتا ہے؛ لہٰذا یہ بھی تصویر سازی میں داخل ہوگا۔

قرار و بقاء کے مذکورہ مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے، حضرات اکابر نے سینما کے پردہ پر ظاہر ہونے والے نقوش کو بھی تصاویر قرار دیا، سینما کے پردہ پر نمودار ہونے والے نقوش بھی بنتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں، ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والے نقوش، پردۂ سینما پر ظاہر ہونے والے نقوش سے مشابہت و مطابقت رکھتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ پردہ سینما پر شعاعیں سامنے سے ڈالی جاتی ہیں اور ٹی وی اسکرین پر پیچھے سے؛ لہٰذا ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والے نقوش بھی تصویر میں داخل ہوں گے۔

مفتی رشید احمد صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اگر یہی تسلیم کرلیا جائے کہ وہ (ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والی تصویر) مٹ جاتی ہے اور پھر بنتی ہے، یہی عمل ہر لحظہ جاری رہتا ہے تو اس میں اور زیادہ قباحت ہے کہ بار بار تصویر بنانے کا گناہ ہوتا ہے''۔ (احسن الفتاوی:۹/۸۹)

(۵) کسی بھی مسئلہ کی سائنسی تحقیق کرنا برا نہیں، ڈیجیٹل چپ کیسے کام کرتی ہے؟ اس کی اہل فن سے تحقیق کی جاسکتی ہے؛ لیکن اس تحقیق پر فتویٰ کا مدار رکھنا مناسب نہیں، فتوی کا مدار اس شئے کے عوامی تصور اور اس کی ظاہری حیثیت پر ہی ہونا چاہیے، رؤیت ہلال کا مسئلہ منصوص ومصرح ہے کہ اس کے تحقق کا حکم ظاہری رؤیت و دید پر ہوگا؛ خواہ سائنسی تحقیق کچھ بھی کہتی رہے، ماضی قریب میں آلۂ مکبر الصوت کا مسئلہ درپیش ہوا تو اس سلسلہ میں ماہرین فن کی مختلف آراء سامنے آئیں؛ لیکن فتوی عوامی تصور کے مطابق نماز کے جواز کا دیا گیا کہ عام لوگ اس کی آواز کو متکلم کی اصلی آواز ہی سمجھتے ہیں؛ اسی طرح ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والی صورتوں کو اگرچہ ارباب فن تصویر نہ قرار دیں، امیج کہیں، مگر عوام ان کو صورتیں ہی سمجھتے ہیں؛ پس فتویٰ اسی تصور کے مطابق دینا چاہیے۔

آلۂ مکبر الصوت اور سائنسی تحقیق کی شرعی حیثیت پر مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کی ایک اصولی تحریر ملاحظہ ہو:

''عام احکام اسلامیہ شرعیہ کے ملاحظہ سے یہ امر متیقن ہے کہ جن مسائل کا تعلق فلسفیانہ تحقیق وتدقیق یا ریاضی کی باریکیوں یا اصطرلاب وغیرہ آلات سے ہے، شریعت

مصطفویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام ان سب میں حقائق کی تحقیق وتدقیق سے اغماض کر کے محض ظواہر پر احکام دائر فرمائے ہیں، جن کو ہر خاص وعام، عالم وجاہل شہری اور جنگلی آسانی کے ساتھ بدوں استعانتِ آلات وحسابات معلوم کر کے خدا تعالی کی طرف سے عائد شدہ فریضہ سے سبکدوش ہوسکے، رؤیتِ ہلال اور اختلافِ مطالع کی بحث میں منجمین اور اہل ریاضی کی تحقیقات کو، سمتِ قبلہ میں اصطرلاب کے استعمال کو اسی بنا پر مسائل شرعیہ کی بنیاد نہیں بنایا گیا؛ بلکہ ہلال کا مدار رؤیت پر، اور سمتِ قبلہ کا شہر کی قریبی مساجد پر، پھر محاریب صحابہ پر رکھ دیا گیا، حالانکہ یہ فتویٰ اور ان کے آلات عہدِ رسالت اور قرون مابعد میں بکثرت موجود ومروج تھے۔

اس اصول کی بنا پر مسئلہ زیر بحث میں دو نتیجے نکلتے ہیں: اول یہ کہ عباداتِ خالصہ میں اس قسم کے آلات کا استعمال اصولاً پسندیدہ نہیں؛ جیسا کہ اس کی تفصیل اسی رسالہ کے شروع میں آچکی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی نے ان آلات کو مسائلِ مذکورہ میں استعمال کرلیا تو اصل عمل صحت وعدم صحت کا مدار پھر بھی ان فنی تدقیقات پر نہیں؛ بلکہ ظاہرِ حال ہی پر رہے گا؛ مثلاً اگر کسی شخص نے اصطرلاب وغیرہ کے ذریعہ سمت قبلہ قائم کرلی تو شرعاً اس کی صحت وعدم صحت کا معیار فنِ اصطرلاب کی باریکیاں نہ ہوں گی؛ بلکہ وہی عام مساجد بلدہ کی موافقت وعدم موافقت پر مدار ہوگا۔

مذکور الصدر اصول کے مطابق آلۂ مکبر الصوت کے ذریعہ سنائی دینے والی آواز کو ظاہر و متعارف عوام کے موافق متکلم کی اصل آواز ہی کہا جائے گا، گو فنی تدقیقات بالفرض یہی ثابت کریں کہ وہ اصل آواز نہیں؛ بلکہ اس کا عکس ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں اصل آواز اور اس آلہ کی آواز کا فرق اس قدر دقیق ہوگا کہ اس کو عوام تو کیا خود ماہرینِ سائنس کو بھی واضح نہ ہوا؛ اس لیے ان میں اختلاف رہا تو ایسی تدقیقات فلسفیہ؛ جن کا ادراک ماہرینِ فن بھی مشکل سے کرسکیں احکام شرعیہ کا مدار نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان احکام میں حسبِ ظاہر اس کو اصل متکلم ہی کی آواز قرار دیا جائے گا۔ واللہ

سبحانہ وتعالیٰ اعلم''۔ (آلات جدیدہ کے احکام:۶۰)

مفتی رشید احمد صاحبؒ کسی شئے کے تصویر ہونے یا نہ ہونے کے معیار و مدار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تصویر ہونے یا نہ ہونے کا مدار عرف پر ہونا چاہیے، نہ کہ سائنسی وفنی تدقیقات پر اور عرف عام میں اسے تصویر ہی سمجھا جاتا ہے؛ جیسے شریعت نے صبحِ صادق اور طلوع وغروب کا علم کسی دقیق علم وفن پر موقوف نہیں رکھا، ظاہری وسہل علامات پر رکھا ہے''۔

(احسن الفتاوی:۹/۸۹)

(۶) تصویر کی حرمت کی علت، خود شارع علیہ الصلوۃ والسلام کی صراحت کے مطابق: **مضاھاۃ لخلق اللّٰہ** ہے، یعنی تخلیقِ خداوندی کی نقالی اور ہمسری۔ اس حوالہ سے یہ بات قابلِ غور ہے کہ مجسم اور غیر متحرک تصاویر ایک ہی وضع اور حالت پر رہتی ہیں ، اور محض ظاہری اعتبار سے خلق اللہ کے مشابہ ہوتی ہیں، ورنہ درحقیقت دونوں میں بون بعید اور تباین ہے کہ خلق اللہ زندہ اور متحرک بالارادہ ہے اور خلق العبد سراپا جامد وساکن اور محض ایک نقش اور چھاپہ؛ مگر دونوں کی حقیقت اور ماہیت میں اس قدر فرق کے باوجود محض ظاہری تشابہ کی بنیاد پر اس ظاہری نقش کو بھی اللہ تعالی کی ہمسری اور نقالی میں داخل مانا گیا، تو کیا خلق العبد کے وہ نقوش جو دیکھنے میں زندہ اور متحرک بالارادہ نظر آئیں اور روح وجان رکھنے والی اشیاء کی طرح جملہ افعال وحرکات کرتے دکھائی دیں، خلق اللہ کے ساتھ اتنی زیادہ قربت ومشابہت کے باوجود خلق اللہ کی نقالی اور ہمسری میں داخل نہیں ہوں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ زیرِ بحث صورت، تصویر سے کمتر نہیں؛ بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، اور تصویر کے حرام ہونے کی جو اصل وجہ اور علت ہے؛ یعنی مضاہاۃ ومشابہت، اس کا واضح مصداق ہے، نیز تصویریں ٹی وی اسکرین سے لے کر روز اخباروں میں چھپتی ہیں، پس ان صورتوں کو اشبہ بالعکس کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان کو اشبہ بالصور قرار دینا ہی مناسب ہے۔

جس وقت فوٹو گرافی کا مسئلہ نیا نیا پیدا ہوا، اور علماء میں اس کے جواز وعدم جواز کی

بحث چھڑی، تو اس کے جواز کی ایک دلیل یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ اس صورت میں اعضاء کی تخلیق وتکوین نہیں ہوتی، فقط ایک نقش اور چھاپہ ہوتا ہے؛ لہٰذا یہ تصویر سے خارج ہونا چاہیے؛ لیکن حضراتِ اکابر نے اس کو یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ تصویر کے تحقق کے لیے با قاعدہ اعضاء وجوارح کی تخلیق وتکوین ضروری نہیں، محض ایک نقش بنا دینا بھی تصویر میں داخل ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی اسی سلسلہ کی ایک تحریر ملاحظہ ہو:

''ذرا بھی غور سے کام لیں تو اعضاء کی تخلیق وتکوین تو کوئی مصور بھی نہیں کرتا، اعضاء کی ظاہری سطح نقش کے ذریعہ بنا دیتا ہے، نہ اس میں رگیں پٹھے بنتے ہیں، نہ ہڈی اور گوشت بنتا ہے، شریعت نے اس ظاہری سطح کا نقش بنا دینے ہی کا نام تصویر رکھا ہے، جس کو حرام قرار دیا ہے، تو فوٹو میں اعضاء کی سطح کو رنگ وروغن کے ذریعہ قائم کر دینے اور قلم سے رنگ بھر دینے میں کیا فرق ہے؟ حدیث کے الفاظ میں بھی اس کو تخلیق نہیں؛ بلکہ مضاہاۃ لخلق اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؛ یعنی تخلیقِ خداوندی کی مشابہت پیدا کرنا اور نقالی اتارنا، اس میں ظاہر ہے کہ وہ قلم کے ذریعہ کی جائے یا کسی مشین کے ذریعہ، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں''۔ (تصویر کے شرعی احکام: ۲۱۴)

(۷) اگر کوئی چیز منافع ومفاسد: دونوں کو جلو میں لیے ہوئے ہو تو فتویٰ میں بہت غور کرنا چاہیے، کہ کون سا پہلو غالب ہے، حرمتِ خمر کے سابقہ مرحلہ کی جو آیت سورۂ بقرہ میں ہے، اس سے یہ اصول ثابت ہے اور حضرات فقہاء کی بھی صراحت ہے: **درء المفاسد أولیٰ من جلب المصالح، فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً؛ لأن اعتناء الشّرع بالمنهيات أشدّ من اعتنائه بالمأمورات.** (الأشباه والنظائر لإبن نجيم: ۱/۲۹۰)

ٹی وی میں بے شک کچھ منافع ہیں، جو اظہر ہیں؛ مگر اس کے مفاسد کا پہلو غالب ہے؛ جیسا کہ تجربہ ہے، جب ٹی وی کی صورتوں کو حرام صورتوں سے خارج کر دیا جائے گا اور ٹی وی کو جائز کہہ دیا جائے گا تو یہ سانپوں کی پٹاری ہر دیندار مسلمان کے گھر میں داخل

ہو جائے گی، اور ٹی وی چینلوں پر کسی کا زور نہیں، پس گھر والے ہر طرح کے چینل دیکھیں گے، اور اشاعتِ اسلام اور دفاع عن المسلمین کا مقصد تو ایک طرف رہ جائے گا اور صالح اسلامی معاشرہ تباہ ہو کر رہ جائے گا، فتوے میں اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

علاوہ ازیں اس وقت ٹی وی مفاسد اور محرمات کا مبدأ اور سرچشمہ بنا ہوا ہے، پوری دنیا میں جو فحاشی وعریانیت اور بے حیائی وبرہنگی مفت تقسیم ہو رہی ہے، وہ سب اسی ڈیجیٹل نظام کی دین اور پیداوار ہے، اس لحاظ سے بھی یہ **کل ما أدى إلى ما لا يجوز لا يجوز** کے تحت ناجائز اور حرام ہونا چاہیے۔

مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ العالی اپنی شرح ترمذی میں رقم طراز ہیں:

''تصویر سازی اس لیے بھی حرام ہے کہ تجربہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس وقت ساری دنیا فحاشی اور عریانیت سے جو بھر گئی ہے، یہ اسی کیمرے کی نحوست ہے، پہلے گندے فوٹو کوک شاستروں میں چھپتے تھے اور لوگ چپکے چپکے ان کو دیکھتے تھے؛ مگر اب ٹی وی، ویڈیو، وی سی آر وغیرہ خرافات کے ذریعہ ہر جگہ یہ ننگے فوٹو پھیل گئے ہیں، اور نوجوان نسل تیزی کے ساتھ ان کا اثر قبول کر رہی ہے، اور **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** کا منظر عیاں ہے، مکہ اور مدینہ بھی اس سے نہیں بچے؛ بلکہ اب تو ڈیجیٹل کیمرے، موبائل میں آ گئے ہیں اور ہر جیب میں موجود ہیں۔ **فإلى الله المشتكى!**''

(تحفۃ الالمعی: ۵/۷۹)

الغرض مذکورہ معروضات کی روشنی میں ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ محفوظ کردہ عکس اور ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہونے والی صورتیں بھی تصویر محرم میں داخل ہیں اور مجسم تصویر سازی اور فوٹو گرافی کی طرح ناجائز اور حرام ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

العبد محمد طاہر عفا اللہ عنہ مفتی مظاہر علوم سہارنپور (یوپی) یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری خادم دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: مقصود عالم مفتی الجامعہ مظاہر علوم

باسمہ تعالیٰ: تصدیق کی جاتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد طاہر صاحب مفتی مدرسہ مظاہر علوم

سہارن پور کا تحریر کردہ فتویٰ ہذا، جس میں ڈیجیٹل تصویر کا حکم شرعی مفصلا بیان کیا گیا ہے، صحیح اور درست ہے۔ الجواب صحیح والمجیب مصیب وللہ درہ۔ فقط واللہ اعلم

المصدق: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: حامدا ومصلیا ومسلما: **مفتی محمد طاہر صاحب مدظلہ کا جواب درست اور حق ہے، والحق أحق أن یتبع.** فقط محمود حسن غفرلہ بلندشہری

دارالعلوم دیوبند ۴/ ۷/ ۱۴۳۲ھ یوم الثلثاء الموافق ۷/ ۶/ ۲۰۱۱ء

الجواب صحیح: فخر الاسلام

تبدیلیٔ جنس کا شرعی حکم

جنس تبدیل کرنے والے سے نکاح کا مسئلہ

سوال: ﴿۸۶﴾ ......(۱) ٹرانسجینڈر (جنس تبدیل کرنے والوں) کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

(۲) کیا کوئی مسلمان جنس بدل کر عورت ہونے والے شخص سے شادی کرسکتا ہے؟ کیا کوئی مسلمان ایسی دو عورتوں سے شادی کرسکتا ہے جو مساحقہ (لیسبین) ہوں؟ (۱۶۵۷/ د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) مذہب اسلام کی رو سے اللہ تعالیٰ کی خلقت اور بناوٹ میں تبدیلی کرنا یا کسی قسم کا تغیر کرنا، قطعی طور پر حرام اور ناجائز ہے، اور اس قسم کی شیطانی حرکت مذموم ہے، ارشاد باری ہے: **فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ.** (روم: ۳۰) اللہ کی فطرت پر قائم رہو، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں۔ **وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ** (نساء: ۱۱۹) (شیطان نے کہا) میں لوگوں کو ضرور حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے، مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ تبدیلی ہے، جس کا تعلق ظاہر بدن سے ہو؛ مثلاً: خصی کرانا، ہجڑا بننا وغیرہ۔ **حمل هذا التغيير على تغيير أحوال كلها تتعلق بالظاهر............. قال الحسن: المراد ما روى عبد الله بن مسعود عن النبي صلّى الله عليه وسلّم: لعن**

اللّٰہ الواصلات الخ. وروي عن أنس وشهر بن حوشب وعكرمة: أن معنى تغيير خلق اللّٰہ ههنا هو الإخصاء، وقطع الآذان............. قال ابن زيد: هو التخنث. (التفسير الكبير للرازي: ۱۱/۳۹، سورة نساء ۱۱۹، بيروت)

جب آیت کریمہ کی رو سے انسانوں کو خصی کرنا، مخنث بننا اللہ کی خلقت میں تغییر اور تبدیلی ہے تو مرد کا عورت اور عورت کا مرد بن کر صنف تبدیل کرنا، بدرجۂ اولیٰ اس آیت میں داخل ہو کر ممنوع اور حرام قرار پائے گا، احادیث میں بھی تغییر خلق سے سخت ممانعت آئی ہے: **عن عبداللّٰہ بن مسعود قال: لعن اللّٰہ الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق اللّٰہ** (مشكاة: ۳۸۱، كتاب اللباس، باب الترجل).

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ گودنے والی اور گدوانے والی عورتیں، منھ پر سے بال نُچوانے والی عورتیں، افزائش حسن کے لیے دانتوں کے درمیان خلا کروانے والی عورتیں، ان سب پر کہ جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں تغییر کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

علامہ قرطبی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ان کاموں سے نہی اس لیے آئی ہے کہ اس میں اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہوتی ہے، ایسا کرنا اللہ رب العزت کے نظام تخلیق میں دخیل بننا ہے، جو ناجائز وحرام ہے۔(۱)

(۲) صورت مسئولہ میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عورت بننے کے بعد اس کو حیض آتا ہے، اس کو دودھ اترتا ہے اور حاملہ ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے؟ ان باتوں کو واضح کریں پھر ان شاء اللہ جواب دیا جائے گا۔

(۳) عن أبي هريرة قال: قال رسول اللّٰہ صلّى اللّٰہ عليه وسلّم: تنكح المرأة لأربع: لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها، فاظفر بذات الدين، تربت يداك. متفق عليه. (مسلم، باب استحباب نكاح ذاب الدين)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورتوں سے

---

(۱) اختلف في المعنى الذين نهى لأجلها، فقيل: لأنها من باب التدليس وقيل من باب تغيير خلق اللّٰہ كما قال ابن مسعود وهو الأصح (تفسير القرطبي: سورة النساء، رقم الآية: ۱۱۹).

نکاح کرنے میں چار چیزوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے: اول: اس کا مال دار ہونا، دوم: اس کا حسب ونسب والی ہونا، سوم: اس کا حسین وجمیل ہونا، چہارم: اس کا دین دار ہونا؛ لہٰذا دین دار عورتوں کو اپنا مطلوب قرار دو اور خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ۔ (بخاری ومسلم)

اس حدیث میں دین دار عورتوں کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کی ترغیب آئی ہے، اس سے بچوں کے اخلاق وعادات اور ان کی تربیت پر نمایاں اثر پڑتا ہے (۱) **سحق:** عورت کا مرد کی مشابہت اختیار کرکے باہم جنسی خواہشات پوری کرنا، تغییر خلق اللہ میں داخل ہے، جو شرعاً ناجائز وحرام ہے۔ **وأقول: يجب إدخال السحاقات في هذه الآية على هذا القول؛ لأن ا لتخنث عبارة عن ذكر يشبه الأنثى، و السحق عبارة عن أنثى تشبه الذكر** (التفسير الكبير للرازي)(۲).

لہٰذا ایسی عورتیں جو باہم مل کر اپنی جنسی خواہشات پوری کرتی ہوں ان سے نکاح جب کہ کوئی دوسرا مانع شرعی (مثلاً ان کا رضاعی بہن، حقیقی بہن ہونا) نہ پایا جاتا ہو، اگرچہ جائز ہے: **لقوله تعالیٰ: واحل لكم ما وراء ذلكم** (نساء:۲۴)، مگر احتیاط اور انسانی غیرت وحمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی بدکردار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے سے اجتناب کیا جائے؛ کیوں کہ ایسی عورتوں کی جنسی تسکین مردوں سے پوری نہیں ہوتی، وہ مردوں سے بے نیاز رہتی ہیں، ان کے اکٹھا رہنے سے قوی مظنہ ہے کہ وہ جنسی تسکین آپس میں مل کر پوری کریں گی اور فتنہ وفساد کھڑا ہوگا۔

از: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ

فخر الاسلام عفی عنہ مفتیان دار الافتاء دارالعلوم دیوبند

فیملی پلاننگ کی مروجہ شکلیں اور ان کا حکم

سوال: ﴿۸۷﴾......(۱) میں فیملی پلانگ (نس بندی) کے بارے میں جاننا چاہوں گا، اسلام

(۱) **تزوجوا في الحجز الصّالح فإن العرق دساس.** (كنز العمال: ۲۹۶/۱۶، رقم الحديث: ۴۴۵۵۹).

(۲) مفاتيح الغيب للرازي: ۳۹/۱۱، ط: دار الكتب العلمية بيروت.

میں ممنوع ہے یا گناہ ہے؟

(۲) اگر میرے پاس دو سے زیادہ بچے ہوں اور میں آج کے حساب سے ان بچوں کی ضروریات؛ جیسے اسلامی تعلیم وتربیت، پوری نہیں کر پا رہا ہوں، یا میرے صرف دو بچے ہوں اور میں مذہبِ اسلام کے مطابق ان بچوں کی ضروریات پوری کرسکتا ہوں تو کیا بہتر ہے؟ براہِ کرم اس پر روشنی ڈالیں۔ شبیر منیر (۱۷۸۶/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

ضبطِ ولادت کی دو شکل ہوتی ہے: (۱) کلی طور پر قوتِ تولید ختم کردی جائے؛ جس کو نس بندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) منعِ حمل کی ایسی تدبیر اختیار کرنا؛ جس میں صلاحیت تو ختم نہ ہو مگر اولاد کا امکان کم ہو جائے؛ مثلاً: نرودھ لوپ استعمال کرکے رحم میں نطفہ نہ پہنچنے دیا جائے، استقرارِ حمل سے مانع ادویات کا استعمال کیا جائے، یا استقرار کے بعد ساقط کرادیا جائے، یا ان خاص ایام میں جن میں طبی تحقیق کے مطابق حمل ٹھہرنے کا امکان غالب ہو، بیوی سے صحبت نہ کی جائے۔

پہلی شکل؛ یعنی نس بندی اس سے قریب جو صورت قرنِ اول میں معروف تھی وہ ''اختصاء'' (خصیتین کا نکال دینا) تھی، نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق بعض صحابہ نے استفسار کیا کہ آپ ہمیں اختصاء کی اجازت دیں، تاکہ جنسی خواہشات یکسر ختم ہوجائے اور ہم اللہ کی عبادت یکسوئی سے کرسکیں اور فریضۂ جہاد بہ حسن وخوبی انجام دیا جاسکے، آپ ﷺ نے ان کو اس عمل سے سختی کے ساتھ منع کیا اور اس فعل کے حرام ہونے کے متعلق یہ آیت پڑھی: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ** . (المائدۃ:۸۷)۔ ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالی نے جو چیزیں تمھارے واسطے حلال کی ہیں، ان میں لذیذ چیزوں کو حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ قرآن پاک میں ہے: **ولآمرنهم فليغيرن خلق الله** (شیطان کہتا ہے کہ میں انھیں تعلیم دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت بگاڑیں گے) اس آیت کی تفسیر میں حضرت انس اور عکرمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تغییر خلق اللہ کے معنی خصی کرانا اور کان کٹوانا ہے، **روی عن انس و عکرمة ان**

معنى تغيير خلق الله هو الإخصاء و قطع الآذان (تفسیر کبیر:۱۱/۳۹، ط:بیروت) بخاری شریف ''**باب ما يكره من التبتل و الخصاء**'' میں ابن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس قسم کی روایات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوا کہ نسبندی اور اختصاء کے ذریعہ قوتِ تولید کو ختم کر دینا، تغییر خلق اللہ کے زمرہ میں آتا ہے، جو ناجائز و حرام ہے۔ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ قطعِ نسل کا یہ عمل باتفاق حرام ہے: **وهو محرم باتفاق** (عمدة القاري: ۲/۲۷) درمختار میں بھی ایسا ہی لکھا ہے: **أما خصاء الآدمي فحرام** بہرحال آدمی کا خصی کرنا تو وہ حرام ہے (الدر مع الرد: ۹/۵۵۷) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ایسی صورت اختیار کرنا، جس سے جنسی خواہش ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تولید کی قابلیت باقی نہ رہے مطلقاً ناجائز و حرام ہے، خواہ اس میں کتنے ہی فائدے نظر آئیں۔

ضبطِ ولادت کی دوسری شکل یہ ہے کہ صلاحیت تولید ختم نہ کی جائے باقی رہے؛ مگر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے؛ جس سے ولادت نہ ہو سکے، قرون اولیٰ میں اس کے لیے عزل کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا، مجموعۂ احادیث پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عزل کرنا مختلف اغراض کے تحت ہوتا تھا؛ مثلاً: باندی سے اولاد نہ ہونا کہ گھر کے کام کاج میں سہولت رہے، یا اس لیے تا کہ باندی ام ولد نہ بن جائے؛ کیوں کہ پھر اس کو فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، یا یہ کہ زمانۂ رضاعت میں حمل نہ ٹھہرے؛ تا کہ شیر خوار بچہ کی صحت متأثر نہ ہو، عزل سے صحابہ کرام کے پیش نظر کوئی غیر شرعی یا ناجائز مقصد نہیں ہوتا تھا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سختی کے ساتھ انھیں اس سے منع نہیں فرمایا، اگر ان کا مقصد کوئی ناجائز یا خلافِ شرع امر ہوتا یا عزل کرنا ناجائز ہوتا تو آپ اس سے سختی کے ساتھ منع فرما دیتے، عزل کے متعلق احادیث مسلم: ۱/ ۴۶۵، بخاری: ۲/۷۸۴ وغیرہ میں مذکور ہیں، ان روایات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ صحابہ کرام نے جہاں عزل کی اجازت طلب کی ہے یا عزل کیا ہے، وہ انھیں مذکورہ وجوہات کی بناء پر ہے، اس میں کہیں بھی رزق کی تنگی کے پیش نظر نہ اجازت طلب کی گئی ہے اور نہ آپ نے اس کی اجازت دی ہے؛ بلکہ بہ نظر انصاف اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے مذکورہ حالات میں بھی عزل کی ہمت افزائی کہیں نہیں فرمائی؛ بلکہ ناپسندیدگی یا اس کے فضول ہونے کا اشارہ فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ خلفائے اربعہ اور ابن عمر، ابن مسعود، ابوامامہ باہلی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس کی کراہت کے قائل تھے، اور فقہائے کرام نے عام حالات میں

اسے مکروہ اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اگر رزق و معاش کی تنگی کے پیش نظر ہو تو پھر اس کے عدم جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نکاح کا مقصد اصلی توالد وتناسل ہے، جسے قرآن نے استعارہ میں یوں ذکر کیا ہے: ﴿فأتوا حرثكم أنى شئتم﴾ اور حضور اکرم ﷺ نے اس کی توضیح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "تناكحوا تناسلوا" (إحياء علوم الدين :۲/۲۵، ط:لبنان)(۱)، نیز امام غزالیؒ نے حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے کہ میں صرف بچوں کے لیے شادی کرتا ہوں (حوالۂ سابق) دوسری طرف ضبطِ ولادت کے جو مہلک اثرات معاشرہ پر پڑتے ہیں، وہ انتہائی تباہ کن، مہلک اور خطرناک ہیں، زنا فحاشی کی کثرت، شرحِ طلاق میں اضافہ، خودغرضی اور ہوس رانی کا فروغ وغیرہ، یہ معاشرتی جراثیم ایک پاکیزہ معاشرہ اور پرامن ماحول کو گندہ اور پراگندہ کرتے ہیں، اس تناظر میں ضبطِ ولادت کے مکروہ اور ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں؛ البتہ عذر اور ضرورت کی حالت مستثنیٰ ہے؛ چنانچہ عذر کی حالت میں کبھی یہ کراہت رفع ہوسکتی ہے؛ چنانچہ ضبطِ ولادت کی پہلی شکل، جس میں نطفہ رحم میں پہنچنے سے روک دیا جائے اور عزل کی طرح کنڈوم کوپرٹی یا انجکشن، نرودھ وغیرہ کا استعمال کیا جائے اس کی اجازت، درج اعذار کی بنا پر ہوسکتی ہے:

عورت اتنی کمزور ہو کہ دوبارہ حمل کا تحمل نہیں کرسکتی یا پہلا بچہ ایامِ رضاعت میں ہو اور حمل ٹھہرنے کی وجہ سے اس بچے کے لیے ماں کا دودھ مضر ہو رہا ہو؛ جس کی بنا پر بچہ کے بدن ومزاج میں فطری ضعف اور کمزوری پیدا ہوسکتی ہو، یا بچہ کی پیدائش ماں کی جسمانی، دماغی صحت یا اس کی زندگی ہی کے لیے خطرناک ہوسکتی ہو اور اس قسم کا خطرہ واقعی یا ظنِ غالب کے درجہ میں ہو، یا مسلم ماہر طبیب(۲) اس کا مشورہ دے، ایسے وقت میں منعِ حمل کی کوئی تدبیر عارضی طور پر اختیار کرنے کی

(۱) تناكحوا تناسلوا فإني أباهي بكم الأمم يوم القيامة، جاء معناه عن جماعة من أصحابه، فأخرج أبوداؤد والنسائي والبيهقي وغيرهم من حديث معقل بن يسار مرفوعاً " تزوجوا الولود الودود فإني مكاثربكم الأمم" (المقاصد الحسنة،رقم: ۳۵۰، دارالكتاب العربي، بيروت).

(۲) خاف أي غلب على ظنه بتجربة سابقة أو إخبار طبيب مسلم حاذق (الدر مع الرد:۲/۵٦۵، كتاب الصّلاة، باب صلاة المريض).

گنجائش ہے، اس طرح کے عذرِ شرعی کے بغیر منعِ حمل کی تدبیر اختیار کرنا مکروہ ہے۔

استقرارِ حمل کے بعد اعضاء بننے سے پہلے اسقاط کرانا عام حالات میں شرعاً ناجائز ہے؛ البتہ چند ایسے قوی اعذار ہیں، جن سے صاحبِ عذر کو تخلیق اعضاء (جس کی مدت فقہاء نے ایک سو بیس دن مقرر کی ہے) سے قبل (ایک سو بیس دن کے اندر) اسقاطِ حمل کی اجازت ہو سکتی ہے، ایسے اعذار تین ہیں: (۱) ماہر تجربہ کار مسلم ڈاکٹر عورت کا معائنہ کر کے یہ بتادے کہ اگر یہ حمل باقی رہا تو عورت کی جان یا اس کے کسی عضو کے تلف ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ (۲) حمل کی وجہ سے عورت کا دودھ خشک ہوگیا ہو اور دوسرے ذرائع سے بچے کی پرورش کا انتظام ممکن نہ ہو۔ (۳) زنا سے حمل ٹھہر گیا ہو، ان تینوں اعذار میں سے کسی عذر کے وقت چار ماہ سے قبل ساقط کرانے کی گنجائش ہے، چار ماہ پورے ہوجانے کے بعد مذکورہ اعذار کی بنیاد پر بھی حمل ساقط کرانے کی اجازت ہرگز نہ ہوگی؛ کیوں کہ اس مدت میں بچہ کے اعضاء بننا شروع ہوجاتے ہیں، اور اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ نفسِ محترم کے حکم میں ہوجاتا ہے؛ جس کی بقاء وحفاظت کرنا، مثل زندہ آدمی کے واجب اور ضروری ہے، دلائل درج ذیل ہیں:

قال ابن وهبان: فإباحة الإسقاط محمولة على حالة العذر أو انها لا تأثم إثم القتل (شامي: ۴/۳۳۶، كتاب النكاح)، **ومن الأعذار أن ينقطع لبنها بعد ظهور الحمل، وليس لأبي الصبي ما يستأجر به الظئر ويخاف هلاكه (أيضاً) وفي الهندية: لم يجز إسقاطه أي الحبل من الزنا، قال محشيه: لم يجز إسقاطه أي بالمعالجة وهذا إذا استبان خلقه أما إذا كان غير مستبين الخلق فيجوز** (هداية: ۲/۳۱۱، كتاب النكاح، ط: اشرفی دیوبند)، **ويكره أن تسقي لإسقاط حملها وجاز لعذر حيث لا يتصور** (الدر مع الرد) **قوله وجاز لعذر أي يباح لها أن تعالج في استنزال الدم الحمل مضغة أو علقة ولم يخلق له عضو، وقدروا تلك المدة بمأة وعشرين يوماً.** (الدر مع الرد: ۹/۶۱۵، كتاب الحظر).

ضبطِ تولید، عزل یا اسقاط کے جائز ہونے کی صورتوں کا حکم اوپر لکھ دیا گیا، ضرورت اور عذر کے موافق انہیں حسبِ حال اختیار کرنے کی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ ضبطِ تولید کی بنیاد کوئی ناجائز امر نہ ہو اور نہ ہی بے جا شہوت رانی مقصود ہو، خصوصاً فقر وافلاس یا معاشی تنگی اس کا داعی نہ ہو؛ کیوں کہ معاش کو

رب العالمین نے خالص نظام ربوبیت کے تحت اپنی ذات سے وابستہ کر رکھا ہے اور کسی کی مداخلت کو اس میں جائز نہیں رکھا، عرب کے جاہل جو فقر وافلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کردیتے تھے، ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلاَ تَقْتُلُوآ اوْلاَدَكُمْ خَشْيَةَ امْلَاق﴾ (الإسراء: ۳۱) ترجمہ: اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کرو۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ تمہارا یہ فعل نظام ربوبیت میں مداخلت کے مترادف ہے، تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خود احکم الحاکمین نے لی ہے۔ ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الأَرْضِ إلاَّ عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (ہود: ٦)، ترجمہ: اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔ (عزل کی تمام قسمیں اور اُن کے احکامات حاشیہ میں تفصیل سے درج ہیں ملاحظہ فرمائیں)

از: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی ۱۴۳۱/۱۲/۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ،

فخر الاسلام عفی عنہ مفتیان دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

عزل کی قسمیں مع احکام (از تحفۃ الالمعی)

	طریقے	نیتیں	احکام
۱	قوت تولید ختم کرلینا	مسئلہ رزق کی وجہ سے	حرام اور ایمان کی کمزوری
۲	قوت تولید ختم کرلینا	خوش عیشی کے مقصد سے	حرام اور مقصد نکاح کی خلاف ورزی
۳	قوت تولید ختم کرلینا	عورت یا بچہ کی مصلحت سے	حرام مگر بحالت اضطرار عورت میں گنجائش
۴	لمبی مدت کے لیے تولید روک لینا	مسئلہ رزق کی وجہ سے	حرام اور ایمان کی کمزوری
۵	لمبی مدت کے لیے تولید روک لینا	خوش عیشی کے مقصد سے	مکروہ تحریمی اور مقصد نکاح کی خلاف ورزی
٦	لمبی مدت کے لیے تولید روک لینا	عورت یا بچہ کی مصلحت سے	برا مگر مجبوری میں گنجائش
۷	وقتی طور پر حمل روکنا	مسئلہ رزق کی وجہ سے	مکروہ اور ایمان کی کمزوری
۸	وقتی طور پر حمل روکنا	خوش عیشی کے مقصد سے	برا اور مقصد نکاح کی خلاف ورزی
۹	وقتی طور پر حمل روکنا	عورت یا بچہ کی مصلحت کی سے	گنجائش

اسقاطِ حمل کس شکل میں جائز ہے؟

محترم حضرات مفتیان کرام! .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال:﴿۸۸﴾کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

میں اور میری اہلیہ ڈاکٹر ہیں، ہمارے پاس اسقاط حمل کے لیے بعض عورتیں عذر کی وجہ سے اور بعض بغیر عذر کے آتی ہیں، کیا شریعت محمدیہ میں عذر وعدم عذر کی صورت میں حمل ساقط کرنے کی گنجائش ہے؟ اگر گنجائش ہے تو مدتِ متعینہ کے ساتھ یا غیر متعینہ کے ساتھ، نیز عذر کس درجہ اور کس نوعیت کا معتبر ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتی ڈاکٹر عبدالعظیم، ساکن احمد پور، ضلع لاتور، مہاراشٹر (۱۱۸۱/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

عام حالات میں بغیر عذر کے، یا فقر وافلاس کے خوف سے یا بیٹی ہونے کی وجہ سے حمل ساقط کرنا جائز نہیں؛ البتہ چند ایسے قوی اعذار ہیں، جن میں مجبوراً تخلیق اعضاء (ایک سو بیس دن) سے قبل ساقط کرنے کی اجازت ہے؛ مثلاً ماہر مسلم تجربہ کار ڈاکٹر عورت کا معائنہ کرکے یہ بتادے کہ اگر حمل باقی رہا تو عورت کی جان یا اس کے کسی عوض کے تلف ہونے کا شدید خطرہ ہے یا حمل کی وجہ سے دودھ خشک ہوگیا ہو اور دوسرے ذرائع سے بچے کی پرورش کا انتظام ممکن نہ ہو یا زنا سے حمل ہو، ان صورتوں میں چار ماہ سے قبل تک ساقط کرنے کی گنجائش ہے (۱)، چار ماہ کے بعد ان اعذار کی بنیاد پر بھی حمل ساقط کرنے کی ہرگز اجازت نہیں؛ کیوں کہ چار ماہ پورے ہونے پر بچے کے اعضاء بن جاتے ہیں، اس میں جان پڑجاتی ہے اور وہ نفس محترم کے حکم میں ہوجاتا ہے، جس کا باقی رکھنا اور اس

(۱) العلاج لإسقاط الولد إذا استبان خلقه كالشعر والظفر ونحوهما لايجوز، وإن كان غيرمستبين الخلق يجوز. (الفتاوى الهندية: ۵/۳۵۶).

وقالوا: يباح إسقاط الولد قبل أربعة أشهر. (الدرمع الرد: ۴/۳۳۶).

وفي الشامي: نعم يباح مالم يتخلق منه شيء (الدر مع الرد: ۴/۳۳۶)

کی حفاظت کرنا زندہ آدمی کی طرح لازم وضروری ہے، درمختار میں ہے:

يكره أن تسقى لإسقاط حملها وجاز لعذر حيث لايتصور. قوله وجاز لعذر أي يباح لها أن تعالج في استنزال الدم مادام الحمل مضغة أو علقة ولم يخلق له عضو، وقد روا تلك المدة بمأة وعشرين يومًا (الدر مع الرد: ۹/٦۱۵، كتاب الحظر والإباحة). فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/ ۷/ ۳۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

متفرقات

دارالعلوم دیوبند کے پروگراموں کو دیکھنے کا حکم

مخدومی و معظمی حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۸۹﴾ بعدہ خدمت اقدس میں عرض ہے کہ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس سلسلہ میں کہ ٹی وی مینجمنٹ نے یہ جو چینل کئی برس پہلے ایجاد کیا ہے ''دارالعلوم دیوبند اردو''۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ چینل اردو کا ہے اور اس پر صرف شریعتِ اسلامیہ کے موضوعات نشر ہوتے ہیں، دریافت طلب امر اس سلسلہ میں یہ ہے کہ کیا شریعت خالص محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اس چینل کو دیکھنے کی اجازت ہے، جب کہ اس پر قرآن پاک کی تلاوت بھی ہوتی ہے اور تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے اور نعتیں تقریریں وغیرہ بھی کی جاتی ہیں، اور اس چینل پر جمعیۃ علماء ہند کا جلسہ بھی نشر ہوتا ہے، عورتوں کی تصاویر بھی اس چینل پر آتی ہیں، آپ سے درخواست ہے کہ معقول جواب عنایت فرما دیجیے، احقر ایک کتاب لکھ رہا ہے، اس میں یہ مسئلہ شائع کرانے کا ارادہ ہے، دارالعلوم کے دارالافتاء کی مہر کے ساتھ۔ اس کے لیے آپ کی اجازت بھی چاہیے، امید کہ اجازت عنایت فرما کر ممنون فرماویں گے۔ فقط والسلام

نا کارہ عاصی محمد انور حسین حقی ہردوئی (۲۰۱/د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

ٹی وی بنیادی طور پر آلۂ لہو ولعب ہے، زیادہ تر اس کا استعمال ناچ، گانے، فحش فلمیں، عریاں تصویریں اور مختلف قسم کے کھیلوں میں ہوتا ہے، جن کا دیکھنا اور سننا حرام ہے(۱)۔ اور جو چیز اصالۃً لہو

---

(۱) وإن كان سماع غناء فهو حرام بإجماع العلماء (الدر مع الرد: ۹/۵۰۳، كتاب الحظر).

ولعب کے لیے ہو، اسے دین کی نشر واشاعت کے لیے استعمال کرنا درست نہیں، چاہے استعمال کرنے والا کوئی بھی ہو، اور پھر ﷺ چینل جس میں دینی پروگرام کے ساتھ مختلف قسم کے نغمے باجے ہوتے ہیں، موسیقی وسارنگی ہوتی ہے، غیر محرم عورتوں کی تصویریں اور آوازیں ہوتی ہیں اور کتنی ہی ایسی خرافات پائی جاتی ہیں، جن کی حرمت کتاب وسنت اور فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے، اسے دیکھنے اور سننے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟ قرآن پاک میں ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُواًاُوْلٰٓئكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ**۔ (لقمان:٦)

ترجمہ: ''اور بعضا آدمی ایسا ہے، جو ان باتوں کا خریدار بنتا ہے جو غافل کرنے والی ہیں؛ تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اس کی ہنسی اڑائے، ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے'' (بیان القرآن)۔

حدیث میں تصویر پر سخت وعید آئی ہے، صحیح حدیث میں ہے: **إن أشد الناس عذابا عند اللّٰه يوم القيامة المصورون** (۱)، اور بخاری: ۲/ ۸۸ میں ہے: **لاتدخل الملائكة بيتا فيه كلب و لا صورة** (۲)، علامہ شامی ڈھول یا بانسری وغیرہ کے بارے میں لکھتے ہیں: **استماع ضرب الدف والمزمار وغير ذلك حرام** (۳)۔ ڈھول اور گانے باجے وغیرہ کی آواز سننا حرام ہے۔

ان مفاسد کے علاوہ مذکورہ چینل پر پیش ہونے والے پروگراموں میں بہت سی چیزیں (تقریر، نعت، قوالی وغیرہ) ایسی ہوتی ہیں، جو بسا اوقات عقائد اہل سنت کے خلاف ہوتی ہیں، بعض سے تو شرک کی بو آتی ہے جن کا سننا اور دیکھنا ایمان کے لیے سخت خطرہ کی چیز ہے، اگر اسکرین پر عورتوں کی تصویریں نہ بھی آئیں تو بھی ان خرابیوں کی بنیاد پر اس چینل کے دیکھنے اور سننے کی اجازت نہیں ہوسکتی (۴) مزید برآں ان چینلوں کی وجہ سے لوگ حصول علم کے جو مبارک متوارث طریقے

---

(۱) بخاري: كتاب اللباس باب عذاب المصورين يوم القيامة، رقم: ۵۹۵۰

(۲) بخاري: كتاب اللباس باب التصاوير، رقم: ۵۹۴۹

(۳) الدر مع الرد: ۹/ ۵۶۶، كتاب الحظر والإباحة.

(۴) ماكان سببا لمحظور فهو محظور (الدر مع الرد: ۹/ ۵۰۴، كتاب الحظر والإباحة).

ہیں؛ مثلاً صحیح عقیدہ کی کتابیں پڑھنا، علماء کرام کے مواعظ وتقاریر سے استفادہ، بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب ہونا وغیرہ ان سے دور ہٹ رہے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ خرابیوں کی بنیاد پر اس چینل کو دیکھنا اور سننا ناجائز ہے، دین حاصل کرنے کے بہت سے صحیح ذرائع موجود ہیں، انہیں اپنانا چاہیے، اور ایسی چیزوں کے دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہیے، جن میں ہدایت کے بجائے گمراہی کا خطرہ ہو۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/۲/۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: محمود حسن بلندشہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

فطرت انسانی کی حقیقت اور آلہ ءلہو ولعب کے ذریعہ تکان دور کرنا کیسا ہے؟

محترم السلام علیکم! بہت دن سے ایک سوال ذہن کو پریشان کیے ہوئے ہے، کئی علماء سے اس کا جواب طلب کیا؛ لیکن اب تک کوئی بھی تشفی بخش جواب نہ دے سکا، اب آپ سے درخواست ہے کہ سوال کو بغور پڑھ کے مفصل جواب عنایت کریں؛ تاکہ آج کل کے ماڈرن نوجوانوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کر کے انھیں دین کی طرف پورا داخل ہونے کی دعوت دی جاسکے۔

سوال: ﴿۹۰﴾ کالج میں ہمارے کچھ دوست ایسے ہیں کہ جب ان سے میں کہتا ہوں کہ سینما، رقص وسرود، موسیقی، ورائٹی شو، ڈرامے وغیرہ میں حاضری دینا اسلامی روح کے خلاف ہے؛ کیوں کہ یہ ساری چیزیں ہمیں کاہلی، تن آسانی اور عیاشی کی طرف مائل کرتی ہیں اور اس طرح ہمیں اپنے فرائض منصبی سے غافل کرتی ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ پھر تو اسلام بڑا ہی خشک مذہب ہے اور اس میں تفریح کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، ہر طرف بوریت ہے، دل بہلانے کے لیے سب چیزیں اس میں ناجائز ہیں، ان کا سب سے مضبوط استدلال یہ ہے کہ موسیقی کی طرف تو ہر انسان کا فطری رجحان ہے اور ہر روح وجد میں آجاتی ہے، پھر اسلام جو فطری دین ہونے کا دعویدار ہے، ہمیں اس سے محظوظ ہونے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟

پھر وہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں مشینی دور کی وجہ سے ہر آدمی از حد مصروف ہے اور دن بھر

کام کرنے کے بعد ہر آدمی کا دل تفریح کو چاہتا ہے اور یہ ریڈیو پر موسیقی، سینما اور کلبوں کی تفریح ایک آدمی کے لیے بہت حد تک بوریت کو ختم کرنے کا سامان مہیا کر دیتی ہے، ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے از راہِ کرم مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات ارشاد فرمایئے۔

(۱) کیا اسلام میں اس قسم کی تفریح کا کوئی تصور ہے؟

(۲) اگر نہیں تو اسلام اس کا کیا متبادل پیش کرتا ہے؟

(۳) اگر کوئی متبادل بھی نہیں تو اسلام کی طرف سے اس عام بیزاری کو دور کرنے کے کیا طریقے ہیں؟

محترم جواب مفصل دیجیے گا، تاکہ دس پندرہ صفحہ کا ایک کتابچہ شائع کر کے لوگوں کی اصلاح کا کام کیا جا سکے، یہی جواب لینے کی نیت بھی ہے۔

کئی علماء کرام سے اس سوال کا جواب مانگا؛ لیکن بس کچھ نہیں کہہ سکتا، کیا کیا کہا ہے؟ اگر میں سچ کہہ دوں تو غیبت ہو جائے گی، لگتا ہے دولت کے نشے میں مخمور آج کل کے چند علماء لوگوں کی اصلاح کرنا ہی نہیں چاہتے، خیر آپ سے گذارش ہے کہ جلد از جلد اس کا جواب مجھے ان پیج میں ٹائپ کرا کے ای میل کر دیجیے، مہربانی ہوگی۔

خاکسار: عبدالرحمٰن سیف عثمانی ابن عثمانی بن عمر فاروق عاصم عثمانی بن مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی بن خاقانی ہند حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی یکے از بانیان دارالعلوم دیوبند (۸۰۵/ د ۱۴۳۱ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اسلام دینِ فطرت ہے؛ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: **فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ** (سورۃ الروم: ۳۰) ترجمہ: (تم ادیان باطلہ سے) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین (حق) کی طرف رکھو (اور سب) اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو، جس (قابلیت) پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہیے پس سیدھا (راستہ) دین (کا) یہی ہے (بیان القرآن)، یعنی جس فطرت پر اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق فرمائی ہے، اس میں تبدیلی نہیں، وہی صحیح دین ہے اور یہ دین فطرت اسلام ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایمان اور اخلاق فاضلہ اختیار کرنے کی صلاحیت فطری طور پر ودیعت فرمائی ہے، کفر و شرک

اور معاصی ومنکرات سے پرہیز کرنے کا داعیہ وجذبہ اس کے اندر رکھا ہے، (یہی دین فطرت ہونے کا مطلب ہے) لیکن خارجی عوامل اور شیطانی اغوا کاری کے نتیجے میں انسان کبھی راہِ راست سے بہک جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ فطری اچھائیوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے برائیوں میں ملوث ہوتا ہے، جو نفس وشیطان کے بہکانے کا نتیجہ اور خراب ماحول کا اثر ہوتا ہے، جس سے اس کی طبیعت اور مزاج بھی بدل جاتا ہے، اور غلطی سے کبھی اسے عین فطرت سمجھنے لگتا ہے، جب کہ یہ حقیقۃً اس کی اپنی نفسانی طبیعت اور شیطانی خواہش کا اثر ہوتا ہے؛ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: میں نے سارے بندوں کو صحیح راستہ کا اختیار کرنے والا پیدا کیا مگر شیطان نے انہیں بہکایا (مرقاۃ)(۱) اور دوسری حدیث میں ہے: **ما من مولود إلا یولد علی الفطرۃ فأبواہ یھودانہ أو ینصرانہ أو یمجسانہ ،الحدیث** (۲)، ہر انسان فطرت سلیم پر پیدا کیا جاتا ہے، یعنی معرفت الٰہی حاصل کرنے اور حق کے قبول کرنے کی صلاحیت کے ساتھ غلط باتوں سے دور رہنے کی استعداد اس میں پیدائشی طور پر موجود رہتی ہے؛ مگر اس کے والدین غلط تعلیم وتربیت کے ذریعہ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، چنانچہ اگر انسان پر خارجی عوامل اور ماحول کی برائیوں کا اثر نہ ہو تو اس کی طبیعت عین فطرت سلیمہ کے مطابق باقی رہے، جس کے نتیجے میں وہ اچھی باتوں کو اچھا سمجھے، بری باتوں کو برا جانے اور اس میں حق بات کے قبول کرنے کی صلاحیت اور اچھی بری باتوں میں تمیز کرنے کی استعداد پوری طرح برقرار رہے (۳)، مگر کبھی گھر کی بری تربیت اور ماحول کے خراب اثرات سے برائیاں آدمی میں پیدا ہوکر اس کی طبیعت میں شامل ہوجاتی ہیں، پھر مزاج وطبیعت کے فاسد ہوجانے کی وجہ سے غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر پاتا حتی کہ تمیز کی صلاحیت اس سے سلب ہوجاتی ہے

---

(۱) وفي معنى هذا الحديث: خلقت عبادي حنفاء كلهم وأنهم أتتهم الشياطين فأضلَّتهُم عن دينهم (مرقاة المفاتيح: ۱/ ۳۴۷، كتاب الإيمان، باب الإيمان بالقدر، رقم الحديث: ۹۰، ط:دارالفكر بيروت).

(۲)البخاری: رقم: ۱۳۵۸.

(۳) والمعنى :ما أحد يولد إلا على هذا الأمر الذي هو تمكن الناس من الهدي في أصل الجبلة التهيّو ء لقبول الدين، فلو ترك على تمكنه وتهيّوه المذكورين لاستمرّ على الهدي والدين (مرقاة المفاتيح:۱/۱۶۳، ناشر :دار الفكر، كتاب الإيمان، باب الإيمان بالقدر).

اور وہ طریق فطرت سے دور پڑ جاتا ہے۔

دین اسلام جو فطرت کے عین مطابق ہے، وہ روح کو پاکیزہ رکھنے اور قلب ونظر کی طہارت کا طریقہ فطرت کے مطابق بتلاتا ہے، چنانچہ وہ جس طرح کفر وشرک، معاصی اور منکرات سے پرہیز کرنے کی ہدایت دیتا ہے، اسی طرح بد نگاہی کرنے، شہوت انگیز مناظر کے دیکھنے اور شہوت آمیز آوازوں اور نغموں کو سننے، گانے باجے، رقص وسرور کی محفل میں شرکت کرنے سے منع کرتا ہے؛ کیوں کہ ان باتوں سے روح میں قساوت اور قلب ونظر میں گندگی پیدا ہوتی ہے، جو فطرتِ انسانی جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا کے خلاف ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

حدیث میں ہے کہ: **إنّ اللّٰہ بعثني رحمةً للعالمین وهدیً للعالمین وأمرني ربي ۔عزوجل۔ بمحق المعازف والمزامیر** (مسند احمد، رقم:۲۱۸۰۳)، اللہ تعالیٰ نے مجھے لہولعب اور گانے باجے کے آلات کو ختم کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِيْنٌ.** (لقمان:۶)، بعضا آدمی ایسا بھی ہے، جو ان باتوں کا خریدار بنتا ہے، یعنی ایسی باتیں اختیار کرتا ہے جو اللہ تعالی سے غافل کرنے والی ہیں، تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کو بھی اللہ تعالیٰ کی راہ سے یعنی دین حق سے بے سمجھے گمراہ کرے اور اسی گمراہ کرنے کے ساتھ اس راہ حق کی ہنسی اڑاوے، ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں ذلت کا عذاب ہونے والا ہے، **لهو الحدیث** سے مراد گانے والی عورت ہے؛ جیسا کہ درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے (۱)، لہو کے معنی ہر ایسا کام جو انسان کو غفلت میں ڈال دے یا جو چیز وقت گذاری اور دل بہلانے کا سامان ہو جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، لہوالحدیث کی تفسیر ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ اور جابرؓ کی ایک روایت میں گانے بجانے سے کی گئی ہے، **رواه الحاكم**

(۱) **أنزلت ''ومن الناس من یشتری لهو الحدیث'' في النضر بن الحارث، اشتری قینة فکان لا یسمع أحدا یرید الإسلام إلا انطلق به إلی قینته، فیقول: أطعمیه واسقیه وغنیه، هذا خیر مما یدعوك إلیه محمد من الصّلاة والقیام الخ (الدر المنثور: ۵۰۴/۱، ناشر: دار الفکر بیروت).**

و صححه (۱)، جمہور صحابہ وتابعین اور عام مفسرین کے نزدیک لہوالحدیث عام ہے ان چیزوں کے لیے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈال دے، اس میں غناء ومزامیر بھی داخل ہے، بخاری (۲) اور بیہقی نے یہی تفسیر اختیار کی ہے، اس میں فرمایا ہے: لهو الحديث هو الغناء وأشباهه، یعنی لہوالحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں، کیوں کہ یہ چیزیں اگر گمراہ ہونے یا دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنیں تو وہ کفر ہے؛ جیسا کہ مذکورہ آیت میں اس کا کفر وضلال ہونا بتایا گیا ہے اور اس کی سزا "عذاب مهين" قرار دی گئی ہے اور اگر اسلامی عقاید سے گمراہ نہیں کرتیں؛ مگر ان کو کسی حرام اور معصیت میں مبتلا کرتی ہیں، وہ کفر تو نہیں مگر حرام اور سخت گناہ ہے ،شامی میں ہے: قال ابن مسعود: صوت اللهو والغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء النبات (۳)، ورواه في السنن مرفوعاً إلى النبى صلّى اللّٰه عليه وسلّم بلفظه: إن الغناء ينبت النفاق في القلب. غنا قلب میں نفاق پیدا کرتا ہے۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے: استماع صوت الملاهي كضرب قصب، ونحوه حرام لقوله عليه الصلاة السلام: استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر أي بالنعمة (یعنی گانے بجانے کی آواز سننا؛ جیسے: بانسری وغیرہ کا سُر حرام ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گانا سننا گناہ ہے اور اس کے پاس بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت حاصل کرنا نعمت کی ناشکری ہے) (۴).

مذہب اسلام فطرت کے عین مطابق انسان کی تربیت کرتا ہے، اس لیے ایسے امور سے جو روح انسانی کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں، بچنے کی ہدایت کرتا ہے اور اعمال صالح، اخلاقِ فاضلہ اور اذکار وعبادات کے ان طریقوں کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، جو فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں اسی طرح حلال ذرائع آمدنی کے اختیار کرنے اور حرام سے اجتناب کرنے کی ہدایت دیتا ہے؛ تاکہ

(۱) عن ابن مسعود رضي اللّٰه عنه قال: ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل اللّٰه، قال: هوــ واللّٰه ــ الغناء (المستدرك للحاكم: باب تفسير سورة لقمان، رقم: ۳۵۴۲).

(۲) الصحيح للبخاري: باب كل لهو باطل إذا شغله عن طاعة اللّٰه، رقم:۵۸۲۶.

(۳) الدر مع الرد:۹/۵۰۲، كتاب الحظر والإباحة.

(۴) الدر مع ا لرد:۹/۵۰۴، كتاب الخطر والإباحة.

انسانی روح بیماریوں سے محفوظ رہے اور انسان روحانی اعتبار سے صحت مند رہے؛ اسی لیے شراب، جوا، گانا، باجا، موسیقی، سینما وغیرہ امور کو ناجائز وحرام قرار دیا؛ کیوں کہ یہ چیزیں انسان کی روحانیت کے لیے تباہ کن ہیں، اور ذکر الٰہی اور تسبیح نیز اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کے مصنوعات میں غور فکر کو عبادت قرار دیا، کیوں کہ ان چیزوں سے روح کو سکون، قلب کو طمانینت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو ذریعہ طمانینت قلب بتلایا: اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (سنو! اللہ ہی کی یاد سے دل چین پاتے ہیں)(سورۃ الرعد: ۲۸)، اور مصنوعات عالم میں اس کی صناعی کو سوچنے اور انقلاب لیل ونہار میں اس کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرنے کو عقلمندی کی نشانی بتلایا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَآیَاتٍ لِّاُوْلِی الْاَلْبَابِ. الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (بلا شبہ زمین وآسمان کی تخلیق اور شب وروز کی گردش میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں جو لوگ اللہ کو کھڑے بیٹھے اور پہلو کے بل (لیٹ کر یعنی ہر حال میں) یاد کرتے رہتے ہیں اور زمین وآسمان کی خلقت میں غور فکر کرتے رہتے ہیں اور (کہتے ہیں) اے ہمارے رب! آپ نے اسے بیکار نہیں پیدا کیا، آپ کی ذات پاک ہے پس ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لیجیے)(آل عمران: ۱۹۰-۱۹۱)

حاصل یہ کہ فطرت الٰہی جن پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، یہ انسان کی اپنی خود ساختہ طبیعت وعقل کا نام نہیں؛ بلکہ فاطر کائنات نے انسان کی تخلیق جن صفات پر فرمائی اور جن باتوں کی نبیوں نے تعلیم دی، وہ انسانی فطرت کے مطابق ہیں، ورنہ ہر انسان کی طبیعت مختلف ہوتی ہے، ایک شخص کسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے، اسی میں اسے مزا آتا ہے، جب کہ دوسرے شخص کی طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے؛ لہٰذا فطرت جس پر انسان کی تخلیق ہوئی وہ انسان کی خود ساختہ طبیعت وعقل کا نام نہیں؛ بلکہ حضرات انبیاء کرام کی تعلیمات اس کا مصداق ہیں اور دین اسلام اس کا مظہر اتم اور مصداق کامل ہے؛ پس جن بری باتوں سے اسلام نے منع کیا، جیسے گانا، موسیقی، سنیما، جُوا، شراب، یہ عین فطرت الٰہی کے مطابق لائق اجتناب ہیں، کیوں کہ ان کی ممانعت دین فطرت کے تقاضہ کے مطابق ہے، اس کے باوجود جس شخص کو دین فطرت میں منع کی ہوئی چیزوں کے کرنے میں لطف ومزا آتا ہے، تو اس کا

مطلب یہ ہوگا کہ اس کی طبیعت فطرت الٰہی کے خلاف، معصیت کے اثر سے زہر آلود ہو چکی ہے؛ اس لیے کڑوی چیز میں اسے کڑواہٹ محسوس نہیں ہوتی؛ جیسے کہ سانپ کے کاٹے شخص کو نیم کی پتی کڑوی معلوم نہیں ہوتی، یا تپ زدہ کو میٹھی چیز کی مٹھاس محسوس نہیں ہوتی۔

جہاں تک تکان اور بوریت ختم کرنے کی بات ہے تو اولاً یہ انسان کے اپنی عادت بنانے پر مبنی ہے، کسی آدمی کی تکان مطالعۂ کتب سے ختم ہوتی ہے، کسی کی مسجد میں بیٹھ کر ذکر اللہ کرنے سے، کسی کی بوریت کھلی فضا میں تفریح کرنے سے ختم ہو جاتی ہے، اور جس نے غلط بات کی عادت ڈال لی، وہ اس کا محتاج بنا رہے گا، اس لیے تکان دور کرنے کے واسطے ناجائز اور حرام چیزیں اختیار کرنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ مباح ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں مثلاً: مذکورہ چیزیں نیز ٹیپ ریکارڈ یا ویڈیو پر قرآن کی تلاوت اس کے معانی اور تفسیر، اچھے بامعنی اشعار اور نعتیہ کلام سننا، مجاہدین اسلام اور اولیاء اللہ کے حیرت انگیز واقعات کا پڑھنا سننا وغیرہ اپنایا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۵/۳۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

اشیاء خوردنی وغیرہ میں خنزیر کی چربی کی آمیزش سے متعلق شبہات کا تفصیلی حکم

حضرت مفتی صاحب! .... دامت برکاتہم سلام مسنون

سوال: ﴿۹۱﴾ بعد سلام مسنون کے گذارش ہے کہ آپ کی خدمت میں یہ پرچہ (۱) بھیج رہا ہوں

(۱) خنزیر کی چربی کے نام کے بجائے
اس کے کوڈس پیکٹوں میں کیوں شائع کیے جاتے ہیں

مضمون نگار: ڈاکٹر ایم امجد خان

میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، امریکہ

تقریباً تمام مغربی ممالک اور یورپ کا پسندیدہ گوشت خنزیر ہے، ان ممالک میں اس جانور کی افزائش کے لیے بہت سے فارمز (پالن گھر) ہیں، فرانسلون [illegible] فارم کی تعداد ۱۲۰۰۰ر ہیں، تمام جانوروں [illegible]

جس میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ کھانے کی چیزوں میں سور کی چربی کا استعمال ہوتا ہے، ہمیں یہ پرچہ

دارالعلوم میں سے خنزیر میں سب سے زیادہ چربی پائی جاتی ہے، لیکن یورپی اورامریکی اس سے اجتناب کرتے ہیں؛ لیکن خنزیر کی چربی کہاں جاتی ہے؟ محکمہ غذائیات کی نگرانی میں خنزیروں کو ذبح کیا جاتا ہے، اب اس محکمہ کی سر دردی ہے کہ وہ اس کی چربی کو کھپائے؟

ساٹھ سال سے قبل اس کی چربی جلادی جاتی تھی، پھر وہ اس کا استعمال کرنے لگے اور سب سے پہلے انہوں نے صابون بنانے میں اس کا تجربہ کیا جو کارگر ثابت ہوا، پھر اس کے لیے مکمل طور پر ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا اور اس کی چربی کیمیکل سے اس کی ماہیت بدل دی گئی، اس کی پیکنگ کی گئی اور پھر مارکیٹ میں لائی گئی، یورپی ممالک نے یہ ضابطہ بنایا کہ ہر غذائی سامان، دوائی اور حفظانِ صحت سے متعلق اشیاء میں فہرست میں درج اجزائے ترکیبی ضرور شامل کیے جائیں، جو یورپ میں گذشتہ چالیس سال سے رہ رہے ہیں، انہیں یہ بات معلوم ہے؛ لیکن اس وقت اسلامی ممالک کی طرف سے ان مصنوعات پر پابندی عائد کردی گئی تھی، جس کے نتیجہ میں تجارت کو نقصان پہنچا۔

ماضی میں چلتے ہوئے اگر آپ کسی طرح شمالی مشرقی ایشاء سے جڑے ہوئے ہیں، تو آپ کو ۱۸۵۷ء کی خانہ جنگی کی اشتعال انگیز فیکٹریوں کے بارے میں جان کاری ہوگی، اس زمانے میں یورپ میں رائفل بولیٹس (گولی) بنائے گئے اور سمندر کے ذریعہ انہیں برصغیر میں بھیجے گئے تھے، اس کے پہنچنے میں مہینوں لگ گئے، جو سمندری آب وہوا کی وجہ سے گن پاؤڈر تباہ ہوگئے تھے، پھر ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ بلیٹس (گولیوں) کو چربی سے لپیٹ دی جائیں، جو خنزیر کی چربی کی تہ ہوتی تھی، گولیوں کو استعمال کرنے سے پہلے چربی کی اس تہ کو دانت سے چھیلنا پڑتا تھا، جب یہ بات مشہور ہوئی تو فوجوں میں زیادہ تر مسلم فوجوں اور سبزی خور فوجوں نے لڑنے سے انکار کردیا، جس سے آخرکار ۱۸۶۷ء (غالباً ۱۸۵۷ء مراد ہے زین) میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔

اہلِ یورپ جب حقائق سے واقف ہوئے تو انہوں نے خنزیر کی چربی لکھنے کے بجائے صرف جانوروں کی چربی لکھنے لگے، یورپ میں ۱۹۷۰ء سے رہ رہے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے، جب اسلامی ممالک کے ذمہ داروں نے کمپنیوں سے پوچھا کہ یہ کس جانور کی چربی ہے؟ تو ان کو بتایا گیا کہ یہ گائے و بھیڑ کی چربی ہے، پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر یہ گائے اور بھیڑ کی چربی ہے تو یہ اب بھی حرام ہے؛ چونکہ اسلامی قانون کے مطابق ان جانوروں کو ذبح نہیں کیا جاتا تھا، اس طرح پھر اس پر پابندی عائد کردی گئی، ان بین الاقوامی کمپنیوں کو دوبارہ اپنی آمدنی میں سے جو عالم اسلام سے سامان فروخت کرکے حاصل ہوتی تھی، ۷۰٪ خسارہ اٹھانا پڑا، جب کہ ان کمپنیوں کو عالم اسلام میں مال برآمدات کرنے میں بلین ڈالرز (کروڑوں) کا منافع ہوتا تھا۔

آخرکار انہوں نے کوڈ کی زبان استعمال کرنے کا فیصلہ کیا؛ تاکہ صرف ان کے محکمہ غذائیات کی انتظامیہ کو معلوم ہو کہ وہ کیا استعمال کررہے ہیں اور عام آدمی فریب میں رہے، اس طرح سے انہوں نے ''ای کوڈس'' شروع کیا، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اکثر پیداوار میں یہ سب اجزاء شامل ہوتے ہیں، جس میں توتھ پیسٹ دارالعلوم

کسی معتبر ساتھی سے ملا ہے، پتہ کرنے پر پتہ چلا کہ یہ پرچہ کسی میگزین کا ہے، جو کہ ممبئی کے ایک ادارے ''مرکز المعارف'' سے نکلتی ہے۔

آپ حضرات سے بہت بہت عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ یہ بتائیں کہ یہ میگزین اور یہ ادارہ معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر ہے تو اس کی تبلیغ کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ کیوں کہ ان چیزوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو روزمرہ کے استعمال کی ہیں۔

آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ خادم سعید الرحمٰن (۱۳۶/ د ۱۴۳۰ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

خنزیر اپنے تمام اجزاء کے ساتھ نجس العین ہے، اس کے کسی جز کو بھی خارجاً یا داخلًا استعمال کرنا حرام ہے، چربی کا حکم بھی یہی ہے (۱).

جہاں تک ''ای کوڈ'' سے متعلق مضمون کا تعلق ہے، کسی مضمون کا میگزین میں شائع ہوجانا، فقہی نقطہ نظر سے صحت کو مستلزم نہیں ہے، جب کہ بعض رسالوں میں لکھا بھی ہوتا ہے کہ ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے؛ لہٰذا مرکز المعارف ادارہ قابلِ اعتبار ہے یا نہیں؟ سے

شیونگ کریم، چیونگ گم، چوکلیٹ مٹھائیاں، بسکٹ، کورن فلیکس، ٹوفی، کنڈ فوڈ اور فروٹ ٹن بھی شامل ہیں، کچھ ادویات مثلاً ملٹی ویٹامن میں بھی یہ اجزاء ہوتے ہیں، یہ سب سامان اسلامی ممالک میں اندھا دھند استعمال ہوتے ہیں، ہماری سوسائٹی کو بہت سے مسائل جیسے ڈھیٹ، گستاخی اور جسمانی تعلقات وغیرہ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے؛ اس لیے تمام مسلمانوں اور خنزیر کا گوشت نہ کھانے والے حضرات سے درخواست ہے کہ آپ روزمرہ استعمال ہونے والے سامانوں میں ان اجزاء کی تفتیش کریں اور ان کو درج ذیل ''ای کوڈ'' سے ملائیں اگر فہرست میں درج شدہ اجزاء میں سے کوئی جز پایا جائے تو اس سے اجتناب کریں۔

E 100, E 110, E 120, E 140, E 141, E 153, E 210, E 213, E 214, E 216, E 234, E 252, E 270, E 280, E 325, E 326, E 327, E 334, E 335, E 336, E 337, E 422, E 430, E 431, E 432, E 433, E 434, E 435, E 436, E 440, E 470, E 471, E 472, E 473, E 474, E 475, E 476, E 477, E 478, E 481, E 482, E 483, E 491, E 492, E 493, E 494, E 495, E 542, E 570, E 572, E 631, E 635, E 904.

ترجمہ: صلاح الدین قاسمی: شعبۂ ردعیسائیت دارالعلوم دیوبند

(۱) وأما الخنزير فشعره وعظمه وجميع أجزاءه نجسة. (البحر الرائق: ۱/۱۹۱، كتاب الطهارة، ط: رشيديه پاكستان).

آپ کس درجہ کا اعتبار معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ رہا ''ای کوڈ'' کی چیزوں کے استعمال کا معاملہ تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب تک کسی چیز میں حرام چیز کا شامل ہونا یقینی ذریعہ سے معلوم نہ ہو، اس چیز کی حرمت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا (۱) مضمون نگار ڈاکٹر صاحب سے ہم واقف نہیں ہیں، نیز ''ای کوڈ'' خنزیر کی چربی ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا کوئی یقینی ثبوت مضمون میں پیش نہیں کیا گیا ہے؛ اس لیے محض شک شبہ کی بناء پر یا بالفاظ دیگر غیر یقینی ثبوت کے بغیر کسی چیز کی حرمت کا حکم نہیں کیا جا سکتا، جو شخص مضمون نگار سے واقف ہے اور ان کی تحقیق پر اسے یقین کامل ہے اس پر عمل کرنا واجب ہے، مزید یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے تبدیل ماہیت کی بات بھی لکھی ہے، تو تبدیل ماہیت کس نوعیت کی ہے؟ اس کی وضاحت ضروری تھی۔

حاصل یہ کہ مذکورہ مضمون پر نہ ہر شخص کے لیے عمل واجب ہے اور نہ ہی کامل تحقیق سے قبل اس کی تبلیغ واجب ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو صحیح بنیاد پر شبہ پیدا ہوگیا اور وہ اپنے عمل کے لیے احتیاط کا پہلو اختیار کرے اس میں حرج نہیں بلکہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/ ۷/ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ، وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مدارس میں رائج مختلف سزاؤں

(مالی جرمانہ، مرغا بنانا، کھڑا کرنا، امداد بند کرنا وغیرہ) کا حکم

سوال: «۹۲» مدارسِ اسلامیہ میں مروجہ سزاؤں سے متعلق شرعی حکم دریافت کرنا ہے، امید ہے کہ مدلل جواب مرحمت فرمائیں گے؛ تا کہ ہمارے مدارس میں رائج، جو غیر شرعی طریقے ہوں اسے ترک کیا جا سکے۔

(۱) تعطیلات کے بعد طلبہ جب دیر سے گھر سے آتے ہیں تو ان کے سر پرستوں سے اس دیر حاضری پر یومیہ سو روپیہ کے حساب سے غیر حاضری کے تمام ایام کی رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اس رقم کی رسید عطیہ کی مد میں مدرسہ میں لکھ دی جاتی ہے، اور سر پرستوں کو وہ رسید دے دی جاتی ہے، کبھی

(۱) الأصل في الأشياء الإباحة (قواعد الفقة :۵۹، ط:دار الكتاب ديوبند).

کبھی پوری رقم نہیں وصول کی جاتی؛ مثلاً پانچ دن غیر حاضری کے پانچ سو ہوتے ہیں اور طالبِ علم یا سرپرست کے پاس صرف ایک سو پچاس روپیہ ہے تو پانچ سو روپیہ میں ایک سو پچاس روپیہ وصول اور تین سو پچاس روپیہ غیر وصول لکھ کر رسید دے دیتے ہیں، کبھی کبھی حضرت مہتمم صاحب تمام رقوم معاف بھی کر دیتے ہیں، دیر حاضری کی سزا کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ طالبِ علم کو چند روز تک دفتری کارروائی میں مشغول کر دیا جاتا ہے، اور قصداً اس کارروائی میں تاخیر کی جاتی ہے؛ مثلاً طالبِ علم اتوار کو مدرسہ حاضر ہوا تو دفتری کارروائی پیر یا منگل کی شام تک انجام پاتی ہے، اس کے بعد ہی مطبخ سے اس کا کھانا جاری کیا جاتا ہے، تب تک طلبہ باہر ہوٹلوں میں کھاتے رہتے ہیں، اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ طالبِ علم کو کچھ چیزیں مدرسہ سے؛ مثلاً چادر، کپڑا، کتابیں ایسے ہی وظیفہ دیا جانا طے رہتا ہے، یہ چیزیں طالبِ علم کی ملک ہو چکی ہوتی ہے، بچوں کو مالک اس لیے بنایا جاتا ہے کہ بہت سی چیزیں زکوٰۃ کی رقم سے خریدی جاتی ہیں، اور وظائف وغیرہ کی رقم بھی زکوٰۃ کی ہی ہوتی ہے، دیر سے آنے کی صورت میں یہ تمام چیزیں واپس لے لی جاتی ہے، اور اسے مکلّف بنا دیا جاتا ہے کہ آئندہ تعلیم جاری رکھنے کے لیے اپنی ذاتی رقم سے تمام ضروریات کا انتظام کرے، حضرت مہتمم صاحب کبھی کبھی ان چیزوں کو دفتر میں اماناً محفوظ کروا دیتے ہیں اور چند روز کے بعد طالبِ علم کو واپس کر دیتے ہیں؛ لیکن کبھی کبھی اخیر تک اسے وہ چیزیں واپس نہیں کی جاتیں؛ بلکہ دوسرے طالبِ علم کو تقسیم کر دی جاتی ہیں، اسی طرح سے دوسری غلطیوں کی سزا بھی دی جاتی ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) درجہ حفظ و ناظرہ میں جو طلبہ شریر ہوتے ہیں، ان کو مرغا بنا دیا جاتا ہے یا قرآن شریف لے کر کھڑا کر دیا جاتا ہے، یا استاذ صاحب کہتے ہیں کہ دو رکعت کی نیت باندھ کر ایک پارہ تلاوت کرو، سوال یہ ہے کہ سزا دینے کے لیے نماز میں کھڑا کر دینا یا مرغا بنا دینا یا کھڑے کھڑے قرآن لے کر پڑھنے کا مکلّف کرنا کیسا ہے؟ طلبہ کے نماز کی نگرانی کرنے والے استاذ نے تمام طلبہ کو تاکید کیا کہ نمازیں مکمل پڑھی جائیں، کسی وقت کی کوئی بھی نفل یا سنتیں چھوڑی نہ جائیں، اور جو ایسا نہیں کرے گا، اسے بیس رکعت نماز پڑھنی پڑے گی، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نماز کی چوری کرنے والے طلبہ سے کچھ رکعتیں پڑھوائی جاتی ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

(۳) مدرسہ میں ماہانہ، ششماہی و سالانہ تین طرح کے امتحانات ہوتے ہیں، سب کا نصاب اور

طریقہ مشورہ سے طے ہوتا ہے، نمبرات کے ذریعہ ہی اساتذہ اور طلبہ کی محنت ولیاقت کا اندازہ لگایا جاتا ہے، بعض اساتذہ اپنی حسنِ کارکردگی بڑھانے کے لیے یا اپنی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کے لیے طلبہ کو اشارہ کردیتے ہیں کہ فلاں فلاں صفحات یا مضامین کی تیاری کرلو، کبھی کبھی طلبہ نقل کرلیتے ہیں اور اساتذہ چشم پوشی سے کام لیتے ہیں، جب کہ ناظمِ امتحان کی طرف سے ان تمام باتوں کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے، ایسے امتحانات میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہونے والے طلبہ کو خصوصی انعام دیا جاتا ہے، اس اعلیٰ معیار اور اس کی مراعات حاصل کرنے کے لیے ایسی خیانت کرنا اور اس پر ملنے والی مراعات کا شرعی حکم کیا ہے؟

اگر ناظم مدرسہ اپنی بصیرت اور صوابدید سے اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات سے محروم کردے اور ان کے ساتھ اساتذہ کو بھی ترقی الاؤنس جاری نہ کرے اور بعض ادنیٰ آنے والے طلبہ کو اس طرح کی مراعات جاری کرے اور اس درجہ کے اساتذہ کی ترقی الاؤنس جاری کردے اور وہ یہ کہے کہ امتحان کے نمبرات ہی سو فیصد معیار نہیں ہیں، اسی لیے میں اپنی صوابدید پر فیصلہ کرتا ہوں، تو شرعی حکم کیا ہے؟ (۶۲/۷/د ۱۴۳۲ھ)

الجواب وباللہ التوفیق: حامداومصلیا ومسلما:

استاذ کی حیثیت ایک مربی اور مصلح کی ہے، وہ طالب علم کی علمی واخلاقی تربیت کے لیے تادیب کا کوئی مناسب طریقہ اپنا سکتا ہے(۱)؛ لیکن اس کے لیے کچھ شرطیں ہیں؛ مثلاً اس طرح کی تادیب شرعاً ممنوع نہ ہو، اس سے مقصود تربیت ہو، غصہ یا جذبۂ انتقام کی تسکین نہ ہو اور مدرسہ کے ضابطہ اور عرف کے لحاظ سے استاذ اس طرح کی تادیب کرنے کے مجاز بھی ہوں، نیز اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تادیب کا کوئی متعین طریقہ نہیں، جسے ہر طالب علم پر منطبق کیا جاسکے؛ بلکہ

---

(۱) وفي الشامي: (قوله وفي القنية الخ) وفيها عن الروضة ولو أمر غيره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر، قال: فهذا تنصيص على عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم؛ لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحة، والمعلم يضربه بحكم الملك بتمليك أبيه لمصلحة الولد(الدر مع الرد:۱۳۰/۶،باب التعزیر).

استاذ کی صواب دید اور طالبِ علم کے تحمل وطبیعت پر موقوف ہے(۱)، بہ طور تادیب کسی طالبِ علم کو ڈانٹنا ہی کافی ہوتا ہے، کسی کو مارنے کی ضرورت پڑتی ہے، کوئی بہت شریر ہوتا ہے تو اسے کھڑا کرنے، کھانا بند کرنے، بسا اوقات اس سے سخت کوئی طریقہ اپنانا پڑتا ہے، الغرض استاذ صاحب عرف ومدرسے کے ضابطے کے دائرے میں رہ کر کوئی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں، ان مذکورہ بالا امور کی روشنی میں استفتاء ہذا میں ذکر کردہ سوالات کا اجمالی حکم لکھا جاتا ہے:

(۱) غیر حاضری کرنے والے طلبہ سے مالی جرمانہ یا مدرسہ کے لیے جبری چندہ وصول کرنا شرعاً جائز نہیں(۲)؛ بلکہ دوسرا کوئی جائز طریقہ اپنانا چاہیے؛ مثلاً یہ ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ مقررہ تنبیہات کے باوجود اگر طالبِ علم غیر حاضری کرے تو اس کا اخراج کر دیا جائے گا، پھر اگر دوبارہ مخرج طالبِ علم داخلِ مدرسہ ہونا چاہے تو طالبِ علم کو مدرسے کے مکان سے انتفاع نیز معلمین سے تعلیم وغیرہ کی فیس کے طور پر کچھ رقم ادا کرنی پڑے گی، اور اس ضابطے کی خوب صراحت کر دی جائے؛ تاکہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو، شرعی طور پر یہ صورت جائز ہو جائے گی (مستفاد از امداد الفتاویٰ: ۵۶۳/۲)، طلبہ کا مملوکہ سامان زجراً وقتی طور پر لینے کی تو گنجائش ہے؛ لیکن ایک دم سے لیے لینا جائز نہیں؛ اس لیے کہ یہ صورت بھی مالی جرمانے میں داخل ہو جائے گی؛ بلکہ لی ہوئی چیزیں طالبِ علم کو لوٹانا ضروری ہے، **قال في الدر: لا بأخذ مال في المذهب (بحر)، وفيه عن البزازية وقيل يجوز ومعناه أن يمسكه مدة لينزجر ثم يعيده له**(۳) (الدر مع الرد، والبحر)، نیز طالبِ علم کو قصداً دفتری کارروائی میں الجھائے رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس سے طالبِ علم کا مزید وقت ضائع ہوتا ہے۔

(۲) مرغا بنانے کا زمانہ تقریباً ختم ہو گیا، اب طلبہ کی طبیعتیں اس کی متحمل نہیں ہوتیں، نیز اس کا

---

(۱) يجوز للمعلم أن يضربه بإذن أبيه؛ نحو ثلاث ضربات ضرباً وسطاً سليماً لا بخشبة؛ فلأن الضرب بها ورد في جناية صادرة عن المكلف ولا جناية عن الصغير. (الطحطاوي على الدر، كتاب الصلاة).

(۲) قال رسول الله ـــ صلى الله عليه وسلّم ـ ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امريء إلا بطيب نفس منه. (رواه البيهقي في شعب الإيمان، رقم: ۵۱۰۵، فصل في الترغيب في النكاح).

(۳) الدر مع الرد: ۱۰۶/۶، باب التعزير.

عرف بھی نہ رہا؛ اس لیے اس سے اور اس طرح کی دیگر سزاؤں سے بچنا لازم ہے؛ البتہ تادیب کے طور پر نماز چوری کرنے پر طالبِ علم سے نفل پڑھوانے کی گنجائش ہے، نیز قرآن ہاتھ میں لے کر کھڑا کر دینے یا مناسب کوئی طریقہ حسبِ ضابطۂ مدرسہ اپنایا جا سکتا ہے۔

(۳) امتحانات کے معاملہ میں ممتحن اساتذہ کی حیثیت امین کی ہے، اس میں کسی طرح خیانت قطعاً جائز نہیں اور آیتِ کریمہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾(۱) (ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم کرتا ہے کہ امانتیں صاحبِ امانت کے حوالے کرو) کے خلاف ہے؛ اس لیے اس سے بچنا لازم اور فرض ہے، جہاں تک اساتذہ یا طلبہ کو ملنے والی مراعات اور انعامات، اسی طرح مہتمم صاحب کے عمل سے متعلق شرعی حکم کی بات ہے تو اس کا جواب مکمل طور پر تبھی دیا جا سکتا ہے، جب مدرسے کا پورا ضابطہ اور مہتمم صاحب کے طریق کار کی توجیہ ان کے قلم سے ہمارے سامنے ہو، بظاہر ان کا طریقہ جو تحریر کیا گیا ہے، انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

از: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی ۱۴۳۲/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ، فخر الاسلام عفی عنہ

مفتیانِ دار الافتاء، دار العلوم دیوبند

سہولتِ ولادت کے لیے قرآنی آیت پر مشتمل تعویذ کا حاملہ کی ران پر باندھنا کیسا ہے؟

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: ﴿۹۳﴾ بعد آداب وتسلیم بصد تکریم گزارش ہے کہ جنوبی افریقہ میں سعودی سلفی گروہ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ یہ سعودی سلفی گروہ کہتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اعمال قرآنی'' میں جو یہ لکھا ہے کہ: ولادت کی سختی اور تکلیف دور کرنے کے لئے اور ولادت کو آسان بنانے کے لئے عورت اپنی بائیں ران پر سورہ انشقاق کی دو آیتوں کا تعویذ باندھ لے، یہ قرآن کریم کے ساتھ گستاخی ہے اور اس کی تعلیم کرنے والا کافر ہے۔

(۱) سورۃ النّساء، رقم الآیۃ: ۵۸.

مؤدبانہ عرض ہے کہ حضرات مفتیان کرام اس بہتان وتکفیر کا مفصل ومدلل جواب ارسال فرما کر اہل السنّت والجماعت کے متبعین اور علمائے دیوبند کے معتقدین کو شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ فقط والسلام

مستفتی: ہارون ابراہیمی عفی عنہ (۶۷۰/د ۱۴۳۲)

الجواب: وباللہ التوفیق:

ران پر ملفوف تعویذ باندھنے سے مقصود بہ وقت ضرورت، سہولتِ ولادت کا حصول ہوتا ہے، اس عمل سے عامل وحامل کے دل ودماغ میں قرآن کریم کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کا نقطہ برابر واہمہ نہیں ہوتا، فقہائے کرام نے ضرورت (حفاظت) کی وجہ سے ایسے صندوق پر بیٹھنے کی اجازت دی ہے جس میں قرآن کریم ہو، چنانچہ الاشباہ والنظائر لابن نجیم میں ہے: **والجلوس على جولق فيه مصحف إن قصد الحفظ لا يكره وإلاّ يكره** (۱/۱۰۸: ط: کراچی)

نیز آیاتِ قرآنیہ کو لفافہ میں بند یا موم جامہ کر دیا جائے تو اس کا حکم غیر ملفوف آیات سے علاحدہ ہو جاتا ہے، حائضہ عورت کے لئے مسِ قرآن ممنوع ہے؛ لیکن قرآنی آیات پر مشتمل تعویذ لفافہ میں بند کر دیا جائے تو حائضہ عورت کے لئے اس کو باندھنے کی اجازت ہوتی ہے، جیسا کہ شامی میں ہے:

ولا بأس بأن يشدّ الجنب والحائض التّعاويذ على العضد إذا كانت ملفوفةً.

(الدر مع الرد: ۹/۵۲۳)

دیکھئے حائضہ عورت کا قرآن چھونا، اگرچہ غلاف کے اوپر سے ہو بہ ظاہر بے ادبی معلوم ہوتی ہے، پھر بھی فقہاء نے اس کی گنجائش دی ہے، نیز مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی سہولتِ ولادت کے لئے اس عمل کو لکھا ہے، دیکھئے **القول الجميل مع شفاء العليل**: ص: ۸۲

اس عمل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ منفرد نہیں، بلکہ یہ عمل بعض اور حضرات سے بھی منقول ہے؛ اس لیے اگر کچھ بے ادبی معلوم ہو تب بھی علاج کی ضرورت کے تحت اس کی گنجائش ہوگی (۱)؛

---

(۱) علامہ ابن تیمیہ نے بھی سہولتِ ولادت کے لئے قرآنی آیات پڑھ کر دم کردہ پانی کو حاملہ کے ناف کے نیچے کے حصے پر چھڑکنے کی اجازت دی ہے، وہ فرماتے ہیں: **ويجوز أن يكتب للمصاب وغيره من المرضى شيئا من كتاب اللّٰه، وذكره بالمداد ويغسل ويسقى، كما نص على ذلك أحمد وغيره، قال عبداللّٰه بن احمد: قرأت على أبي، ثنا يعلى بن عبيد، ثنا سفيان، عن محمد بن أبي ليلى، عن الحكم، عن سعد بن جبير، عن ابن عباس قال: إذا عسر على المرأة ولادتها فليكتب:** دارالعلوم

اس لئے اس کو قرآن کے ساتھ گستاخی قرار دینا اور اس کی تعلیم دینے والے کو کافر کہنا غیر درست اور بلا دلیل ہے اور تکفیر کے سلسلے میں بلا دلیل فتویٔ تکفیر نہ قابل عمل ہے، نہ ہی موجبِ التفات، اللّٰہ ولي الهداية والعاصم من الغباوة والغواية. فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: الاحقر زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۲/۴/۱۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری، فخر الاسلام

دارالعلوم بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحيم، سبحان الله ربّ العرش العظيم، الحمد لله ربّ العالمين، كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (النّازعات: ۴۶) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (الاحقاف: ۳۵) قال أبي، ثنا أسود بن عامر باسناده بمعناه، وقال: يكتب في إناء نظيف، فيسقي، قال أبي: وزاد فيه وكيع: فتسقى وينفخ ما دون سُرّتها، قال عبد الله: رأيت أبي يكتب للمرأة في جام أو شيىء نظيف (مجموع فتاوى ابن تيمية: ۴/ ۱۸۷، فصل: كتابة شيىء من كتاب الله، دارالوفاء: ۱۹/ ۶۴)

المراجع والمصادر

قرآن کریم اور متعلقات

القرآن الكريم

التّفسير للبيضاوي — قاضی ناصر الدین محمد بن علی الشیرازی البیضاوی م ٦٩١

الجامع لأحكام القرآن (قرطبي) — الامام ابوعبداللہ محمد بن احمد الاندلسیؒ، م: ٦٦٨ھ

روح المعاني — الامام ابوالفضل سید محمود آلوسیؒ، م: ١٢٧٠ھ

تفسير ابن كثير — علامہ ابن کثیرؒ م: ٧٧٤ھ

الدّرّالمنثور — علامہ جلال الدین السیوطیؒ، م: ٩١١ھ

بيان القرآن — حضرت الشیخ اشرف علی التھانویؒ، م: ١٣٦٢ھ

معارف القرآن — الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ، م: ١٣٩٥ھ

احكام القرآن للجصاص — ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاصؒ، م: ٣٧٠ھ

مفاتيح الغيب للرازي (التّفسير الكبير) — الامام فخر الدین الرازیؒ م ٦٠٤

حدیث اور اصولِ حدیث

الجامع الصّحيح للبخاري — الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ، م: ٢٥٦ھ

الجامع الصّحيح للإمام مسلم — الامام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ، م: ٢٦١ھ

الجامع للتّرمذي — الامام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ، م: ٢٧٩ھ

السّنن لأبي داؤد — الامام ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانیؒ، م: ٢٧٥ھ

السّنن لابن ماجة — الامام محمد بن یزید القزوینیؒ، م: ٢٧٥ھ

الموطا للإمام مالك — ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالکؒ، م: ١٧٩ھ

السنن للنّسائي	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علیؒ، م: ۳۶۰ھ
مشكاة المصابيح	ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزیؒ، م: ۷۴۱ھ
المستدرك للحاكم	ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمدؒ، م: ۴۰۵ھ
الجامع الصغير للسّيوطي	العلامہ جلال الدین السیوطیؒ، م: ۹۱۱ھ
السنن للدارقطني	الامام علی بن عمر الدارقطنیؒ، م: ۳۸۵ھ
السنن الكبرى للبيهقي	الامام احمد بن الحسین بن علی البیہقیؒ، م: ۴۵۸ھ
مسند الإمام أبي حنيفة	روایۃ ابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانیؒ، م: ۴۳۰ھ
الموطا للإمام محمد	الامام محمد الشیبانیؒ، م: ۱۷۹
شعب الإيمان للبيهقي	الامام احمد بن الحسین بن علی البیہقیؒ، م: ۴۵۸ھ
مستخرج أبي عوانة	یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم النیسابوریؒ، م: ۳۱۶ھ
مسند الإمام احمد	الامام احمد بن محمد بن حنبلؒ، م: ۲۴۱ھ
إعلاء السّنن	الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ، م: ۱۳۹۴ھ
كنز العمّال	علی بن حسام الدین المتقیؒ، م: ۹۷۵ھ
مصنف ابن أبي شيبة	ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ الکوفیؒ، م: ۲۳۵ھ
نصب الرّاية	علامہ جمال الدین عبداللہ بن یوسف الزیلعیؒ، م: ۷۶۲ھ
الطّحاوي	الامام ابوجعفر الطحاویؒ، م: ۲۵۶ھ
آثار السنن للنيموي	علامہ ظہیر احسن شوق نیمویؒ م: ۱۳۲۲ھ
المصنف لعبد الرزاق	ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الیمانی الصنعانیؒ، م: ۲۱۱ھ
فيض القدير للمناوي	الشیخ زین الدین محمد المدعو بعبد الرؤوف الحدادیؒ، م: ۱۰۳۱ھ
عمل اليوم والليلة	العلامۃ احمد بن محمد الدینوری، المعروف بابن السنیؒ، م: ۳۶۴ھ
المعجم الكبير للطبراني	علامہ ابوالقاسم سلیمان ابن احمد الطبرانیؒ، م: ۳۶۰ھ
المقاصد الحسنة	شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاویؒ، م: ۹۰۲ھ
جامع الأحاديث للسيوطي	العلامۃ جلال الدین السیوطیؒ م ۹۱۱ھ

مسند أبي داؤد الطيالسي	ابوداؤدسلیمان بن داؤدالطیالسیؒ م۲۰۴ھ
مجمع الزّوائد	العلامہ ابوبکرالہیثمیؒ م ۸۰۷ھ
معرفة علوم الحديث	ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد م۴۰۵ھ
من معين الشّمائل	شیخ صالح احمد الشامی

شروح حدیث

فتح الباري	ابوالفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانیؒ، م:۸۵۲ھ
عمدة القاري	العلامہ بدرالدین العینیؒ، م:۸۵۵ھ
النّووي على مسلم	محی الدین یحیٰ بن شرف النوویؒ، م:۶۳۷ھ
معارف السّنن	العلامہ محمد یوسف البنوریؒ، م:۱۳۹۷ھ
عارضة الأحوذي	العلامہ محمد بن عبداللہ العربی ابن العربیؒ م ۵۴۶ھ
أوجز المسالك	الشیخ زکریا الکاندھلویؒ، م:۱۴۰۲ھ
التّعليق الممجَّد	الشیخ عبدالحی اللکنویؒ، م:۱۳۰۴ھ
تكملة فتح الملهم	سماحۃ المفتی محمد تقی العثمانیؒ
المصفى شرح الموطا	مسند الہند الشاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم الدہلویؒ، م:۱۱۷۶ھ
تحفة الألمعي	سماحۃ المفتی سعید احمد البالنبوریؒ
مرقاة المفاتيح	العلامہ علی بن سلطان القاریؒ م۱۰۱۴ھ
بذل المجهود	الشیخ خلیل احمد السہارن پوري م ۱۳۴۶ھ
الكامل في ضعفاء الرّجال	أبو أحمد بن علي الجرجانيؒ

فقہ واصولِ فقہ

الدّرّالمختار	محمد بن علاء الدین الحصکفیؒ، م:۱۰۸۸ھ
ردّالمحتار	العلامہ ابن عابدین الشامیؒ، م:۱۲۵۲ھ
الفتاوى الهندية	العلامہ نظام الدین وجماعۃ من العلماء
كبيري	العلامۃ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الحلبیؒ، م:۹۵۶ھ

امداد الأحکام	العلامہ ظفر احمد العثمانیؒ م:١٣٩٤ھ
فتاوى قاضي خان	العلامہ حسن بن منصور المعروف بقاضی خانؒ،م:٥٩٢ھ
امداد الفتاوى	الشیخ اشرف علی التھانویؒ،م:١٣٦٢ھ
الجوهرة النيّرة	ابوبکر بن علی بن محمدؒ،م:٨٠٠ھ
الفتاوى المحمودية	الشیخ محمود حسن الگنگوہیؒ،م:١٤١٧ھ
فتاوى دار العلوم ديوبند	المفتی عزیز الرحمٰن الدیوبندیؒ،م:١٣٤٧ھ
مجمع الأنهر	الشیخ محمد بن سلیمانؒ الکلیبولی معروف بہ شیخ زادہ م:١٠٧٨
حاشية الطّحطاوي على مراقي الفلاح	العلاّمة أحمد بن محمد الطّحطاوي م: ١٢٣١ھ
كفايت المفتي	الشیخ المفتی کفایت اللہ الدہلویؒ،م:١٣٧٢ھ
أحسن الفتاوى	الشیخ رشید احمد اللدھیانویؒ،م:١٤٢٢ھ
بدائع الصّنائع	العلامہ ابوبکر بن سعود الکاسانیؒ،م:٥٨٧ھ
خلاصة الفتاوى مع مجموعة الفتاوى	الشیخ طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری/ الشیخ محمد عبد الحی اللکنویؒ، م:١٣٠٤ھ
المغني لابن قدامة	الشیخ موفق الدین عبد اللہ بن احمد الشہیر بابن قدامہ المقدسیؒ،م:٦٢٠ھ
زبدة المناسك مع عمدة المناسك	الشیخ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ،م: ١٣٢٣ھ
فتح القدير	العلامۃ کمال الدین بن الہمامؒ،م:٨٦١ھ
كشف الأسرار شرح أصول البزدوي	عبد العزیز بن احمد بن محمد البخاری الحنفیؒ،م:٧٣٠ھ
تبيين الحقائق	الشیخ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ م:٧٤٣ھ
شرح المجلة	الشیخ رستم باز لبنانیؒ
عزيز الفتاوى	المفتی عزیز الرحمٰن الدیوبندي م: ١٣٤٧ھ
دليل الوراث على هامش السّراجي	الشیخ محمد نظام الدین الکیرانویؒ

البحر الرّائق	العلامہ ابن نجیم المصریؒ، م: ۹۷۰ھ
آلاتِ جدیدہ اور شرعی احکام	المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ، م: ۱۳۹۵ھ
الأشباه والنّظائر	العلامہ ابن نجیم المصریؒ، م: ۹۷۰ھ
قواعد الفقه	العلامہ عمیم الاحسان المجددیؒ
الموسوعة الفقهيه الكويتية	مجموعۃ من العلماء
فتاویٰ ابن تیمیة	تقی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم الحرانی الحنبلیؒ، م: ۷۲۸ھ
الفتاوی الرّحيمية	المفتی عبد الرحیم اللاجپوریؒ، م: ۱۴۲۲ھ
الأدلّة الكاملة	الشیخ محمود حسن المعروف بشیخ الہندؒ الدیوبندي م: ۱۳۳۹ھ
هداية	شیخ الاسلام برہان الدین المرغینانیؒ، م: ۵۹۲ھ
الفتاوی التّاتارخانية	العلامہ عالم بن علاء الانصاری الدہلویؒ، م: ۷۸٦ھ
نورالأنوار	الشیخ ملا جیونؒ
رسم المفتي	علامہ ابن عابدین شامیؒ م ۱۲۵۲ھ
الفتاوی الرّشيدية	الشیخ رشید احمد گنگوہیؒ م ۱۳۲۳ھ
بهشتی زيور	شیخ اشرف علی تھانویؒ م۱۳٦۲ھ
الفقه على المذاهب الأربعة	العلامہ عبد الرحمٰن الجزیریؒ
مجموعه قوانين اسلامي	مسلم پرسنل لاء بورڈ
خير الفتاوی	مولانا خیر محمد جالندھری م۱۴۰۵ھ
عمدة الأثاث في الطّلقات الثّلاث	مولانا سرفراز خان صفدر
كتاب الفسخ والتّفريق	مولانا عبد الصمد رحمانی م: ۱۳۹۳ھ
المحلی	ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم م ۴۵٦ھ
نيل الفرقدين	علامہ انور شاہ کشمیری م۱۳۵۲
جواهر الفقه	المفتي محمد شفيع الدّيوبنديؒ م: ۱۳۹۵ھ

امدادالمفتين — المفتي محمد شفيع الدّيوبنديؒ م: ١٣٩٥ھ

المبسوط للسّرخسي — شمس الأئمة شمس الدّين أبو بكر محمدالسّرخسيؒ م: ٤٩٠

متفرقات

ماہنامہ ''الفرقان'' جنوری ۲۰۱۱ — لکھنؤ

تصویراور سی ڈی کے احکام — مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ م: ۱۴۲۱ھ

تصویراور سی ڈی کے احکام — مولانا احسان اللہ شائق

اسلام اور جدید معاشی مسائل — مفتی محمد تقی عثمانی

المغرب — علامہ مطرزی م: ٦١٦ھ

امام مہدی شخصیت وحقیقت — مولانا اسعد قاسم سنبھلی

معارف صوفیہ — حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی

اعلام الموقعین — العلامہ ابن القیم الجوزیۃ م ۷۵۱ھ

عقد الجید — الشاہ ولی اللہ الدہلویؒ م ۱۱۷٦ھ

المهند علی المفند — مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ م ۱۳۴٦ھ

شرح الصدور بحال الموتی والقبور — العلامہ جلال الدین السیوطیؒ م ۹۱۱ھ

كتاب المواقف — عبدالرحمٰن بن احمد م ۷۵٦ھ

فیروز اللغات — الحاج مولوی فیروز الدین

التکشّف عن مهمات التّصوّف — شیخ اشرف علی تھانوی م ۱۳٦۲ھ

منهاج السنة — العلامہ ابن تیمیہ الحنبلیؒ ۷۲۸ھ

الشّهاب الثّاقب — مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۳۷۷

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ — مولانا محمد منظور نعمانی م ۱۴۱۷ھ

سوانح مولانا محمد یوسف صاحب — مولانا محمد ثانی الحسنی م: ۱۹۸۲ء

اشرف السوانح	خواجہ عزیز الحسن مجذوب شیخ عبدالحق
مطالعہ مہدویت	مولانا عبدالقوی صاحب
اختلاف امت اور صراط مستقیم	مولانا محمد یوسف شہید صاحبؒ م:۱۴۲۱ھ
اسلام اور عالمی اخوت	ڈاکٹر ذاکر نائک
الجواب علی ثلاثین جوابا علی ان ذاکر الهندی وأصحاب فکره منحرفون ضلالاً	الشیخ الحجوری
حقیقت ذاکر نائک	مولانا ساجد بخاری
خطبات ذاکر نائک	ڈاکٹر ذاکر نائک
اسلام پر چالیس اعتراضات	ڈاکٹر ذاکر نائک
اسلام میں خواتین کے حقوق	ڈاکٹر ذاکر نائک
ایسٹرن کریسنٹ	ماہ نامہ مرکز المعارف ممبئی
مجلة البحوث الإسلامية	لجنة الدّائمة للبحوث و الإفتاء
القول الجميل	الامام الشاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم الدہلویؒ م:۱۱۷۶ھ